پرتھال

قمر اجنالوی

حمیدی

ایک تاریخی ناول

پرتھال

قمر اجنالوی

مکتبہ القریش
قذافی مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔
فون:7352835-7231595

ناشر	:	عبدالحفیظ قریشی
مطبع	:	نیر اسد پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ	:	کلاسکس کمپیوٹرز
تعداد	:	500
سن اشاعت	:	2006ء
قیمت	:	-/250 روپے

مکتبہ القریش اُردو بازار لاہور

انتساب

اپنے دوست اور رفیق شبلی ایم۔ کام کے
نام جو چوبیس سال کے بعد بی۔ کام کے
چنگل سے رہا ہوئے۔

قمر اجنالوی
۱۴ اگست ۱۹۶۱ء

مصنف

یکم مارچ ۱۹۲۱ء کو امرتسر (بھارت) کی تحصیل اجنالہ میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں جب نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ پہلا تاریخی ناول "معرکہ پانی پت" کے نام سے لاہور میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں وہ خود بھی لاہور آ گئے اور یہاں ایک طرف آنرز ان اردو، آنرز ان فارسی اور آنرز ان عربی کے امتحانات دیئے وہاں دوسری طرف تالیف و تصنیف اور شعر و افسانہ کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا اور ماہنامہ "عالمگیر" اور "خیام" کے حلقوں میں شہرت پائی۔ ۱۹۴۷ء میں ایک دوست کے ساتھ مل کر ماہنامہ "ساغر" جاری کیا پھر ہفت روزہ "ہماری دنیا" نکالا۔

۱۹۴۸ء میں انہوں نے روزنامہ "مسلم" کی ادارت سنبھالی اور آزادی کشمیر پر ولولہ انگیز اداریئے لکھے۔ انہی ایام میں ہفت روزہ "اداکار" میں کام کیا ۱۹۵۳ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ لمیٹڈ نے اردو اخبار "ملت" جاری کیا تو انہیں مدیر معاون کی حیثیت سے منتخب کیا گیا اور وہ اپنی منفرد کالم نویسی کے باعث بہت جلد اخباری اور سیاسی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ تین سال کے بعد "ملت" بند ہو گیا تو وہ کچھ عرصہ روزنامہ "مغربی پاکستان" میں بطور اداریہ نویس کام کرتے رہے پھر حمید نظامی مرحوم نے اپنے اخبار "نوائے وقت" کا مشہور کالم "سر راہے" اُن کے سپرد کر دیا۔ قمر اجنالوی حمید نظامی کی رحلت تک "نوائے وقت" سے منسلک رہے پھر اخبار سے الگ ہو گئے۔

آج کل ان کا بیشتر وقت تالیف و تصنیف یا پھر اخبار نویسی میں گزرتا ہے۔ وہ شعر و ادب میں ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں۔

ناشر
محمد علی قریشی

حرفِ آغاز

تاریخ کے بعض اوراق تاریخ و سیر کے طالب علم کو خود بخود تصنیف کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اردو میں جو تاریخی علی الخصوص "اسلامی تاریخی ناول" رائج ہو چکے ہیں اُن کو دیکھ کر یہ حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ میں بھی کوئی تاریخی ناول لکھوں۔ ان ناولوں میں تاریخی حقائق ہی کو مسخ نہیں کر دیا جاتا بلکہ عشق و محبت کی بعض فرضی کہانیاں کچھ اس بھونڈے انداز سے تاریخی غلاف میں لپیٹ کر پیش کی جاتی ہیں کہ انہیں تاریخ سے نسبت دیتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ تاریخ بہرحال ایک اہم دل چسپ اور عوامی موضوع ہے۔ جسے افسانوی ادب میں ڈھالنے کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تاریخی ناول نویسی کے مروجہ اسلوب و انداز کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ "پرتھال" میں نے اسی خیال کے تحت لکھی ہے۔ اور اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا ہے..... یہ تاریخی ناول اُس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جسے میں نے ایک افادی مقصد کے تحت شروع کیا ہے۔ میں نے افسانہ کو تاریخ بنانے کی غلطی نہیں کی۔ البتہ تاریخ کو افسانہ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اگر میرے پڑھنے والے اس سلسلہ کو پسند کریں تو مجھے ذیل کے پتہ پر اپنے مشورہ سے مستفید فرمائیں۔

قمر اجنالوی
روزنامہ "مغربی پاکستان"
بیڈن روڈ، لاہور

1

نگاہ کے جادو

طلسمی آواز

ٹاپوں کی آواز وادی کا سینہ زخمی کرتی ہوئی اُبھری جیسے جھیل میں پتھر پھینک دینے سے پانی کی پرسکون سطح پر بے ترتیب لہریں بکھر جاتی ہیں۔

اس آواز کے ساتھ ہی سرسبز ٹیلے پر بیٹھے ہوئے چرواہے کی بانسری کی تان ٹوٹ گئی اس نے گردن اٹھا کر سامنے نظر دوڑائی۔ دُور مدگل کے راستے پر دو سوار گھوڑے اُڑائے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ درختوں کی اوٹ سے نکل آئے۔ تو چرواہے نے اپنی آنکھوں پر دائیں ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی پھر اچانک ایک سمت کو بھاگ نکلا۔

سواروں کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا۔ انہیں کوئی غیر معمولی مہم درپیش ہے اور وہ جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتے ہیں اُن کے گھوڑوں کے بدن پسینے میں شرابور تھے اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اس کے باوجود سوار انہیں ایڑ لگانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

سورج نے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا اور اس کی روشن کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھیں۔

ٹیلے کے قریب پہنچ کر جہاں ایک موڑ دو راستوں کو جدا کرتا تھا انہوں نے یک لخت اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں اور ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے دونوں کی نگاہیں پوچھ رہی ہیں اب انہیں کس طرف جانا ہے؟ اُن کی منزل کا راستہ کون سا ہے؟

دونوں سوار نوجوان اور خوش وضع تھے مگر اُن میں سے ایک نوجوان کا لباس اور سر پر کلغی کا نشان صاف ظاہر کر رہا تھا کہ دکن کی بہمنی سلطنت کے ولی عہد شہزادہ حسن خاں کے سوا اور کوئی نہیں۔ دوسرا یقیناً اس کا جاں نثار دوست اور محرم راز رونق بیگ تھا جو نہ صرف ولی عہد کا دوست بلکہ دربار بہمنی کا ایک معتمد رکن تھا۔ یہی وجہ تھی سلطان معظم کی طرف سے اسے سہ ہزاری کا منصب حاصل تھا۔ قدوقامت چہرے مہرے اور آنکھوں کی عقابی چمک کے اعتبار سے شہزادہ حسن خاں خاندانِ بہمنی کی روایتی دلکشی اور شان و شوکت کا مظہر تھا۔

اپنے بہادر باپ کے شانہ بشانہ اُس نے کئی لڑائیوں میں اپنی خارا شگاف تلوار کے جوہر دکھائے تھے اور اس عمر میں کرناٹک کے سورماؤں کے خلاف کئی مرتبہ اس نے شاہی فوج کی کمان سنبھال کر ثابت کر دیا تھا کہ اپنے باپ کی طرح نوجوان شہزادہ مردِ میدان ہے۔ انہی معرکہ آرائیوں کے صلے میں سلطان نے اُسے ولی عہد کا شرف بخشا تھا۔ حالانکہ سلطان کے شمشیر زن بھائی امیر الامراء احمد خاں خانخاناں کی موجودگی میں کسی نوجوان شہزادے کا اس منصب پر فائز ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔

احمد خاں خانخاناں سلطانی فوجوں کا سپہ سالار ہی نہیں بلکہ اُن کے مزاج سے بھی واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ دکن ایسے ملک میں جو سورما مرہٹوں، کرناٹکی دلیروں اور بیجانگر کے بہادروں سے گھرا ہوا ہے۔ ہر حکمران کو اپنی تلوار بے نیام رکھنا پڑتی ہے ورنہ حریف انہیں ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے اور اردگرد کے تمام مہاراجے جانتے تھے۔ احمد خاں جیسے ہوشیار اور عقاب نظر سپہ سالار کی موجودگی میں دکن کے کسی حصے پر حملہ کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ عام خیال یہی تھا کہ سلطان فیروز شاہ اپنے بعد احمد خاں ہی کو تاج و تخت کا وارث بنائے گا لیکن جب شہزادہ حسن خاں نے یکے بعد دیگرے دو لڑائیوں میں دشمنوں پر فتح حاصل کر کے اپنی برتری اور عظمت ثابت کر دکھائی تو سلطان نے اُسے ولی عہد نامزد کر دیا اور اپنے بھائی کو اس کے بعد جانشین مقرر کر دیا۔

دکن کے اردگرد خطروں کے جو جال بچھے ہوئے تھے شہزادہ حسن خاں بھی اُن سے غافل نہ تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا اس سرزمین پر حکومت کرنے کے لئے اُسے اپنا ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھنا ہوگا۔ یہی وجہ تھی وہ خود فوجی معاملات کی نگرانی کرنے لگا تھا۔

چند روز پیشتر اسے خبر ملی تھی کہ بیجانگر کا مہاراجہ دیورائے اپنے جنگی سواروں کے ہمراہ دریائے تنگ بھدرا کے کنارے کنارے گشت کر رہا ہے۔ یہ دریا دکن اور بیجانگر کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا اور اس کے کنارے دشمن کی سرگرمیاں یقیناً نظرانداز نہیں کی جا سکتی تھیں۔ یہ خبر سنتے ہی حسن خاں نے سرحدی ضلع مدگل کے حاکم فولاد خاں کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ دیورائے پر نظر رکھے اور خود اپنے فوجی دستے کو لے کر مدگل کی طرف چل پڑا تھا۔

شہزادہ جلد سے جلد مدگل پہنچ جانا چاہتا تھا تا کہ اگر دیورائے کی نیت میں فتور دیکھے تو اس کی گوشمالی کر سکے۔ دشمن کو اچانک جا لینے کے شوق میں اُس نے اپنے فوجی دستہ کو بھی پیچھے چھوڑا اور رونق بیگ کے ہمراہ بہت آگے نکل آیا تھا لیکن اب دوراہے پر کھڑا وہ حیران تھا کہ کون سا راستہ اختیار کرے۔ اس سے پہلے ان دونوں میں سے کسی کو بھی مدگل کا سفر کرنے کا موقعہ پیش نہ آیا تھا۔

''ہمیں اپنے سپاہیوں کا انتظار کر لینا چاہیے جانِ عالم!'' رونق بیگ نے مشورہ دیا۔ ''شہباز خاں اس راستے سے اچھی طرح آگاہ ہے۔''

''لیکن سپاہی بہت دیر سے آئیں گے اور میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔''

''مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' رونق بیگ نے اپنے شانے سکوڑ لئے۔

''کاہلی کا ایک نام مجبوری بھی ہے۔''

یہ کہہ کر شہزادہ حسن خاں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور ٹیلے کے عقب میں ایک چرواہے کو ڈھور ڈنگر بھگاتے دیکھ لیا۔ حسن نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چند ہی لمحوں میں اُسے جا لیا چرواہا کسی نامعلوم خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ شہزادے کو دیکھتے ہی وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو۔ مدگل کو کون سا راستہ جاتا ہے؟''

چرواہے نے نفی میں سر ہلا دیا اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن حسن کو کوئی لفظ سنائی نہ دے سکا۔ اس نے فقط سر کی جنبش سے اندازہ لگایا کہ وہ راستے سے بے خبر ہے۔

''گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''بس کوئی ڈیڑھ کوس۔''

یہ کہہ کر چرواہا تو گائیوں کے پیچھے چل دیا اور شہزادے نے باگ موڑ لی۔ وہ سوچ رہا

تھا کہ گاؤں میں جا کر اپنی منزل کا راستہ دریافت کر سکتا ہے۔

یہ ہری بھری وادی جہاں ایک طرف اونچے نیچے ٹیلے اور سرسبز کھیت تھے اور دوسری طرف جنگل کے ساتھ ساتھ سانپ کی طرح بل کھاتی اور رینگتی ہوئی ایک ندی تھی جو ہر مسافر کو دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ یوں تو دکن کی سطح مرتفع اور اس کے میدانی علاقے اپنی شادابی و رعنائی کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہیں لیکن اس وادی کے بہار آفریں نظارے جنت نگاہ تھے اور جی چاہتا تھا اس کی تازگی اور خوشبو کو دل و نگاہ میں سمو لینے کے لئے آدمی یہیں ڈیرا ڈال دے۔

شہزادہ حسن کے سر پر مدگل پہنچنے کی دھن کچھ اس طرح سوار تھی کہ ان زندگی افروز مناظر کی طرف مطلق توجہ نہ دے سکا۔ وہ کسی فکر میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ لوٹ رہا تھا اور اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا۔ سفر کا التوا اس کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔

لیکن اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ سپاہیوں کے پہنچنے تک اُسے مجبوراً رکنا پڑے گا اور کیا معلوم وہ کتنی دیر میں پہنچیں؟

وہ اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ اچانک ایک آواز نے اُسے چونکا دیا ایک سریلی اور مدھری آواز...... ایک مدھر گیت کی لے...... ایک دلکش، بہار آفریں اور سرور انگیز نغمے کی تان جو جادو کی طرح رس گھولتی ہوئی اُبھری اور شعلے کی مانند لپکتی ہوئی اس کے دل میں اتر گئی۔

اس نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور سحر زدہ حالت میں اپنے کان اس آواز پر لگا دیئے یہ آواز بل کھاتی ہوئی ندی کے اس پار درختوں کے جھنڈ میں گونج رہی تھی اور ایک زنجیر بن کر حسن کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس آواز میں ایک سوز تھا، جوانی کی تپش تھی، ایک پیغام تھا، ایک بلاوا تھا، حسن نے حیرت پاش نظروں سے درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا اور پھر اس نے اپنے گھوڑے کا رُخ ندی کی طرف موڑ دیا۔

ایک کتاب ایک مضمون

اپنے ہاتھوں سے جھاڑیوں کو ہٹاتا ہوا جب وہ آگے بڑھا تو اس کے قدم ٹھٹک کر رہ گئے آنکھوں میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ اس کے سامنے ایک حسین اور جواں سال دوشیزہ

شاخوں کے جھرمٹ میں جادو بکھیر رہی تھی۔ شہزادہ آواز سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ الہڑ حسینہ اردگرد سے بے خبر گانے میں محو تھی۔

پھر اچانک گیت کی لے ٹوٹ گئی۔ لڑکی جنگلی ہرنی کی طرح چونک اٹھی اور اپنی ملائم سی گلابی ساڑھی میں گٹھڑی بن گئی۔ شاخوں کی اوٹ میں اس نے ایک اجنبی کو گھورتے دیکھ لیا تھا اور اس کی سہمی سہمی سی نگاہیں حسن کی کلغی پر ٹک کر رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی ہے لیکن نامعلوم قوت نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہیں اور یہ نامعلوم قوت شہزادہ حسن کے جمال اور شاہی جلال کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتی تھی۔ حسن آگے بڑھا اور شاخوں کو ہٹا کر لڑکی کے سامنے آ گیا۔ اُن کی نگاہیں چار ہوئیں اور پھر زمین پر آ رہیں۔ دونوں کی قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی پھر حسن نے ذرا جرأت سے کام لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے دیکھتے ہی تم نے گانا کیوں بند کر دیا؟"

حسن نے محسوس کر لیا کہ اُس کی آواز میں لرزش ہے حالانکہ یہی آواز محل میں زلزلہ پیدا کر دیا کرتی تھی اور اسی آواز کو سن کر سپاہیوں کے بدن کانپ جایا کرتے تھے لیکن آج ایک اجنبی لڑکی کے سامنے اس کی آواز خود کانپ رہی تھی۔

لڑکی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

"تمہاری خاموشی کے ساتھ ہی جیسے کائنات کی گردش تھم گئی ہے...... تم خاموش کیوں ہو گئیں۔"

لڑکی اس مرتبہ بھی خاموش رہی۔

"کیا تمہیں میرا آنا برا لگا ہے؟" حسن اُس کے اور قریب ہو گیا۔

"نہیں......" لڑکی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن "نہیں" کہہ کر اُس نے پھر چپ سادھ لی اور ساڑھی کا آنچل لپیٹنے لگی۔

"تمہاری آواز کی کشش مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ ایسی دلکش آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ تمہارے گلے میں جادو ہے۔"

"شکریہ!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن تم باتیں کرنے سے ہچکچا کیوں رہی ہو؟ ایک مسافر کو اپنی آواز کے جادو سے

محروم نہ رکھو۔" اچانک حسن کو جیسے گفتگو کا ذریعہ سوجھ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"پرتھال۔"

"ہندو ہو؟"

"جی......"

"گوت کیا ہے؟"

"سنارا"

شہزادہ چونک اٹھا۔ ایک سنار کی لڑکی اتنا اچھا گا سکتی ہے۔ یہ بات اس کے وہم میں بھی نہ آسکتی تھی۔

"پھر تو تمہارا نام کندن ہونا چاہیے تھا۔" شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا پرتھال نام برا ہے؟" اب کے لڑکی کے لہجے میں بھی ذرا شگفتگی تھی۔

"نہیں...... بڑا پیارا نام ہے پرتھال۔ کم از کم مجھے تو بہت اچھا لگا ہے اس نام میں بھی ایک موسیقی ہے۔ سُر تال ہے۔"

لڑکی شرما گئی...... پھر اس نے اپنی خواب گوں آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔

"اور آپ؟"

"میرا نام حسن خاں ہے۔"

"اگر میں غلطی نہیں کرتی تو آپ فیروز آباد سے آئے ہیں؟"

"تمہارا اندازہ صحیح ہے۔"

"اور...... یہ بھی کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"ممکن ہے یہ قیاس درست نہ ہو۔" حسن نے جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ "فیروز آباد میں صرف شاہی خاندان ہی نہیں رہتا اور بھی بے شمار لوگ بستے ہیں۔"

"آپ نے صحیح بات کہی ہے لیکن میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" پھر پرتال نے حسن کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی پگڑی پر کلغی کا یہ نشان صاف بتا رہا ہے کہ میں اس وقت دکن کے ولی عہد سے ہمکلام ہوں۔"

یہ سب کچھ اتنی عجلت سے ہوا کہ شہزادہ حسن تقریباً بوکھلا اٹھا۔ پرتھال کے جلوہ حسن میں وہ کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ اپنے سر پر شاہی کلغی کو بھی بھول بیٹھا...... لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مسکرا کر بولا۔

''تمہاری حقیقت شناس نگاہیں تو انعام کی مستحق ہیں۔ واقعی تم نے مجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔''

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر پرتھال کی خوبصورت گردن میں ڈال دیا جو ابھی تک سر جھکائے کھڑی تھی۔ شہزادے کی اس مہربانی سے پرتھال ایک مرتبہ پھر ہرنی کی طرح بدک سی گئی۔ حسن نے اس کے چہرے کی گھبراہٹ بھانپ لی۔

''کیا تمہیں یہ انعام پسند نہیں آیا؟''

''میری کیا مجال ہے کہ شاہی انعام کو ناپسند کروں۔''

''لیکن معلوم ہوتا ہے تم انعام پا کر خوش نہیں ہوئیں۔ کیا میرا اندازہ غلط ہے۔''

''نہیں آپ بجا فرماتے ہیں۔''

''تو پھر میں اس کی وجہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' شہزادے کے لہجے میں تعجب کی جھلک تھی۔ وہ حیرت پاش نظروں سے پرتھال کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک لمحہ رک کر پرتھال کہنے لگی۔ ''شہزادوں کے انعام غریبوں کے لئے کبھی کبھی بدبختی کا سندیس لے کر بھی آیا کرتے ہیں مہاراج!''

''کیا مطلب؟''

''پردیسی راجکمار خواب بن کر آتے اور گزر جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے کچھ ایسی کہانیاں چھوڑ جاتے ہیں جو انعام پانے والوں کو سانپ بن کر ڈستی رہتی ہیں۔''

اس ایک ہی فقرے میں پرتھال بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ ایک پورا افسانہ جسے سمجھنے میں حسن نے کوتاہی نہیں کی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ اس کا بخشا ہوا انعام واقعی ایک ایسی کہانی کا عنوان بن سکتا ہے۔ جو گاؤں گاؤں پھیل سکتی ہے اور لوگوں کا کیا ہے وہ تو ایک ہی لفظ کو افسانہ بنا لیتے ہیں۔ تو کیا اسے اپنا انعام واپس لے لینا چاہیے؟

حسن نے ایک لمحہ غور کیا پھر اُسے خیال آیا افسانہ حقیقت کا رُوپ بھی تو دھار سکتا ہے

اور اسی خیال کے ساتھ ہی جو دراصل اس کی دلی خواہش کا عکس تھا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگا۔

"میں اُن شہزادوں میں سے نہیں جو خوابوں کی طرح آتے اور بگولوں کی مانند لوٹ جاتے ہیں۔"

پرتھال چونک اٹھی اور متعجب نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"یقین رکھو! میں اپنے پیچھے کوئی ایسی کہانی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ جو تمہیں سانپ بن کر ڈستی رہے بلکہ میں تو خود افسانہ بن جانا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا افسانہ جس کا عنوان تم ہو۔"

حسن نے بڑے خوبصورت الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور پرتھال کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے دھرتی سے آکاش پر اٹھا لیا ہو۔ اس کی روح ایک مدھر گیت میں تحلیل ہو گئی ہو جیسے وہ اس کے منہ سے یہی الفاظ سننے کے لئے بے قرار تھی لیکن کیا یہ ممکن بھی ہے کہ ایک شہزادہ..... دکن کے تاج و تخت کا وارث۔ ایک غریب اور گمنام لڑکی کو اپنے دل کی رانی بنائے گا؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آفتاب ایک ذرے پر مہربان ہو جائے؟ کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں۔ ایک ایسا سپنا جو عموماً لڑکیاں جوانی کی عمر میں دیکھتی ہیں؟ لیکن یہ کوئی خواب نہ تھا۔ کوئی خیال نہ تھا..... دکن کا ولی عہد شہزادہ حسن خاں اپنے شاہی لباس کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا اپنے سوال کا منتظر تھا۔ پرتھال نے شرما کر گردن جھکا لی۔ اس کے رخسار حیا کی سرخی سے تمتما اُٹھے اور حسن کے دل پر شعلے سے لپک گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر پرتھال کا ہاتھ پکڑ لیا۔ محبت کا یہ پہلا لمس دونوں نے کچھ اس طرح محسوس کیا جیسے وہ سرور و کیف میں نہا گئے ہوں۔ اس ایک ہی لمس نے اجنبیت کا احساس فنا کر دیا۔ پھر حسن کہنے لگا۔

"اب تو تمہیں میرا انعام قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو گا کیونکہ اب یہ انعام نہیں حُسن کی بارگاہ میں محبت کی پہلی بھینٹ ہے۔"

موتیوں کا ہار پرتھال کی گردن میں چمک رہا تھا۔

"لیکن میں غریب اس قیمتی انعام کے بدلے آپ کو کوئی تحفہ نہیں دے سکتی۔"

پرتھال نے یہ الفاظ رُک رُک کر ادا کئے۔

"انعام بدلے کا طالب نہیں ہوتا۔"

"لیکن بھینٹ کرنے والے کو خالی ہاتھ لوٹانا بھی اچھا نہیں۔"

پرتھال کے ان الفاظ نے حسن کو مبہوت کر دیا اُسے محسوس ہوا وہ گفتگو کرنے کا سلیقہ جانتی ہے اور یہ بھی سمجھتی ہے کہ ایک شہزادے کے اظہار محبت کا جواب کن الفاظ میں دینا چاہیے۔ اس سے صاف ظاہر تھا وہ دیہات کی عام لڑکیوں کی طرح گنوار نہیں۔ بلکہ ذہین اور پڑھی لکھی ہے۔ یہ انکشاف حسن کے لئے مسرت کا باعث ہوا۔ وہ بولا۔"اگر تم چاہو تو مجھے بھی ایک تحفہ دے سکتی ہو۔"

پرتھال نے حیران ہو کر پوچھا......"بھلا ایک غریب لڑکی ایک شہزادے کو کیا تحفہ دے سکتی ہے؟"

اس کے جواب میں حسن نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی ٹھوڑی کو اُوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا......

"اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ۔"

اور غیر اختیاری طور پر پرتھال کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس نے شرما کر گردن جھکا لی گویا اس نے شہزادے کو اپنی محبت کا ثمرہ بخش دیا تھا اس کے انعام کا بدلہ چکا دیا تھا۔ حسن کا کپکپاتا ہوا ہاتھ ابھی تک پرتھال کی ٹھوڑی پر تھا اور وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی انگلیاں ایک ایسی کتاب کا ورق الٹ رہی ہیں جس کا مضمون وہ خود بن گیا ہے۔

بیجانگر کا مسافر

پرتھال نے جب گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو یہ دیکھ کر ٹھٹک گئی کہ صحن میں اس کے گورو دیو کا سامان بندھا رکھا ہے اور وہ سفر کی تیاری کر رہے تھے۔

بوڑھا برہمن گورکھ ناتھ جو بیجانگر میں اپنے علم و فضل، دھرم گیان اور راگ وڈیا میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ ایک سال پہلے جب کاشی کی تیرتھ یاترا کے بعد بنارس سے لوٹا تھا تو اس نے دکن میں بھی کئی مقامات پر لوگوں کو اشیرواد دی تھی اور پھر مدگل کے اس گاؤں میں اس نے پرتھال ہی کے گھر قیام کیا تھا۔ بوڑھے سنار لکھپت کی زبان سے وہ یہ بات سن کر

حیران رہ گیا تھا کہ اس کی جواں سال لڑکی پرتھال نہ صرف دکن کی مسلمان عورتوں کی طرح پردے میں رہتی ہے بلکہ اسے گانے کا بھی بڑا شوق ہے اور اکثر تنہائی میں بیٹھ کر وہ اپنے دل کے تار چھیڑ دیتی ہے۔

گورکھ ناتھ تو فن موسیقی کا استاد تھا۔ اس کے نغمے بیجانگر کے راج دربار میں گونجتے تھے اس نے فوراً حکم دیا تھا پرتھال کو میرے سامنے پیش کیا جائے۔ برہمن مہاراج کا حکم کیسے ٹل سکتا تھا۔ پرتھال اس کے چرنوں میں بٹھا دی گئی اور ماں باپ نے ہاتھ باندھ کر بوڑھے برہمن سے درخواست کی وہ اُن کی بیٹی کے لئے پراتھنا کرے۔ گورکھ ناتھ نے جب لڑکی کو بے حجاب دیکھا تو اُس کے حسن و جمال پر دنگ رہ گیا پھر اُس نے کہا۔

"بیٹی! میں نے سنا ہے تو سنگیت بھی جانتی ہے۔ بھلا مجھے کوئی گانا تو سنا۔"

پھر پرتھال نے ستار سنبھالی اور ایک ایسا گیت چھیڑ دیا۔ جس نے گورکھ ناتھ کے دماغ میں ہلچل مچا دی۔ وہ سوچنے لگا یہ آواز تو کئی فتنے جگا سکتی ہے۔ اس کے گلے میں جادو ہے۔ ایک ایسا جادو جو راجکماروں اور مہاراجوں کا من موہ سکتا ہے اور اُسی لمحے بوڑھے برہمن نے یہ فیصلہ کر لیا وہ پرتھال کو سنگیت کی رانی بنائے گا۔ اسے راگ ودیا سکھائے گا جب اس نے پرتھال اور اس کے ماں باپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ سب بوڑھے برہمن کے قدموں پر گر پڑے۔

اس دن کے بعد بوڑھے گورکھ ناتھ نے پرتھال کو راگ ودیا سکھانا شروع کی اور ایک ہی سال کے عرصے میں اس نے سنگیت میں پوری مہارت حاصل کر لی۔

پرتھال اپنے گورو دیو کے سامنے بیٹھ کر جب راگ الاپنا شروع کرتی تھی تو برہمن کا دل سنگیت ساگر کی لہروں پر ڈگمگ ڈولنے لگ جاتا تھا۔ کبھی کبھی پرتھال ندی کے کنارے درختوں کے گھنے جھنڈ میں بیٹھ کر بھی اپنے مدھر گیت فضا میں بکھیرتی سارے گاؤں میں اس کے سنگیت اور جادو بھری آواز کا چرچا تھا۔ کئی لوگوں نے سنار کے گھر کے چکر کاٹے تھے اور وہ بھی پرتھال کی خاطر اس کے دروازے پر دولت کے ڈھیر لگانے پر تیار تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں پرتھال کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ وہ کہتیں:

"سنار نے کیسی بھاگوان بیٹی پائی ہے۔ سونے میں تلے گی۔"

لیکن پرتھال پر جیسے ان باتوں کا کوئی اثر نہ تھا، وہ کسی اور ہی دھن میں مگن تھی......

ان فضاؤں اور ہواؤں سے بہت دور وہ ایک نئی دنیا کے سپنے دیکھ رہی تھی اور اُن اُونچے اور نیلے پربتوں کے اس پار جھانک رہی تھی جہاں سورما مہابیر اپنے کندھوں پر کام دیو کی طرح کمانیں لٹکائے گھوم رہے تھے...... ہر روز وہ سنتی کہ آج فلاں جگہ سے رشتہ آیا ہے آج فلاں زمیندار نے اتنی دولت دینے کا وعدہ کیا ہے۔ آج فلاں ساہوکار نے درخواست بھیجی ہے وہ سب کچھ سنتی اور مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ اس مسکراہٹ کا مطلب یہی تو تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس کی قیمت نہیں چکا سکتا۔ کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کے حُسن کا مختار بن سکے لیکن اُسے اپنی قسمت کے خریدار کا انتظار تھا اور یہ یقین بھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ ان اونچے اور نیلے پربتوں سے بادلوں کے گھوڑے پر سوار اس کے خوابوں کا شہزادہ ضرور اس دھرتی پر اُترے گا اور پھر......

مگر کوئی نہ جانتا تھا پرتھاں کے دل میں کون سا فتنہ پرورش پا رہا ہے ادھر بوڑھے ماں باپ دن رات شادی کی فکر میں گھلے جا رہے تھے۔ باپ کہتا:

”گورو دیو! آپ ہی اس کو سمجھائیں۔ آخر کہیں نہ کہیں اس کا بیاہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ ہاتھی راجے مہاراجوں کے دروازوں پر بھی نہیں بندھے رہتے اور میں تو ایک غریب سنار ہوں۔ کنواری کنیا کو کب تک گھر میں بٹھا سکتا ہوں۔ بیٹی کے بوجھ سے تو میری کمر بھی دوہری ہو چلی ہے۔“

لیکن بوڑھا گورکھ ناتھ خاموش تھا جیسے اس نے لب سی لئے ہوں یا اس کے سامنے پرتھاں کی شادی کا نہیں بلکہ کسی گڑیا کے بیاہ کا ذکر ہو رہا ہو۔ اس نے کبھی اس مسئلے پر اپنے خیال کے اظہار کی ضرورت محسوس نہ کی بھی بوڑھے لکھپت کے سوال کا جواب نہ دیا۔ برہمن کی اس پراسرار خاموشی نے سنار کو ایک نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ سوچتا آخر یہ سوال کچھ ایسا ناقابلِ فہم تو نہیں جو گورو دیو کی سمجھ میں نہ آسکے۔

شادی...... ایک آسان سا مسئلہ ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ پھر پنڈت گورکھ ناتھ کے ہونٹوں پر خاموشی کا تالا کیوں پڑ گیا ہے؟ وہ جواب کیوں نہیں دیتے۔ وہ کیا سوچتے رہتے ہیں...... کہاں گم ہو جاتے ہیں؟ اور پرتھاں کی شادی کے ساتھ اب پنڈت گورکھ ناتھ کی پراسرار خاموشی بھی بوڑھے لکھپت کے لئے ایک پریشانی بن گئی تھی۔ یہ خاموشی دراصل ہتھوڑی کی ضرب تھی جس نے سنار کے دل میں نئے خطرے کی دھمک بیدار کر دی تھی اور وہ چاہتا تھا

جیسے بھی ہو برہمن کی خاموشی کا بھید معلوم کر لے۔اسی لئے اس نے کئی بار دریافت کیا تھا۔

"مہاراج پرتھال کے بارے میں جب بھی پوچھا جاتا ہے۔ آپ چپ ہو جاتے ہیں......آخر آپ آگیا کیوں نہیں دیتے؟"

لیکن پہلے کی طرح برہمن بدستور خاموش رہا تھا اور آج بوڑھے سنار کو حیرت میں چھوڑ کے......اس کے سوال کا جواب دیئے بغیر اپنی پراسرار خاموشی کا راز اپنے سینے ہی میں چھپائے وہ بیجانگر کی طرف رخصت ہو رہا تھا۔کوئی نہ جانتا تھا اس کی اچانک روانگی کا سبب کیا ہے۔

پرتھال کے قدم دہلیز پر ہی جم کر رہ گئے۔بوڑھے برہمن نے جو پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں پہن رہا تھا۔اس کی پریشانی کو بھانپ لیا اور بولا۔

"آؤ بیٹی!......اپنے گورو دیو کو رخصت کرو۔آج میں بیجانگر جا رہا ہوں۔"

معلوم ہوتا تھا برہمن جیسے پرتھال ہی کا منتظر تھا۔اس کے آتے ہی وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔پرتھال نے آگے بڑھ کر گورو کے چرن چھو لئے۔

"مگر گورو دیو آپ نے کبھی جانے کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔اس اچانک روانگی کا کارن میں نہیں سمجھی۔"

"اری پگلی۔میں تو بیجانگر کا مسافر ہوں۔کاشی سے لوٹا تو یہاں آٹھہرا۔تمہاری سنگیت وڈیا پوری ہو چکی ہے۔اب مجھے اپنے دیس جانا ہے۔"

"آپ کچھ دن اور ٹھہرتے تو اچھا تھا۔"

"نہیں......میرے قیام کے دن پورے ہو چکے۔اب میں نہیں ٹھہر سکتا لیکن پھر آؤں گا تمہارے جیون کے لئے ایک نیا سندیس لے کر۔اس لئے میرا جانا ضروری ہے۔"

"نئے سندیس" کا ذکر سن کر بوڑھا لکھپت چونک اٹھا۔اس کے جی میں آئی کہ برہمن کی روانگی سے پہلے وہ اپنا سوال دہرائے اور پوچھے۔

"مہاراج!میرے سوال کا جواب آپ نے آج تک نہ دیا۔کیا یہ سوال کچھ اتنا ہی ٹیڑھا تھا؟"

پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ اس موقع پر یہ سوال شاید مناسب نہیں لیکن برہمن نے لکھپت کے چہرے پر دل کی بات پڑھ لی تھی۔وہ کہنے لگا۔

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے لکھپت! تم نے جو سوال مجھ سے کیا تھا ابھی اُس کے جواب کا وقت نہیں آیا۔ کچھ دیر اور انتظار کرو۔"

یہ کہہ کر گورکھ ناتھ نے پرتھال کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُسے اشیرواد دی اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر ایک بیل گاڑی تیار تھی۔ برہمن لپک کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ بیلوں کے گلے میں گھنٹیاں بج اٹھیں اور گاڑی ہولے ہولے بیجانگر کے راستے پر ہولی۔ بوڑھا لکھپت اور گاؤں کے کچھ لوگ تھوڑی دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ چلے پھر ایک موڑ پر گورکھ ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر کیا نمسکار کیا اور ان سے آخری رخصت لی۔

پرتھال گھر کی دہلیز پر کھڑی اپنے گورو دیو کی روانگی کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ آج تو اُسے اپنے استاد سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اسے بتانا تھا کہ وہ جس شہزادے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ آ گیا ہے۔ اس کی قسمت کا سوداگر اور وہ اس کی نگاہوں کی تلوار اس میں تل آئی ہے لیکن بیجانگر کا مسافر اس کے دل کی دھڑکنوں کا گیت سنے بغیر اپنے دلش کو چل دیا تھا اور کیا معلوم اب اُس سے کب ملاقات ہو...... پرائے دلیں کے مسافر بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں۔

پرتھال نے اداس اور بھیگی بھیگی نظروں سے اُس کی سواری درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہوتے دیکھی پھر دوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور اوندھے منہ لیٹ گئی۔ وہ اپنے دل کی بات کس سے کہے کسے بتائے کہ آج وہ بے مول بک آئی ہے۔ کیا ان گونگی اور بہری دیواروں سے...... چھت کی کڑیوں سے...... لکڑی کے ان تختوں سے......؟ اس گھر میں کوئی بھی تو اس کے دل کی آواز سمجھنے والا نہیں تھا۔ ماں کا دل مٹی کی طرح نرم تھا۔ لیکن وہ دل کے گھاؤ کو نہیں سمجھتی تھی۔ باپ ایک سنار تھا اور اس کی نظر مول تول سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔

گورو دیو کی روانگی کے بعد پرتھال کچھ دیر جذبات کی آنچ پر سلگتی رہی۔ پھر اُس نے ستار سنبھال لی اور ایک گیت چھیڑ دیا...... ایسے موقعے پر سنگیت ہی اس کے دل کی بیقراری اور روح کی بے چینی کو دُور کر سکتا تھا۔

رات کی بات

یہ واقعہ دستے کے سب سپاہیوں کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث بنا ہوا تھا کہ

شہزادے نے مدگل پہنچنے کی بجائے اس بستی میں پڑاؤ کیوں ڈال دیا ہے؟ وہ تو دارالسلطنت گلبرگہ سے فیروز آباد اور فیروز آباد سے دیوراۓ کی خبر سن کر بگولے کی طرح اُڑتا ہوا آیا تھا لیکن مدگل ابھی کئی کوس کی مسافت پر تھا اور دیوراۓ کی گوشمالی سے قبل اس کا رستے ہی میں ٹھہر جانا یقیناً تعجب خیز تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا اس کا راستہ ایک ایسی قوت نے روک لیا ہے جو دکن کی پوری سلطنت کو تباہی و بربادی کے غاروں میں دھکیل سکتی ہے۔

ایک طرف پرتھال کا حسن تھا اور دوسری طرف بیجانگر کے مہاراج دیوراۓ کی گوشمالی۔ اس کے دل نے مشورہ دیا کہ وہ دشمن کا خیال چھوڑ کر چند روز اس بستی میں قیام کرے۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کا سب سے حسین...... سب سے قیمتی اور انمول خواب دیکھا ہے۔ اس نے دل کا یہ مشورہ قبول کیا اور اپنے فوجی دستے کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

لیکن دیوراۓ کی خبر لینا بھی ضروری تھا ورنہ وہ سلطان کو کیا جواب دے گا؟ اس مقصد کے لئے اس نے شہباز خاں کو مدگل کی طرف دوڑا دیا تھا تا کہ وہ بہمنی سردار فولاد خاں سے دیوراۓ کی سرگرمیوں کا حال دریافت کر سکے۔

ساری رات شہزادہ حسن ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکا پرتھال کے حسین خیال نے اس کی نیند پر جیسے شبخون مار دیا تھا۔ اس کے دل و دماغ نے تصورات کے کتنے ہی جال بنے ..... محبت کی پہلی ملاقات کا سرور انگیز نشہ اُسے کہاں کہاں نہ لئے پھرا۔ ساری رات اس نے اسی سوچ بچار میں گزار دی۔ ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ پرتھال کا جادوگر حسن دل کے ساتھ اس کے محل کی تاریکیوں کو بھی روشن کر دے۔

صبح اسے پھر اپنی محبوبہ سے ملاقات کے لئے جانا تھا اور وہ اسی فکر میں غلطاں تھا کہ وہ اس کے سامنے کن الفاظ میں اظہار تمنا کرے۔ کیا وہ اس کی درخواست کو قبول بھی کرے گی یا کسی مجبوری کا بہانہ تراش کر اُسے ناکام و نامراد لوٹا دے گی؟

پہلی ملاقات سے تو یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ خود پرتھال بھی اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے ورنہ وہ اس کا بخشا ہوا ہار کیوں قبول کرتی؟ اس نے وہ ہار ایک شہزادے کا انعام سمجھ کر نہیں۔ یقیناً ایک عاشق کا نذرانہ سمجھ کر قبول کیا تھا...... اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں محبت کی وہ چمک بھی تو نظر آ رہی تھی۔ جسے دل کے آئینے کا عکس کہتے ہیں پھر

اس کی دلنواز۔ معنی خیز مسکراہٹ۔ وہ نیا نویلا حجاب۔ وہ گلاب کی پنکھڑی ایسے لبوں کے گوشوں کی لرزش۔ وہ بدن پر ایک کیف آگیں تھرتھراہٹ...... ایک سرور انگیز کپکپاہٹ...... آخر یہ سب کیا تھا؟ دکن کی لڑکیاں انہی ''خاموش الفاظ'' میں تو اپنا حال دل سنایا کرتی ہیں۔

''تو اس کا یہی مطلب ہوا نا پہلی ہی ملاقات میں پرتھال نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا ہے؟''

دل نے جواب دیا۔

''دیوانے جب لڑکی کسی محبوب کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنا لیتی ہے تو اشاروں کی زبان میں اس پر اپنی دھڑکنوں کا اظہار بھی کرتی ہے۔''

ساری رات وہ انہی دلچسپ خیالوں میں کھویا رہا۔

صبح جب بستی کے شوالے سے گجر کی آواز بلند ہوئی تو اس کے تصورات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ مشرق کے نیلگوں آسمان پر صبح کاذب کا جلوہ نمودار ہو گیا تھا۔ خنک ہوا کا ایک جھونکا اس کی آنکھوں اور کانوں کو چھوتا ہوا گزر گیا اور اب اُسے معلوم ہوا رات اس نے جاگ کر گزار دی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ اپنے جسم میں کچھ کسلمندی بھی محسوس کرنے لگا۔ فوراً ہی اس نے پردہ گرا دیا اور ہولے ہولے چلتا ہوا بستر کی طرف گیا۔ اس کا جی چاہا وہ کچھ دیر آرام کر لے کیونکہ بے خوابی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور سر میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہونے لگا تھا لیکن اب اگر آنکھ لگ گئی تو نجانے وہ کب بیدار ہو۔ رات کا جاگا ہوا دن کو عموماً دیر تک سویا رہتا ہے۔ اس لئے آرام کا خیال ترک کر دیا۔ پھر اس نے پرتھال سے ملاقات کا وعدہ بھی تو لے رکھا تھا۔ وہ دن چڑھے ندی کنارے درختوں کے اسی جھنڈ میں آئے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو پہلے ہی دن اُسے انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑے۔

طلوع آفتاب کے ساتھ جب وہ خیمے سے باہر نکلا تو شہباز خاں نے کورنش بجا لا کر آداب پیش کیا۔ حاکم مدگل فولاد خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اُس نے سر پر ''خود'' پہن رکھا تھا تاکہ ظاہر کر سکے وہ فوجی معاملات میں ہر وقت چوکس اور ہوشیار رہتا ہے۔ شہباز خاں بھی فوجی لباس میں تھا اور وہ دونوں شہزادے کی ہدایات پر راتوں رات سفر کر کے یہاں پہنچ

گئے تھے۔

ولی عہد نے اسے ایک نیک شگون تصور کیا اور اُن سے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمکلام ہوا۔

فولاد خاں نے بتایا شہزادہ عالی کی آمد کی اطلاع پا کر بیجانگر کا مہاراج دریائے تنگ بھدرا کا چکر کاٹ کر واپس چلا گیا ہے اور اب سرحدی تاخت کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ دیورائے ایک عرصہ تک اِدھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ لوٹ مار کا وقت نکل چکا اور اب اگر اس نے دریا عبور کرنے کی جرأت کی تو اُسے خون کے کئی دریا تیرنا پڑیں گے۔

یہ خبر سن کر حسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ دراصل وہ کوئی ایسی ہی خبر سننا چاہتا تھا جو اُسے تعاقب کی پریشانی سے بچالیتی۔ اس نے خوش ہو کر فولاد خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پُر رعب آواز میں بولا۔

"دیورائے نے بہادری شیر سے اور چالاکی لومڑی سے سیکھی ہے۔ وہ حملہ کرتا ہے تو کہیں رکتا نہیں اور جب پلٹتا ہے تو بھاگتا نہیں بلکہ لومڑی کی طرح کسی نہ کسی غار میں دبک جاتا ہے تاکہ دشمن کو غافل پا کر پھر جھپٹ پڑے لیکن وہ جب بھی آئے تمہاری تلوار کو بے نیام ہی دیکھے......"

اس کے جواب میں فولاد خاں نے اپنا سر جھکا لیا۔

"غلام سلطان حضور کی رکاب میں کئی جنگیں لڑ چکا ہے اور ہماری دشمنوں کی گھات کو خوب سمجھتا ہے۔ دیورائے مجھے کبھی نہیں غافل پائے گا۔"

اس جواب پر ولی عہد نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس کے لئے یہی بہت تھا کہ دیورائے لڑے بھڑے بغیر لوٹ گیا تھا اور اس نے اپنے پیچھے کوئی ایسا نشان بھی نہیں چھوڑا تھا۔ جس سے معلوم ہو سکتا کہ وہ موقع پاتے ہی پھر پلٹ آئے گا۔ رتنگ بھدرا کے کنارے سے ہٹ کر اس نے سیدھا بیجانگر کا رُخ کیا تھا اور اب شہزادہ جب تک چاہتا اس بستی میں قیام کر سکتا تھا۔

یہ احساس بڑا فرحت بخش اور سکوں نواز تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ پرتھال سے ملاقات کر سکے گا اور دیورائے کی گوشمالی کا خیال اس کی پریشانی کا موجب نہیں ہوگا۔ پھر اس نے فولاد خاں کو کچھ ہدایات دیں اور فوراً ہی خیمے کے اندر چلا گیا۔

چلتے چلتے اس نے سوچا کیوں نہ وہ وقت مقررہ سے پہلے ہی ندی کنارے پہنچ جائے

اور پرتھال کو حیران کر دے کہ جب دکن کے شہزادے کسی حسینہ کو اپنی نگاہوں کا مرکز بناتے ہیں تو اس کی یاد میں اپنے آپ کو بھی گم کر دیتے ہیں وہ چاہتا تھا۔ اسی بہانے پرتھال پر اپنی بیقراری کا اظہار کر سکے۔ اسے بتا سکے تم نے ایک شہزادے کے دل کا سکون لوٹ لیا ہے اور اس نے اپنے شاہی فرائض کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود کو تمہاری زلفوں کا اسیر بنا لیا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے گھوڑا طلب کیا اور لشکر گاہ سے نکل کر اس کا رُخ ندی کی طرف موڑ دیا۔ سپاہی یہی سمجھے ولی عہد کو شکار کا شوق لے اڑا ہے لیکن فولاد خاں جو تھوڑی دیر پہلے مدگل سے آیا تھا اُسے تنہا جاتے دیکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

دھڑکنوں کا ساز

گھنے درختوں سے گزرتا ہوا جب وہ بانس کے جھنڈ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پرتھال پہلے ہی وہاں موجود تھی اور لمبی لمبی شاخوں کے درمیان کھڑی شاید اسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔

شہزادہ تو یہ توقع لے کر آیا تھا کہ چند لمحے خود پرتھال کا انتظار کرے گا اسے اپنی بیقراریوں کی کہانی سنائے گا لیکن پرتھال کو خلاف توقع اپنا منتظر دیکھ کر اس کی حیرت کی حد نہ رہی وہ سمجھ گیا کہ حُسن خود اس کے لئے بیقرار ہے۔ ایک عاشق کے لئے یہ احساس کس قدر دل افزا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا۔ پرتھال نے اُسے دیکھا تو اُس کے ہونٹوں کے گوشوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور جھک کر آداب بجا لائی۔

"داسی کا سلام قبول ہو شہزادہ عالی!"

بے اختیار حسن کا جی چاہا۔ وہ پرتھال کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لے اُسے سینے سے لگائے۔ گھوڑے پر بٹھائے اور فیروز آباد کی راہ لے لیکن اچانک اس کے قدم رُک گئے اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی وسوسے رینگنے لگے۔ کہیں محبت کا یہ اظہار قبل از وقت تو نہیں؟ کہیں پرتھال بدگمان تو نہیں ہو جائے گی کہ ایک شہزادہ ایک غریب لڑکی پر یکایک اتنا مہربان کیوں ہو گیا؟ مگر یہ احساس اس کے اپنے ہی وہم کا ایک کرشمہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ رعب حسن نے اس کے پاؤں میں جیسے زنجیر ڈال دی تھی

اور وہ اس وقت ایک کمزور سی لڑکی کے سامنے خود کو بے بس اور مجبور محسوس کر رہا تھا۔

گلبرگہ اور فیروز آباد کی محل سراؤں میں نہ جانے کتنی خوش جمال کنیزیں صرف اس کے قدموں کی چاپ سن کر کانپ جایا کرتی تھیں۔ اُن کے چندن سے بدن شاہی رعب سے کپکپا اُٹھتے تھے اور اُن میں اتنی جرأت نہ تھی کہ نگاہ بھر کے ولی عہد کی طرف دیکھ ہی سکتیں...... خود حسن نے بھی محل کی ان نازنینوں کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ گھڑی دو گھڑی اُن کے ساتھ ہنس بول لے وہ جانتا تھا یہ کنیزیں...... محض مٹی کی مورتیں ہیں۔ جن کے جسموں میں جوانی کی گرمی تو ہوگی لیکن دل محبت کی حرارت سے محروم ہیں۔ یہ صرف اتنا ہی جانتی ہیں کہ ولی عہد کے قدموں کی چاپ سن کر جہاں ہیں وہیں رُک جائیں اور اپنی راج ہنس کی طرح لمبی لمبی گردنیں جھکا کر باادب کھڑی ہو جائیں۔ بھلا شہزادے کو مٹی کی ان پتلیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جو اس کی صورت دیکھ کر شام کے سایوں کی طرح کانپ کانپ جاتی تھیں؟ لیکن آج دکن کا ولی عہد...... بیسیوں دوشیزاؤں کا ولی نعمت ایک سنار کی لڑکی کے سامنے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی پجاری دیوی کے حضور عقیدت کی بھینٹ لئے حاضر ہو۔

شہزادے کی اس محویت نے پرتھال کو چونکا دیا۔ آخر وہ کیا سوچ رہا ہے؟ شہزادوں کی سوچ بے وجہ بے مقصد نہیں ہوا کرتی۔ کہیں اُسے اپنے مرتبے کا خیال تو نہیں آ گیا......؟

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی حسن کی طرف بڑھی۔ شہزادہ ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔

پرتھال نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا...... ”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

اس سوال پر حسن جیسے خواب سے بیدار ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر پرتھال کی طرف دیکھا اور بولا ”میں نے سنا تھا ہمیشہ عشق ہی حُسن کا انتظار کیا کرتا ہے لیکن آج میں نے اس قول کو بالکل مختلف پایا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں۔ تمہاری ذات پر اعتبار کروں یا اس بات پر جو غلط ثابت ہو چکی ہے۔“

پرتھال کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے پھولوں کی چھاگل بج اٹھے۔

”بس...... اتنی دیر سے آپ یہی سوچ رہے تھے؟“

”ہاں......“ حسن نے بیچارگی کا اعتراف کر لیا۔

”تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔“

"میں آپ کو مشورہ دوں؟"

"ہوں......"

"جو چیز آپ کے سامنے ہے اس پر وشواش کر لیجیے۔"

"میرے سامنے تو تم ہو۔"

حسن کے لہجہ میں شرارت کی جھلک تھی۔

"تو کیا میں وشواش کے قابل نہیں؟"

پرتھال نے یہ فقرہ کچھ اس بے ساختگی کے ساتھ ادا کیا کہ حسن کے کانوں میں نغمے سے گونج اٹھے۔ اس ایک فقرے میں اس کی پوری زندگی سمٹ آئی تھی اور اُس نے گویا اپنے آپ کو اپنے مستقبل کو۔ اپنی ساری زندگی کو الفاظ میں لپیٹ کر شہزادے کے قدموں میں رکھ دیا تھا کہ لیجیے بندی تو حاضر خدمت ہے اب ٹھکرا دیجیے یا اٹھا لیجیے۔

ایک لمحہ کے لئے اس کی نگاہیں حسن کے چہرے پر سوال کا جواب تلاش کرتی رہیں پھر آپ ہی آپ جھک گئیں اور وہ شرما سی گئی۔

حسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور کہا۔

"پرتھال! اگر تم اعتبار کے قابل نہ ہوتیں تو میں ساری رات آنکھوں میں نہ کاٹ دیتا اور تم سے ملاقات کرنے کی بجائے اس وقت میرا گھوڑا بیجانگر کے مہاراج کا تعاقب کر رہا ہوتا۔"

پرتھال شہزادے کے لہجے کی کپکپاہٹ اور اپنی ٹھوڑی پر اس کے ہاتھ کی لرزش محسوس کر رہی تھی۔ یہ کپکپاہٹ، یہ لرزش اس امر کی شہادت تھی...... کہ شہزادے نے اس کے سامنے اپنے دل کی بات ظاہر کر دی ہے۔ اقبالِ جرم اور اقرارِ محبت کرتے ہوئے انسان پر اکثر ایک عجیب سی لرزش طاری ہو جاتی ہے جو دراصل اس کے صدقِ دل کی علامت ہوتی ہے۔ حسن نے اس وقت جو کچھ بیان کیا تھا۔ وہ گویا اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز تھی...... نہیں بلکہ یہ آواز خود اس کے دل کی ایک دھڑکن تھی جو الفاظ کا رُوپ دھار کر اس کے لبوں پر آ گئی تھی اور پرتھال یہ آواز سن کر من ہی من میں اس بات پر فخر کر رہی تھی۔ کہ دکن کا جواں سال ولی عہد...... سلطنت بہمنی کا وارث اُس کے تصور میں رات بھر نہیں سو سکا۔ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ اُسے اپنے دل کی رانی بنانا چاہتا ہے لیکن ان احساسات

کے ساتھ ہی ایک بھیانک خیال نے سانپ کی طرح اپنا سر اٹھایا اور فوراً ہی اس کے چہرے پر کسی نامعلوم خوف کے سائے رینگنے لگے جیسے اُسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔

''کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں؟''

''کیوں نہیں مہاراج!'' پرتھال افسردہ آواز میں کہنے لگی۔ ''اسی یقین نے تو مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔''

پرتھال نے پہلی مرتبہ ڈری ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر رک رک کر بولی۔ ''ڈرتی ہوں کہیں میرا مطلب سمجھ کر آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ ان داتا کے ماتھے کی ایک شکن غریب کے لئے موت کا پیغام بن سکتی ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو پرتھال!'' حسن نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''نہ اس وقت میں شہزادہ ہوں اور نہ تم ایک غریب لڑکی۔ اس وقت ہمارے درمیان کوئی ایسی طاقت حائل نہیں جو تمہیں خوفزدہ کر سکے۔ تم جو کچھ بھی چاہتی ہو بلا خوف کہہ دو۔ خواہ وہ میرے ہی متعلق کیوں نہ ہو۔''

ایک لمحہ خاموش رہ کر پرتھال نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور بولی۔

''میرے سامنے بے شک آپ راجکمار نہ سہی۔ لیکن دنیا کی نگاہوں میں آپ ہر وقت راجکمار رہیں گے اور میں ایک غریب لڑکی...... جس کا باپ گاؤں کا معمولی سنار ہے۔ بادشاہ اور رعایا کے درمیان کچھ فاصلے ہوتے ہیں اور لوگوں کی نگاہیں ان فاصلوں کو اتنی جلدی عبور نہیں کر سکتیں۔ اس لئے میں ڈرتی ہوں۔ کہیں میرے پریم کو جرم نہ سمجھ لیا جائے۔ کہیں سلطان عالی کا غضب ہم غریبوں کو جلا کر خاکستر نہ کر دے۔''

پرتھال کے لہجے میں ایک تھرتھراہٹ سی تھی۔ اس کے باوجود اس کے الفاظ کا مطلب بالکل صاف تھا...... اس نے بڑے واضح الفاظ میں ان خطروں کا اظہار کیا تھا۔ جو اس محبت کے نتیجے میں پیش آ سکتے تھے۔

حسن نے یہ سب باتیں بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سنیں۔ وہ جانتا تھا پرتھال کے یہ وسوسے حقیقت کا روپ بھی دھار سکتے ہیں کیونکہ وہ سلطنت کا ولی عہد تھا۔ دکن کا ہونے والا سلطان اور شاہی قانون کے مطابق اس کی شادی کسی شہزادی یا خان زادی ہی سے ہو سکتی

تھی۔ شہزادے اپنی عام محبوباؤں کو حرم میں داخل تو کر سکتے تھے لیکن انہیں شاہی اعزاز اور سلطانی منصب نہیں دلا سکتے تھے۔ یہ اعزاز کسی شاہی خاندان کی لڑکی ہی کو نصیب ہو سکتا تھا اور اسی کی اولاد تخت و تاج کی وارث بن سکتی تھی۔ دوسری عورتیں اس عزت افزائی کی مستحق نہ تھیں پھر محل سرا میں اُن کی حیثیت بھی داشتاؤں یا خاص کنیزوں سے کچھ زیادہ نہ تھی لیکن ان کے لئے بھی سلطان معظم کی رضامندی ضروری تھی شہزادوں اور شاہی خاندانوں کے دوسرے افراد کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ جس عورت کو چاہیں حرم میں داخل کر لیں۔

پرتھال شاہی محلات کے دستور سے آگاہ نہ تھی اور نہ یہ جانتی تھی کہ حرم سراؤں اور راج محلوں میں رانیوں، شہزادیوں اور دوسری عورتوں کی زندگی کے دھارے کس رُخ بہتے ہیں۔ اُن کے درمیان تفریق و امتیاز کے کیسے کیسے جھگڑے کھڑے رہتے ہیں۔ اُسے تو صرف اتنا علم تھا وہ ایک لڑکی ہے اور شاہی قانون کے مطابق اس کا ولی عہد سے محبت کرنا ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا میں وہ زندگی سے بھی ہاتھ دھو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے شہزادہ حسن کو اپنا دیوتا...... اپنا محبوب بنالیا تھا اور اب وہ اُن خطرناک اندیشوں کا اظہار کر رہی تھی جو اس محبت کے نتیجے میں پیش آسکتے تھے۔

پرتھال کی باتیں سن کر حسن کے ذہن میں بھی خطروں کی پرچھائیاں سی تھرتھرانے لگیں کیونکہ ایک عام لڑکی کی محبت اُسے دکن کے تخت و تاج سے بھی محروم کر سکتی تھی اور اس کے بہادر چچا امیر الامرا احمد خاں خانخاناں کی موجودگی میں تو یہ خطرہ اور بھی زیادہ بھیانک شکل اختیار کر سکتا تھا لیکن حسن اُن شہزادوں میں سے نہیں تھا۔ جن کی محبت کی ڈوری تخت کے پایوں کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ سلطنت کا ولی عہد ہونے کے علاوہ وہ اپنی بات پر مر مٹنے والا ایک بہادر اور جوانمرد سپاہی بھی تھا۔ وہ اپنی محبت کی خاطر تاج و تخت کو بھی ٹھوکر مار دینے پر تیار تھا۔ اس نے پرتھال کی آنکھوں میں محبت کی چمک دیکھ لی تھی۔ اس کی باتوں میں دل کا کرب محسوس کر لیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"محبت کرنے والے دل شہنشاہوں کے قہر و غضب سے نہیں ڈرتے پرتھال! کیا تم مجھ سے محض اس لئے منہ موڑ لینا چاہتی ہو کہ سلطانِ عالی کا قانون ہماری محبت پر بجلی بن کر گر سکتا ہے؟ کیا تم اس لئے ڈرتی ہو کہ میں ایک شہزادہ ہوں اور تمہاری دسترس سے دور ہوں تمہیں اپنی محبت عزیز نہیں۔ صرف زندگی پیاری ہے؟"

"نہیں جانِ عالم!" پرتھال نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے زندگی کی کوئی پروا نہیں۔ پریم میں موت بھی امر ہوتی ہے۔"

"تو پھر خوف کس بات کا ہے؟"

"ڈرتی ہوں کہیں تاج وتخت کی ضرورتیں آپ کو مجھ سے چھین نہ لیں۔ کہیں مجھے اپنا جیون آپ کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر نہ گزارنا پڑے۔"

"اطمینان رکھو! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔" شہزادے نے محبت کے جوش میں اپنے ہاتھ پرتھال کے کندھوں پر رکھ دیئے...... "اگر تاج وتخت نے مجھے تم سے چھیننے کی کوشش کی تو میں تمہاری خاطر اُسے بھی ٹھوکر ماردوں گا۔"

"شہزادہ عالی!" پرتھال کے لبوں پر خوشی کی ایک چیخ بکھر گئی...... "میرے لئے آپ اتنا بڑا بلیدان دینے پر تیار ہیں؟"

"تم نے ایک شہزادے کا ہاتھ پکڑا ہے پرتھال! کسی معمولی آدمی کا سہارا نہیں لیا اور تم جانتی ہو شہزادے کبھی کبھی محبت کی تاریخ اپنے خون سے بھی لکھا کرتے ہیں۔" حسن کے لہجے میں عزم ویقین کا جذبہ تیر رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ اُس نے پرتھال کی خاطر تخت وتاج سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔

شہزادے کو اس وقت مہربان پا کر پرتھال کے دل میں محبت چشمے کی طرح پھوٹ نکلی۔ اُس پر ایک بے خودی سی طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں اُس نے اپنا سر حسن کے کندھوں پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے تصورات کے جھولے میں کھوگئی۔

"آپ اپنی داسی کو ہمیشہ وفادار پائیں گے جانِ عالم!" اس کی آواز میں پریم کا رس تھا۔ شہد کی مٹھاس تھی۔ دل کا درد تھا اور محبت کا خلوص۔ شہزادہ حسن کے سینے کے ساتھ لگی وہ کہہ رہی تھی۔

"میں بہت دنوں سے میٹھے میٹھے سپنے دیکھ رہی تھی۔ میرے پاؤں اپنے آپ ہوا میں اُڑنے لگتے تھے۔ نگاہوں کے سامنے بڑے دلکش رنگ سے بکھر جاتے تھے اور وہ پھیلتے بکھرتے اور ناچتے ہوئے رنگ کبھی کبھی ایک حسین شہزادے کی شکل اختیار کرلیتے تھے۔ مجھے اب معلوم ہوا وہ شکل آپ کی تھی۔ جانِ عالم کی...... شہزادہ عالی کی اور میں یہ بھی جانتی ہوں آپ مجھے اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیں گے کیونکہ آتما ہمیشہ شریر میں رہتی

ہے۔"

حسن نے پرتھال کو اپنے مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا پھر ٹھوڑی پکڑ کر..... اس کا خوبصورت چہرہ اوپر اُٹھایا اور نہایت آہستگی کے ساتھ اپنے مرتعش ہونٹ پرتھال کے انگارے کی طرح دہکتے ہوئے سرخ لبوں پر رکھ دیئے۔ پیاسے ہونٹ آپس میں ٹکرائے اور ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ جیسے دن اور رات گلے مل رہے ہوں۔

دور درختوں کے جھنڈ میں کوئل کی کوک فضا کے سینے میں سریلی دھڑکنوں کے ساز چھیڑتی ہوئی گزر گئی۔

پرتھال ابھی تک شہزادہ حسن کے سینے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور دونوں کے ہونٹ بدستور ایک دوسرے میں پیوست تھے گویا ان کے سر پر بے رحم آسمان کی گردشیں ختم چکی تھیں۔

قسمت کا کھیل

وادی میں پڑاؤ کئے پورے سات دن ہو چکے تھے اور سپاہی ابھی تک حیران تھے اس جگہ قیام کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اپنے نظر نواز مناظر کے اعتبار سے یہ وادی ایک بہترین تفریح گاہ ضرور تھی لیکن یہاں اتنے روز تک ٹھہرنا یقیناً تعجب انگیز تھا۔ اس سے پہلے شہزادے نے ایسے مقامات پر کبھی زیادہ دیر پڑاؤ نہیں ڈالا تھا وہ جب بھی سیر و شکار کے لئے گلبرگہ سے نکلتا تو اُن جنگلوں کا رُخ کرتا جہاں خوفناک جانوروں کا شکار کر سکتا۔ اس نے متعدد شیر اور چیتے ہلاک کئے تھے جن کی کھالیں مصالحہ سے خشک کر کے اس کے کمرۂ خاص میں بچھا دی گئی تھیں لیکن اس وادی میں تو کوئی لومڑ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ رات کے وقت دُور سے گیدڑوں کی "ہوانک" ضرور سنائی دیا کرتی تھی اور دن کو بعض سپاہی اِدھر اُدھر سے کسی نہ کسی خرگوش کا شکار کر لاتے تھے لیکن اُن کا زیادہ وقت خوش گپیاں اڑانے میں گزر جاتا تھا۔

گاؤں یہاں سے صرف کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا اور ولی عہد کے قیام کا سن کر گاؤں کا مکھیا سکھ دیو چند لوگوں کی معیت میں دوسرے ہی دن سلام کرنے اور نذر گزارنے کے لئے حاضر خدمت ہو گیا تھا۔ میر لشکر شہباز خاں نے اس کی نذر قبول کی اور بتایا کہ

شہزادہ عالی نے صرف تفریح کی غرض سے یہاں پڑاؤ کیا ہے۔ بوڑھا مکھیا فکر مند تھا کہ کہیں گاؤں پر کوئی آفت نہ آ جائے۔

جب شہزادے کو معلوم ہوا کہ گاؤں کا سنار لکھپت بھی مکھیا کے ساتھ آیا ہے تو اُس نے ملاقاتیوں کو اپنے خاص خیمہ میں شرف ملاقات بخشا۔ سب لوگ شاہی رُعب سے کانپ رہے تھے۔ وہ مدگل کے ضلعدار کی آمد ہی سے ہراساں ہو جایا کرتے تھے اور اس کی آؤ بھگت اس طرح ہوتی تھی جیسے بادشاہ کی سواری آ رہی ہو لیکن اب تو شہزادہ عالی نے بہ نفسِ نفیس اُن کے گاؤں کو رونق بخشی تھی۔ بھلا وہ اپنے جذبۂ خدمت گزاری اور وفا شعاری کا اظہار کیوں نہ کرتے؟

شہزادہ اُن کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی اور بے تکلفی سے پیش آیا وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ یہ حسنِ سلوک دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ شہزادے نے دریافت کیا۔ اگر انہیں کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو وہ بیان کر سکتے ہیں۔ اُس کا ازالہ کر دیا جائے گا لیکن اُن کے پاس کوئی شکایت نہ تھی۔ اُن کے لئے تو یہی اعزاز بہت تھا کہ ولی عہد کے درشن کر لئے ہیں اور ہندوؤں میں اپنے بادشاہ مہاراجہ کے درشن کر لینا ہی گویا ایک انعام تھا۔ ایک نیک شگون تھا۔ ولی عہد نے بہمنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے انہیں انعام و اکرام سے نوازا۔ بوڑھے سکھ دیو کو ایک خلعت عطا ہوا۔ دوسروں کو اشرفیوں سے نوازا گیا۔ لکھپت کو ایک عقیق دے کر فرمائش کی گئی کہ وہ اسے ایک خوبصورت انگشتری میں جڑ دے اور اس طرح شہزادے نے سنار کے ساتھ اپنے تعلقات کا آغاز کیا۔ اس فرمائش پر وہ اس قدر خوش تھا جیسے اس کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا گیا ہو۔ اُسی روز وہ شاہی انگوٹھی کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی۔ لکھپت ولی عہد کے لئے انگوٹھی بنا رہا ہے۔ لوگ وہ انگوٹھی دیکھنے کے لئے اس کی دُکان پر آنے لگے۔ لکھپت بڑے فخر کے ساتھ گردن اونچی کر کے کہتا۔

"تم مجھے کوئی معمولی سنار نہ سمجھو۔ میرے ہنر کی شہرت راج دربار تک پہنچ گئی ہے۔ شہزادے کے لئے انگوٹھی تیار کرنا کوئی معمولی کام نہیں ایسے نگینے جڑوں گا کہ سارے دکن میں دھوم مچ جائے گی اور لوگ لکھپت سنار کے ہاتھ چومنے آیا کریں گے۔"

پرتھال دن میں کئی کئی مرتبہ پوچھتی۔

"بابا! کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟"

اور لکھپت جواب دیتا۔

"بیٹا! شہزادے کی انگوٹھی بنا رہا ہوں۔ کسی ٹٹ پونجیے ساہوکار کی نہیں۔ تم کیا جانو شہزادوں کی پسند کیسی ہوتی ہے۔"

اور پرتھال خوش ہو کر چھیڑنے لگتی۔

"پر بابا! اگر راجکمار نے تمہاری بنائی ہوئی انگوٹھی پسند نہ کی تو......"

"واہ..... پسند کیسے نہیں کریں گے۔ میں کوئی نائی دھوبی نہیں سنار ہوں سنار ایسا سونا لگایا ہے کہ ساری عمر چکا چوند نہیں جا سکے گی۔ تو دیکھ تو سہی ایشور نے چاہا تو میری بنائی ہوئی انگوٹھی شہزادے کی انگلی میں اور میں اس کے دل میں بیٹھوں گا۔"

"پر تم شہزادے کے دل میں بیٹھ کے کیا کرو گے؟"

"اری! تیرے بیاہ کے زیور بناؤں گا وہاں بیٹھ کے۔"

بوڑھے لکھپت کو دنیا جہاں میں پرتھال کا بیاہ رچانے کے سوا جیسے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ باپ کی یہ بات سن کر پرتھال کے چہرے پہ سرخی کی لہر دوڑ جاتی اور وہ شرما کر انگلی دانتوں میں دباتی اور مسکرا کر بھاگ جاتی۔

کئی دن لگا محنت کے بعد آخر کار انگوٹھی تیار ہو گئی مگر شہزادے کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے اس نے ضروری سمجھا کہ گاؤں کے مکھیا کو دکھا کر ذرا اس کی رائے معلوم کر لے۔ سکھ دیو کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں نے اس انگوٹھی کو دیکھا۔ اور عش عش کر اُٹھے۔ واقعی بوڑھے لکھپت نے اپنی ہنر مندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا جب سب نے انگوٹھی کی تعریف کی اور اُسے واقعی ایک شاہی تحفہ قرار دیا تو بوڑھا لکھپت مطمئن ہو گیا پھر مکھیا کو ساتھ لے کر شہزادے کی طرف چل دیا۔ سکھ دیو نے بہتیرا کہا کہ بھلا میرا کیا کام ہے۔ تم اکیلے ہی چلے جاؤ۔ مگر لکھپت نے جواب دیا۔

"نہیں مکھیا کاکا..... تمہارے بغیر میں نہیں جا سکتا۔ شہزادے کا معاملہ ہے مجھ سے تو وہاں بات بھی نہ ہو سکے گی۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

پہلے کی طرح شہزادہ نے انہیں پھر اپنے خیمہ خاص میں بلایا۔ جب لکھپت نے انگوٹھی پیش کی تو اس کے دونوں ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے بدن پر رعشہ سا طاری تھا

اور دل سینے کے اندر یوں دھک دھک کر رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر باہر آ جائے گا۔ یا پھر ایک دھماکے کے ساتھ اس کی حرکت بند ہو جائے گی۔

شہزادے نے انگوٹھی پسند کی..... انگلی میں پہنی اور لکھپت سے مخاطب ہوا جو ابھی تک کانپ رہا تھا۔

"لکھپت! تم نے ہماری توقع سے زیادہ اچھا کام کیا ہے۔ مانگو! ہم تمہیں کیا انعام دیں؟"

اگر بوڑھا سنار اس وقت پورے مدگل کی جاگیر طلب کر لیتا تو شہزادہ بخوشی اس کی آرزو پوری کر دیتا کیونکہ فیروز آباد کا علاقہ اسی کے تحت تھا لیکن شہزادے کی زبان سے خوشنودی کے الفاظ سن کر لکھپت پر ایک اور کپکپی طاری ہو گئی۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک سلطنت کا ولی عہد اُسے منہ مانگی مراد دینے کے لئے تیار تھا۔ اس خوشی سے اس کے ہوش و حواس ایسے اڑے کہ اُسے کوئی خواہش ہی یاد نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحے اُس نے اپنے دل و دماغ کے اُجڑے ہوئے گوشوں کو ڈھونڈا۔ کچھ دیر اپنی یادوں کے پرانے جنگل میں گھومتا رہا۔ پھر اپنے ذہن کے ویرانے پر نظر دوڑائی لیکن کوئی آرزو، کوئی تمنا، کوئی خواہش دکھائی نہ دے سکی جسے وہ ولی عہد کے سامنے بیان کر سکتا۔ اس زندگی میں تو اُسے بس ایک ہی فکر ایک ہی چنتا تھی کہ اس کی سندر اور جوان بیٹی پرتھال کی شادی ہو جائے...... اور بس تو کیا وہ شہزادے کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے، اسے کہے۔

"مہاراج! میری تو ایک ہی تمنا ہے بیٹی کا گھر آباد ہو جائے۔ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں چاہتا......"

لیکن ولی عہد کے روبرو اس قسم کی بات کرنا کیا گستاخی اور بے ادبی نہیں؟

"چھی چھی...... لکھپت! تم کیسی باتیں سوچتے ہو۔ ارے بے ادب! ہوش کے ناخن لو۔ تم اس وقت پنڈت گورکھ ناتھ کے روبرو نہیں۔ دکن کے ولی عہد کے حضور کھڑے ہو۔ کوئی الٹی سیدھی ہانک دی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

اور دل کے اس مشورے پر لکھپت اپنی ایک ہی عزیز ترین خواہش کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ شہزادہ اور سکھ دیو دونوں اُس کی خاموشی پر حیران تھے آخر شہزادے نے دوبارہ پوچھا۔

"کہو لکھپت! ہم تمہاری کون سی خواہش پوری کریں؟ تمہیں کیا انعام دیں؟"

بہ ہزار دقت سنار نے تھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اَن داتا! آپ کی پسند ہی میرے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

جب بڈھا کسی خواہش کا اظہار نہ کر سکا تو شہزادے نے اپنی خوشی سے اُسے خلعت فاخرہ اور اشرفیوں کے توڑے انعام میں دیئے اور ایک فرمانِ خاص بھی عطا کیا کہ وہ جب چاہے فیروز آباد میں آ کر ولی عہد سے مل سکتا ہے۔ فیروز آباد ولی عہد ہی کی جاگیر تھی۔ وہ کبھی فیروز آباد میں اور کبھی گلبرگہ میں قیام کرتا تھا۔

یہ انعام، یہ اعزاز، لکھپت کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے فیروز آباد کے راج محل میں جانے کے لئے پروانہ خاص مل جائے گا۔ یقیناً قسمت اس پر اُس کی حیثیت سے زیادہ مہربان ہو چکی تھی۔

جب بوڑھا سنار شاہی انعام و اکرام میں لدا پھندا گاؤں میں داخل ہوا۔ تو چاروں طرف لکھپت کی خوش بختی کے ڈنکے بج گئے اور ہر شخص اس کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔

"بوڑھے کے سوئے ہوئے بھاگ جاگ اُٹھے ہیں۔"

لیکن کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ سنار کے بھاگ نہیں جاگے تھے۔ پرتھال کی قسمت نے انگڑائی لی تھی۔

خطرے کا آغاز

لشکر میں صرف رونق بیگ جانتا تھا کہ اس وادی میں اتنے لمبے پڑاؤ کا مقصد کیا ہے۔

وہ ولی عہد کا پرانا رفیق اور راز دار تھا اور اُس کے مزاج کو سمجھتا تھا...... اُسے معلوم تھا وقتی طور پر بعض چیزیں اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں لیکن جونہی اُن کی دلکشی ختم ہوتی ہے وہ انہیں بھول جانے کا عادی ہے۔ البتہ اُسے اس بات کا اندیشہ ضرور تھا کہ پہلے کبھی اس قسم کا رنگین حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ نہ کبھی ولی عہد کے دل کی دھڑکنوں کی کہانی زبان پر آئی تھی۔ نہ اُسے تنہائیوں سے پیار ہوا تھا۔ کہیں یہ تازہ حادثہ دل کا روگ نہ بن جائے...... پھر وہ سوچتا محبت کی یہ کسک چند روز میں خود بخود جاتی رہے گی...... درد آپ اپنی دوا بن جائے گا اور شہزادہ پہلے کی طرح اس واقعہ کو بھی بھول جائے گا جو اتفاقی طور پر ظہور میں آ گیا ہے

لیکن جب اُس نے دیکھا قیام کی مدت بڑھتی جا رہی ہے اور ولی عہد کی پریشانیوں اور بیقراریوں میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس کے اندیشے ہولے ہولے حقیقت کا روپ دھارنے لگے اور ایک روز اس نے اپنے دل میں ایک نئے خطرے کی دھمک محسوس کی۔ وہ کانپ سا گیا کیونکہ تصور کی آنکھ سے اُس نے تخت کے پائے لرزتے ہوئے دیکھے تھے اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے محبت ولی عہد کا رستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور کوئی بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

"تم دو چیزوں میں سے صرف ایک کا انتخاب کر سکتے ہو۔ محبت یا تخت" اور شہزادہ حسن نے جواب دیا۔ "مجھے صرف محبت بخش دو، تخت لے لو۔"

یہ تصور کس قدر بھیانک اور روح فرسا تھا۔ شہزادہ حسن خاں جو دکن میں "شمشیر زن" کے نام سے مشہور تھا۔ محبت کی خاطر تاج و تخت بھی قربان کر دے گا؟ یہ بات کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

دوسری صبح ابھی شہزادہ بستر سے بھی نہیں اُٹھا تھا کہ خدمت گار نے اطلاع دی۔

"رونق بیگ شرف بازیابی چاہتا ہے۔"

کئی روز سے اُس نے کسی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ وہ دن کا اکثر حصہ باہر گزارا کرتا تھا اور شام کو واپس آ کر خیمے میں چلا جاتا۔ کسی شخص کو ملاقات کی اجازت نہ تھی کبھی کبھار جب اس کی طبیعت کچھ زیادہ پریشان ہوتی وہ میر مغنی کو بلا کر رباب پر کوئی نغمہ سن لیا کرتا تھا یا پھر خاموش لیٹا خیالوں میں گم رہتا۔ صبح ہی صبح وہ کسی سے ملنے پر تیار نہ تھا کیونکہ وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی بیقراری محسوس کر رہا تھا لیکن رونق بیگ اس کا مصاحب ہی نہیں ایک دوست بھی تھا اور اس کی بیقراری کا بھید جانتا تھا۔ اُس نے توقف کیے بغیر حاضری کی اجازت دے دی۔

جب رونق بیگ پردہ ہٹا کر خیمے کے اندر داخل ہوا تو شہزادہ شب خوابی کے لباس میں ایک چوبی شہ نشین پر پاؤں رکھے کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں رونق بیگ کو شبہ گزرا وہ اداس ہے لیکن اس کا قیافہ غلط تھا کیونکہ جب شہزادے نے گردن اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک نامعلوم سی خوشی چمک رہی تھی۔ وہ مسرت انگیز لہجے میں بولا۔

"رونق بیگ! تم خوب آئے۔ میں خود تمہیں بلانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔"

رونق بیگ نے طنز کا نشتر چلایا۔

"خلافِ معمول آج آپ کو یہ خادم کیسے یاد آ گیا؟"

"کیا میں نے کبھی تمہیں فراموش کیا ہے؟"

"میرا مطلب ہے آج کل آپ حسین یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی دوسرا کم ہی یاد آیا کرتا ہے۔"

اس جواب سے حسن سمجھ گیا کہ وہ کوئی فیصلہ کن گفتگو کرنے آیا ہے اور وہ گفتگو کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے متعلق بھی اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

"دوسروں کی طرح غالباً تم بھی قیام سے تنگ آ چکے ہو اور اس وقت یہ دریافت کرنے آئے ہو کہ کوچ کا حکم کب ملے گا؟"

"آپ کا قیاس بالکل درست ہے کہیں یہاں مستقل پڑاؤ کا ارادہ تو نہیں؟"

"جی تو یہی چاہتا ہے۔ فیروز آباد کو چھوڑ کر اسی وادی میں آ رہوں۔"

"بڑا مبارک خیال ہے۔" رونق نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے۔

"مجنوں نے بستی چھوڑی تھی آپ شہر چھوڑ دیں مگر لشکر بیچارے نے کیا جرم کیا ہے۔ جس کی سزا میں اُسے یہاں لا کر بٹھا دیا گیا ہے؟"

"تم چاہو تو لشکر لے کر فیروز آباد چلے جاؤ۔"

"اور آپ یہاں محبت کا چلہ کھینچیں گے؟"

"تم نہیں جانتے بیگ! میرے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ ظلِ سبحانی انتظار کرتے ہوں گے مگر قدم اس وادی سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔ ہر شام کوچ کا ارادہ کرتا ہوں لیکن ہر صبح یہ سوچ کر ارادہ توڑ لیتا ہوں کہ آخر فیروز آباد جا کر بھی کیا کروں گا۔ کیوں نہ کچھ روز آنکھوں کی پیاس بجھا لوں۔"

"اگر سلطان عالی تک یہ خبر پہنچ گئی تو آپ جانتے ہیں کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا۔ وہ مجھے ولی عہدی سے محروم کر دیں گے۔"

"اور آپ کے نزدیک یہ معمولی سی بات ہے۔"

"تم نہیں جانتے جب شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں تو تاج و تخت بھی محبت کا ایندھن بن جاتے ہیں۔"

رونق بیگ نے حیرت پاش نظروں سے ولی عہد کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا...... ''جان عالم! دکن کا تخت اتنا حقیر نہیں کہ اسے ایک معمولی لڑکی کی محبت کا ایندھن بنا دیا جائے ہزاروں تلواریں اس تخت کی خاطر خون میں ڈوب کر ابھری ہیں ہم نے اپنا لہو دے کر اس کو حاصل کیا ہے اور آپ اسے ایک آنکھ کے اشارے پر قربان کر دینا چاہتے ہیں۔''

''شاید تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔''

''میں جانتا ہوں پرتھال کا حُسن آپ کے ہوش وحواس چھین چکا ہے۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟''

شہزادے کے لہجے میں بیچارگی سی پائی جاتی تھی جیسے محبت کی بساط پر وہ اپنا سب کچھ ہار چکا ہو۔

''یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں...... بس آج کوچ کی تیاری کیجئے، فیروز آباد پہنچ کر آپ کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔''

''لیکن ایک دن تو اور ٹھہر جاؤ۔''

''کیوں...... اس ایک دن میں کیا انقلاب آ جائے گا؟''

''یہی بتانے کے لئے تو میں تمہیں بلانے والا تھا۔''

''کیا کوئی عہد و پیمان باقی رہ گیا ہے؟''

''عہد و پیمان تو سب ہو چکے ہیں۔''

''پھر؟''

ولی عہد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر قریب آ کر اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''بس آج کی رات حُسن عشق کا مہمان ہوگا۔''

یہ سن کر رونق بیگ یوں اچھل پڑا جیسے اُسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ تعجب سے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ میں نے پرتھال کو دعوت دی ہے۔ آج وہ چراغ جلے اسی خیمے میں آئے گی اور میں اس کا میزبان بنوں گا۔''

''معلوم ہوتا ہے آپ سچ مچ دیوانے ہو چکے ہیں۔''

''کیوں...... اس میں دیوانگی کی کون سی بات ہے؟''

''جانِ عالم! پرتھال یہاں آئے گی اور سپاہی وہ راز پالیں گے جسے آپ آج تک چھپاتے رہے ہیں۔ یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ خدا کے لئے اپنی رسوائی کو دعوت نہ دیجئے۔''

''نہیں...... وہ پرتھال بن کر نہیں آئے گی۔''

''تو کیا چھلاوہ بن کر آئے گی؟''

''یہ تمہیں وقت پر معلوم ہو جائے گا۔''

ولی عہد کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور رونق بیگ کی آنکھیں ابھی تک کھلی کی کھلی تھیں جیسے اُس پر جادو پھونک دیا گیا ہو۔ اُس کا خیال تھا شہزادہ پرتھال کو نہیں، مستقبل کے ایک خطرے کو دعوت دے رہا ہے۔

خوبصورت راجکمار

سرِ شام ہی غلاموں نے کافوری شمعیں روشن کر دیں اور عنبر و عود سلگا دیئے۔ وسیع و عریض خیمہ خوب آراستہ تھا۔ جسے ایک بڑے اور دو چھوٹے کمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے تھے۔ دروازوں پر رنگین اطلس کے پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر مستطیل کپڑے آویزاں تھے جن پر مختلف قسم کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کسی تصویر میں ہاتھی کے شکار کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ کسی میں بھالے کی نوک شیر کے سینے میں اتر چکی تھی اور وہ خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا ایک تصویر میں ستار نواز مغنیہ کی لمبی اور پتلی انگلیاں تاروں کو چھو رہی تھیں۔ سامنے چند ہرنیاں کھڑی تھیں جیسے وہ نغمے کی لے سن کر چونک اٹھی ہوں۔

غرض خیمے کو بڑی چابکدستی کے ساتھ۔ ایک آراستہ و پیراستہ ''سفری محلسرا'' میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور بادی النظر میں یہی گمان ہوتا تھا۔ یہ خیمہ نہیں شاہی خواب گاہ کا کوئی حصہ ہے۔ سلطان یا شہزادے جب کبھی سفر پر نکلتے تو یہ سفری ساز و سامان اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔

شہزادہ حسن خاں اور رونق بیگ ایک چوبی شہ نشین پر بیٹھے، جو سرخ رنگ کے دبیز قالین سے مزین تھی شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے۔ میر مغنی نے ایک کونے میں رباب چھیڑ رکھا تھا اور موسیقی کی ہلکی ہلکی لہریں خواب آگیں تصور کی مانند کمرے میں تیر رہی تھیں۔ باہر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ شہزادہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتا تھا اُس کے چہرے سے فرحت زار اضطراب ظاہر تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔ شاید یہ اسی اضطراب کا نتیجہ تھا کہ اس کے دونوں ''فیل'' اور کئی ''پیادے'' رونق بیگ کے ''اسپ'' کی زد میں آکر ٹھکانے لگ چکے تھے۔ دوسری چال میں شہزادہ کا ایک ''رُخ'' پٹنے ہی والا تھا کہ اچانک چوبدار کورنش بجا لایا اور اُس نے خبر دی۔

''کرناٹک کا راجکمار درِ دولت پر حاضر ہے۔ شرف باریابی چاہتا ہے۔''

شہزادے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ''فرزین'' بساط پر پھینک دیا اور مضطرب ہو کر اُٹھا۔ پھر اُس نے حکم دیا۔

''راجکمار کو عزت کے ساتھ پیش کیا جائے۔''

چوبدار پلٹ گیا اور شہزادے کے اشارے پر میر مغنی بھی دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''کرناٹک کا راجکمار؟'' رونق بیگ کے ہونٹ تھرتھرائے اور حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ابھی مزید کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرے ہی لمحہ ایک خوبصورت نوجوان سر پر کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ چست پاجامہ اور ریشمی انگرکھا اوڑھے۔ پگڑی پر کلغی لگائے اور گلے میں بیش قیمت موتیوں کا ہار لٹکائے خیمہ میں داخل ہوا۔ شکل وصورت اور قیمتی ملبوسات سے وہ کسی ریاست کا راجکمار معلوم ہوتا تھا۔ چہرے کے خدوخال اُس کی خوش بختی کی غمازی کر رہے تھے اور اس کی پُر وقار چال سے شاہی رعب و داب برس رہا تھا۔

شہزادہ حسن خاں کو دیکھتے ہی راجکمار نے بڑے احترام کے ساتھ جھک کر کورنش کی رسم ادا کی۔ پھر ادب سے ولی عہد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک جادو آمیز کشش تھی۔ رونق بیگ مسحور نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''شاید مجھے آنے میں دیر نہیں ہوئی۔'' راجکمار کی آواز نے خیمے کا دھڑکتا ہوا سکوت

ڑ دیا۔

"نہیں راجکمار! تم ٹھیک وقت پر آئے ہو۔" شہزادے نے جواب دیا پھر آگے بڑھ کر اس نے راجکمار کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"راجکمار جی! ان سے ملو۔" وہ رونق بیگ کی طرف اشارا کرتے ہوئے بولا۔ "یہ حضرت بہمنی دربار کے خاص مصاحب، سلطانِ معظم کے منظور نگاہ اور میرے بے تکلف دوست رونق بیگ سہ ہزاری ہیں۔"

قبل اس کے کہ راجکمار رونق بیگ کو مخاطب کرتا۔ شاہی رسوم و آداب کے پیش نظر رونق بیگ نے خود ہی جھک کر راجکمار کو سلام کیا۔

"جیتے رہو رونق بیگ!"

شہزادہ حسن کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی..... پھر وہ راجکمار سے مخاطب ہوا۔

"رونق بیگ سے کسی قسم کا پردہ نہیں راجکمار! یہ کھڑکی دار پگڑی اتار دو اور اپنی اصلی شکل دکھاؤ۔"

اس کے جواب میں راجکمار نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے بیگ کی طرف دیکھا پھر پگڑی اتار دی اور اس کے ساتھ ہی لانبی لانبی زلفیں اُس کے شانوں پر بکھر گئیں..... رونق بیگ حیرت پاش نگاہوں سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ پرتھال تھی جو کرناٹکی راجکمار کا روپ بدل کر شہزادہ حسن کی ملاقات کے لئے آئی تھی۔

رونق بیگ نے پہلے پرتھال کی طرف اور پھر شہزادے کی طرف دیکھا اس کی نگاہوں میں ایک ناقابل یقین حیرت کروٹیں لے رہی تھی۔ وہ پرتھال کے مثالی حُسن و جمال کے علاوہ اُس کی جرأت و ہمت پر بھی دم بخود تھا۔

"کیوں رونق بیگ!" شہزادے نے اُس کی حیرانگی کو بھانپ لیا تھا۔

"جانِ عالم! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا..... پریوں اور اپسراؤں کے محض قصے سنے تھے۔ آج میں نے وہ جادو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔"

شہزادہ مسکرا کر رہ گیا اور پرتھال کے رخساروں پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

چوبی شہ نشین کے ساتھ ہی ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ پرلی طرف ایک اور خوبصورت کمرہ آراستہ کیا گیا تھا۔ ملاقات کا کمرہ جہاں فانوس میں مشکبار شمعیں روشن تھیں اور دیواروں کو بہترین تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔ حسن نے پردہ اُٹھایا اور وہ تینوں اُس خواب آگیں کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں اطمینان کے ساتھ گفتگو ہو سکتی تھی۔ چوبدار کو بھی اس کمرے میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔

میر لشکر.....فوج کے سپاہی اور خیمہ کے محافظ صرف اتنا جانتے تھے کہ کرناٹک کا ایک راجکمار ولی عہد سے ملاقات کے لئے آیا ہے اور یہ قیاس کچھ خلاف توقع بھی نہیں تھا کہ یقیناً وہ بیجانگر کے راجہ دیورائے کی طرف سے صلح کا پیغام لے کر آیا ہوگا، جو سلطانی علاقے کی سرحدوں پر اکثر تاخت و تاراج کرتا رہتا ہے لیکن انہیں کیا خبر تھی کرناٹکی راجکمار کا رُوپ دھار کر ولی عہد کے خیمے میں ایک ایسی قیامت داخل ہو چکی ہے جو دکن کی تاریخ کا رُخ موڑ دے گی۔ البتہ یہ بات اُن کے لئے حیران کن تھی کہ راجکمار کے ساتھ کوئی محافظ یا مصاحب کیوں نہیں آیا؟

میر لشکر پہریداروں کو مستعد رہنے کی ہدایت دے کر اپنے خیمے کی طرف چلا گیا وہ خود بھی بڑا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ کیا معلوم شہزادہ اُسے کس وقت خیمہ خاص میں طلب کر لے۔

رونق بیگ ابھی تک حیرت کی لہروں میں بہا جا رہا تھا۔ اُس نے کمرۂ ملاقات کے خوابی ماحول میں ایک مرتبہ پھر پرتھال کو غور سے دیکھا جو کافوری شمعوں کی روشنی میں آکاش کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کی پیشانی پر ایک ایسی چمک تھی جو صرف شاہی خانوادے کی عورتوں کے ماتھے پر دیکھی گئی تھی۔ اس کی رفتار میں فتنے ہی نہیں ایک تمکنت بھی تھی جو شہزادیوں کے لئے مخصوص ہے۔ رونق بیگ سوچنے لگا۔ گاؤں کی ایک الہڑ دوشیزہ۔ ایک معمولی سنار کی لڑکی کیا سچ مچ دکن کی رانی بن جائے گی؟ لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے سنائے گی اور اس کے اشارۂ ابرو پر پورے دکن کی تقدیر رقص کرے گی؟

پرتھال کے ماتھے کی چمک نے اُسے حیرت انگیز حد تک مبہوت کر دیا تھا۔

''رونق بیگ!'' اچانک اس نے ولی عہد کی آواز سنی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

بیگ کو یوں محسوس ہوا جیسے ولی عہد کی آواز بہت دُور سے آئی ہو حالانکہ وہ اس کے

پاس ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''شاید یہ میرے بارے میں پریشان ہیں۔'' پرتھال نے گویا اس کے ذہن میں ابھرتے ہوئے سوالات کو بھانپ لیا تھا۔ رونق بیگ اُس کی فراست کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

''یقیناً میں آپ ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔''

''کیا؟'' شہزادہ اپنا اضطراب نہ چھپا سکا۔

''یہی کہ آپ نے ایک گوہر نایاب، ایک قیمتی ہیرا تلاش کیا ہے۔''

اس تعریف پر شہزادہ کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی اور وہ مشتاق نگاہوں سے پرتھال کی طرف دیکھنے لگا۔

''مگر یہ تو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں یقیناً کوئی اور بات ہوگی۔''

رونق بیگ بوکھلا اُٹھا۔ تو کیا اس ستارزادی کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کیوں پریشان ہوں؟

''اچھا رونق بیگ! کوئی اور بات کیا ہے جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے؟''

''جانِ عالم میں سوچ رہا ہوں۔ کیا سلطان معظم اس حسین ہیرے کو تاج شاہی کی زینت بنانے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ محل سرا کے قوانین تو آپ جانتے ہیں۔'' رونق بیگ نے صاف لفظوں میں اُس اندیشے کا اظہار کر دیا جو آج نہیں تو کل ضرور پیش آنے والا تھا ولی عہد یہ سن کر چونک اُٹھا جیسے یہ بات اس کی مرضی کے خلاف کہی گئی ہو۔ اُس کے چہرے کا رنگ اچانک سرخ ہو گیا۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ برافروختہ ہے۔ ویسے بھی اس وقت جب اس کے دل میں ہزاروں تمنائیں جگنوؤں کی مانند جھلملا رہی تھیں ایسی بدشگونی کی بات مناسب نہ تھی۔ اگر رونق بیگ کی بجائے وہ فقرہ کسی دوسرے کی زبان سے نکلا ہوتا تو اُس کی زبان کھینچ لی جاتی لیکن بیگ اس کا مصاحب ہی نہیں بے تکلف دوست بھی تھا پھر بھی اُس نے شعلہ بار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''شاید تمہارا دماغ پھر گیا ہے رونق بیگ؟''

''نہیں جانِ عالم...... میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے۔''

''تو اس کا یہ مطلب ہے تم اپنی بات پر ضد کرنا چاہتے ہو۔'' ولی عہد کے لہجے میں

خشونت تھی۔

"نہیں...... مجھے صرف پرتھال کا خیال پریشان کر رہا ہے۔"

اچانک پرتھال کی شیریں اور مترنم آواز سنائی دی......"لیکن میں محل میں رانی بن کر نہیں ......صرف جانِ عالم کی داسی بن کر رہنا چاہتی ہوں۔"

اس فقرے میں سادگی تھی اور خلوص کی مٹھاس، رونق بیگ بے حد متاثر ہوا پھر وہ کہنے لگا۔

"میں کوشش کروں گا۔ شاہی محل میں تمہیں پورے اختیارات مل سکیں۔"

بیگ نے یہ فیصلہ کرنے میں یقیناً کوئی غلطی نہیں کی تھی...... کہ وہ شہزادی بے شک نہیں مگر ایک شہزادے کی محبوبہ کہلانے کی ضرور حقدار ہے۔ غیر معمولی حُسن و جمال کے علاوہ قدرت نے اُسے شیریں بیانی بھی عطا کی تھی۔ وہ گفتگو کرنے کے آداب بھی جانتی تھی۔

"مگر تمہیں ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔" بیگ پرتھال سے مخاطب تھا۔ "اگر محل میں تمہیں اختیارات مل گئے تو اُن کا استعمال کہیں مجھی پر شروع نہ کر دینا۔"

اس کے جواب میں پرتھال کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ناچ اُٹھی۔

حسن کا وہ تمام غصہ اُتر چکا تھا جو چند لمحے پہلے سمندری جھاگ کی طرح اچانک نمودار ہوا تھا۔ اب اُس کے چہرے پر ایک بشاشت تھی۔

"دیکھا......" وہ پرتھال کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "میں نے نہیں کہا تھا بیگ ایک دلچسپ آدمی ہے وہ ہر جگہ تمہارا خیال رکھے گا۔"

"ہر جگہ کا کیا مطلب...... میں صرف شاہی محل کا ذمہ دار ہوں۔"

شاہی محل سرا میں رونق بیگ کو جو مقام حاصل تھا۔ اُسے شہزادہ بھی خوب جانتا تھا سلطان کے اعتماد کی وجہ سے محل کے کسی شخص کو اُس کے حکم سے مجالِ انکار نہ تھی حتیٰ کہ بعض اوقات بیگمات بھی اُس کی سفارش کا سہارا ڈھونڈا کرتی تھیں۔ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی تو اُسے دیکھتے ہی سٹی گم ہو جاتی تھی اگرچہ سازشوں کے جال تو بچھے ہی جاتے تھے مگر رونق بیگ سے کوئی بات چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ کنیزیں ڈر کے مارے خود ہی اُس کے سامنے سارا راز اُگل دیتی تھیں حتیٰ کہ سردار خواجہ سرا مہر زریں بھی اُسی سے خوف کھاتی تھی جس کی

محلات پر حکومت تھی۔

"میرا خیال ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ صبح کوچ کی تیاری کرنی ہے۔ آج رات میں شہباز خاں کے ساتھ شطرنج کھیلوں گا۔"

رونق بیگ دروازے کی طرف مڑا۔

"مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ یاد رہے گا نا آپ کو؟" پرتھال کی آواز سن کر وہ رُک گیا۔

لڑکی! رونق بیگ وعدہ کرتا ہے تو یاد بھی رکھتا ہے۔ یاد ہی نہیں رکھتا اُسے پورا بھی کرتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چپ چاپ باہر نکل گیا۔ پرتھال اور شہزادہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر یکلخت حسن نے مڑ کر پرتھال کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور خیمے کا سکوت سرگوشیاں کرنے لگا۔

رُخصت

آدھی رات کا زرد چاند افق کے حاشیے پر ایک آتشیں گولے کی طرح اُبھر رہا تھا۔ جب شاہی خیمہ کو حرکت ہوئی اور نیزہ بردار محافظ سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ دوسرے لمحے شہزادہ حسن اور کرناٹکی راجکمار دروازے پر نمودار ہوئے جنہیں دیکھتے ہی محافظ سرنگوں ہو گئے...... پرے ایک سپاہی سفید گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا تھا یہ اس امر کی علامت تھی کہ راجکمار رخصت ہوا چاہتا ہے۔

لشکر گاہ میں الاؤ سرد پڑ چکے تھے۔ صرف ولی عہد کے خیمہ کے سامنے ایک مشعل روشن تھی پہرے داروں کے علاوہ شاید تمام سپاہی سو گئے تھے .... لشکر گاہ سے نہ تو اُن کے مخصوص قہقہے سنائی دے رہے تھے اور نہ ہی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ تھی بلکہ چاروں طرف ایک گہرا سناٹا ہونک رہا تھا اور کبھی کبھار کوئی گھوڑا ہنہنا کر اس سکوت کو توڑ دیتا تھا۔

دُور تک پھیلی ہوئی فوجی چھولداریاں چاند کی زرد روشنی میں نہا گئی تھیں جیسے ان پر شعلوں کا عکس تیر رہا ہو۔

خیمہ سے باہر آتے ہی ولی عہد نے حکم دیا۔

"رونق بیگ کو بلاؤ۔"

ایک محافظ چیتے ایسی پھرتی کے ساتھ بھاگا اور چھولداریوں میں غائب ہو گیا...... پھر

تھوڑی دیر کے بعد رونق بیگ آتا دکھائی دیا۔ اُس نے کمر میں تلوار باندھ رکھی تھی۔ اور اُس کے قدم ایک فوجی کی مانند بڑی مستعدی کے ساتھ اُٹھ رہے تھے۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ اس وقت اچانک بلاوے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے جب وہ قریب آیا تو شہزادے نے کہا۔

"رونق بیگ! تم راجکمار کو چھوڑنے جاؤ گے۔"

"کیا راجکمار ایک رات بھی نہیں ٹھہریں گے؟" بیگ کے لہجے میں ایک لطیف طنز تھی۔

"نہیں...... سرحد پر ان کا انتظار ہو رہا ہے۔" پھر شہزادے نے آگے جھک کر سرگوشی کے انداز میں...... "اور یہ سرحد گاؤں کا پنگھٹ ہے۔ بس تمہیں وہیں تک ساتھ جانا ہوگا۔ سمجھ گئے نا؟"

رونق بیگ نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔

پھر راجکمار لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ شہزادہ اور بیگ نے اُسے حیرت سے دیکھا...... "تو کیا وہ ایک عمدہ شہسوار بھی ہے؟" دونوں کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی سوال اُبھرا اگرچہ شاہی خاندان کی عورتوں کو فنِ شہسواری کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی لیکن یہ چستی تو انہیں کسی شہزادی میں بھی نظر نہ آسکی تھی۔

راجکمار نے سر کے اشارے سے ولی عہد کو رخصتی سلام کیا اور گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ رونق بیگ بھی رکاب میں پاؤں ڈال چکا تھا۔ گھوڑا بڑھا کر وہ بھی پرتھال کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ شہزادہ بدستور کھڑا رہا۔ چاند کی روشنی میں اُن کے دور ہوتے ہوئے سائے بتدریج دھندلائے جا رہے تھے حتیٰ کہ سفید دھبوں میں منتقل ہو کر وہ فضا میں گھل مل سے گئے اور شہزادہ ایک گہرا سانس لے کر خیمے کی طرف بڑھا۔

پہرے داروں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت میں ایک عجیب سی بے قراری پائی جاتی ہے۔ وہ یوں قدم اٹھا رہا ہے جیسے اس کا دماغ ساتھ نہ دے رہا ہو پھر کرنا تک کے راجکمار کی اچانک آمد اور یکا یک روانگی کا معمہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ انہوں نے سوچا ممکن ہے راجکمار کی آمد ہی ولی عہد کے لیے کسی نئی پریشانی کا باعث بن گئی ہو لیکن وہ پریشانی کیا ہو سکتی ہے۔ کہیں راجہ دیوراے نے صلح کی کوئی ایسی شرط تو پیش نہیں کر دی جسے

پورا نہ کیا جاسکے؟

پہرے داروں کے دماغ ابھی تک راجکماری کے اردگرد گھوم رہے تھے دروازہ کے قریب پہنچ کر شہزادہ ایک دم پلٹا اور بولا۔

''جب رونق بیگ واپس آئے اُسے ہمارے پاس بھیج دو۔'' پھر وہ خیمے کے اندر غائب ہو گیا۔



چلتے چلتے اچانک پرتھال کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

''رونق بیگ! تم ولی عہد کے سامنے ایک خطرے کا اظہار کرتے کرتے رہ گئے تھے۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں اگر سلطانِ عالی نے محل سرا میں میرا داخلہ پسند نہ کیا تو کیا ہو گا؟''

بیگ کے لئے یہ سوال یقیناً غیر متوقع تھا۔اُس نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے سلطان معظم ایسا نہیں کریں گے۔انہیں جانِ عالم سے محبت ہے اور وہ شہزادے کی کسی بات کا انکار نہیں کرتے۔''

''لیکن راج دربار کی مصلحتیں اس محبت کے آڑے بھی آسکتی ہیں۔''

''اس صورت میں شہزادے کا فیصلہ اٹل ہو گا۔''

''کیا فیصلہ؟'' پرتھال کا سوال ایک نامعلوم تشویش سے بوجھل ہو رہا تھا۔

''ولی عہد سوچنے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے اور فیصلہ کر لینے کے بعد دنیا کی کوئی طاقت اُنہیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔''

''میں جانتی ہوں۔ وہ اپنی بات کے دھنی ہیں۔ اسی لئے ڈرتی ہوں میرا پیار اُنہیں کسی امتحان میں نہ ڈال دے۔''

''محبت کرنے والے امتحان سے نہیں ڈرا کرتے پرتھال!''

''لیکن میں نہیں چاہتی وہ میرے لئے کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔''

''اگر آدمی خود دعوت نہ دے تو مصیبت اپنے پاؤں سے چل کر نہیں آیا کرتی۔''

ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد پرتھال پھر کہنے لگی۔

''میں نہیں جانتی وہ کون سی کشش تھی جو بے اختیار مجھے ولی عہد کی طرف کھینچ کر لے

گئی اور میں نے اُنہیں من مندر کا دیوتا بنالیا۔ اب میرے سانس کا رشتہ اُن کے جیون کے
ساتھ بندھا ہوا ہے۔"

"آدمی پیار کے بندھن میں پھنس جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے لیکن فکر نہ کرو۔ اگر
تمہاری محبت سچی ہے تو تم ولی عہد کو پالو گی۔"

"سچ رونق بیگ!"

"ہاں..... میں غلط نہیں کہتا۔"

"مگر نہ جانے کیوں میرا دل کسی آنے والے خطرے کے ڈر سے دھڑک رہا ہے
میرے ذہن پر خوف کی پرچھائیاں سی رینگنے لگی ہیں۔"

پرتھال کی آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ ڈوبے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ "دل بے سبب نہیں
دھڑکا کرتے رونق بیگ! کہیں میری وجہ سے جانِ عالم پر کوئی مصیبت نہ ٹوٹ پڑے۔ مجھ
غریب کا ہاتھ پکڑ کر وہ راج دربار کی نظروں میں گر نہ جائیں۔"

"پرتھال!"

"تو پھر میرے وسوسے خوف کا رُوپ کیوں دھار رہے ہیں؟"

تمہیں اس قسم کی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔" رونق بیگ کے لہجے میں سرزنش
تھی۔

"جانِ عالم شہزادہ ہی نہیں ولی عہد سلطنت بھی ہیں جن کی زندگی کے ساتھ راج
دربار کی تقدیر وابستہ ہے۔ وہ دکن کے ہونے والے بادشاہ ہیں اور بہمنی آئین کی رو سے
سلطانِ معظم کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے جواب دہ نہیں۔"

پرتھال گھوڑے کی پیٹھ پر کانپ سی گئی۔ اُس نے بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"مجھے شما کرو رونق بیگ! میں بہک گئی تھی۔ ایک بھیانک خطرے کے تصور نے
میرے ہوش و حواس چھین لئے تھے لیکن تم نہیں جانتے جب ہندو عورت کسی سے پیار کرنے
لگتی ہے تو اپنے آپ کو بھول جاتی ہے۔ محبوب کو لو کا جھونکا بھی چھو جائے تو اُس کے دل پر
انگارے لوٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ تو جانِ عالم ہیں۔ دکن کے ولی عہد۔"

رونق بیگ کو محسوس ہوا جذبات کی شدت سے اُس کی آنکھیں نم آلود ہو گئی ہیں
کیونکہ چاند کی روشنی میں وہ پہلے سے زیادہ چمک رہی تھیں۔ محبت کا اظہار اُس کے خلوص

دل کی ترجمانی کر رہا تھا۔ بیگ سمجھ گیا شہزادے کی خاطر وہ اپنی جان پر کھیل جانے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ وہ تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

"تم نے اپنی ڈور ایک ولی عہد کے دل کے ساتھ باندھی ہے۔ کسی معمولی آدمی کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ اب حوصلہ رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔ میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

پرتھال کو یوں لگا جیسے رونق بیگ نے اُس کے زخموں پر مرہم رکھ دی ہو۔

"میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی بیگ!"

چاند افق سے اُبھر کر ندی کنارے درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہا تھا اس کی زرد رنگت اب دودھیا روشنی میں تبدیل ہو چکی تھی جیسے کائنات کو نقرئی غبار کی مہین سی چادر اوڑھا دی گئی ہو۔ اس چاندنی رات میں اُن کے گھوڑے خاموش اور خوابیدہ فضا کے سینے میں آہٹیں بیدار کرتے ہوئے چلتے جا رہے تھے۔

گاؤں صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا جس کی کچی عمارتیں چاندنی کے غبار میں ملفوف تھیں۔ پنگھٹ سامنے ہی نظر آ رہا تھا جس کے پاس ایک نیم شکستہ عمارت میں مٹی کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ یکلخت رونق بیگ نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ شکستہ عمارت کے دروازے پر ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ اس سائے کی طرف دیکھ کر پرتھال کہنے لگی۔

"گوری ابھی تک میری راہ دیکھ رہی ہے۔"

"کون گوری؟"

"گاؤں کے مکھیا کی لڑکی ہے۔ میری سہیلی! میں اُسے یہیں چھوڑ گئی تھی۔"

رونق بیگ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تو گوری کو تم نے اپنا ہمراز بنا لیا ہے۔"

"تم بھی تو جانِ عالم کے راز دار ہو۔"

"مجھے اب واپس چلنا چاہیے۔" بیگ نے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے کہا۔ "تمہاری منزل آ گئی ہے۔"

"اپنی منزل تو میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں بیگ!" اُس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

"کل سویرے ہم فیروز آباد روانہ ہو جائیں گے۔"

"جانِ عالم سے کہنا مجھے بھول نہ جائیں۔"

"وہ بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں گے۔ اچھا خدا حافظ۔"

پھر رونق بیگ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سرپٹ ہو لیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ڈھول کے مرغولوں میں غائب ہو چکا تھا۔ پرتھال چند لمحے کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر اس نے گھوڑے کا رُخ شکستہ عمارت کی طرف موڑ لیا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا آسمان کی مغربی سمت ستارہ مشتری بڑی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔



2

حسن کا شکاری

بیجانگر میں

پنڈت گورکھ ناتھ راگ ودّیا ہی کا ماہر نہیں تھا اس کے علم و فضل اور دھرم گیان کی شہرت سارے کرناٹک میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بیجانگر کے آشرم کا مہاپروہت تھا جہاں ایک سو دیوداسیاں اس کے علم و ہنر سے کسب فیض کرتی تھیں۔ اور جو خوش نصیب کنواریاں اس کی نگاہِ کرم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ انہیں بیجانگر کے شاہی رنواس میں داخلہ مل جاتا جہاں وہ مہاراج دیورائے کی حسین خلوتوں کی رونق بنتیں اسی لئے بوڑھا برہمن بیجانگر کے راج دربار میں خاص مقام رکھتا تھا۔ بلکہ مہاراج کے بعد صرف گورکھ ناتھ ہی ایک ایسا آدمی تھا جو راج رنواس میں جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا بلا روک ٹوک آ جا سکتا تھا۔ کاشی کی یاترا کے بعد جب وہ بنارس سے لوٹا تو بیجانگر میں بڑی بیتابی کے ساتھ اس کا انتظار کیا جاتا رہا۔ پورن ماشی کی رات آشرم کی دو کنواریوں کو رنواس میں داخلہ لینا تھا جس کے لئے پنڈت گورکھ ناتھ کی حاضری ضروری تھی کیونکہ اس کے حکم یا اجازت کے بغیر کوئی دیوداسی رنواس میں نہیں جا سکتی تھی۔ راج محل میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور قاصد مہاراج دیورائے کو اطلاعات پہنچا رہے تھے کہ مہاپروہت برہمنی سلطنت کے راستے جگہ جگہ لوگوں کو اشیرواد دیتا اور نگر نگر میں پڑاؤ کرتا ہوا بیجانگر کی طرف چلا آ رہا ہے لیکن جونہی وہ مدگل کے علاقہ میں پہنچا اس کا پڑاؤ طویل ہونے لگا۔ حتیٰ کہ پورنماشی کی رات آئی اور گزر گئی۔ آشرم کی دیوداسیاں راج رنواس میں داخلہ نہ لے سکیں۔ راجہ دیورائے اپنی

خلوتوں میں نئے ستارے روشن نہ کر سکا اس نے جوش غضب میں پھنکارتے ہوئے راج منتری کو حکم دیا کہ پنڈت گورکھ ناتھ کو حاضر کیا جائے لیکن گورکھ ناتھ بیجانگر میں نہیں تھا کرناٹک میں نہیں تھا بلکہ کہیں دور دکن کی ایک پُر بہار وادی میں لکھپت سنار کی لڑکی پرتھال کو سنگیت وِدّیا سکھا رہا تھا بوڑھا برہمن بیجانگر کو بھول گیا تھا۔ آشرم اور اس کی دیوداسیاں پرتھال کے حسنِ جہاں سوز کے سامنے جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ مہاراج دیوراے کا غضبناک اور خشونت بار چہرہ بار بار گورکھ ناتھ کے تصور میں ابھرتا لیکن وہ سر جھٹک کر کسی دوسری طرف متوجہ ہو جاتا وہ اپنے دماغ سے بیجانگر کی ہر یاد محو کر دینا چاہتا تھا اس وقت تک جب تک پرتھال کی سنگیت وِدّیا پوری نہیں ہو جاتی اور اب پورے ایک سال بعد پنڈت گورکھ ناتھ کی سواری بیجانگر کی طرف جا رہی تھی۔ بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی کانسی کی گھنٹیاں مہا پروہت کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں بیجانگر کے سوئے ہوئے راستے جاگ اٹھے تھے اور سینکڑوں پنڈت اور پروہت گورو دیو کا سواگت کرنے کے لئے شہر سے باہر نکل آئے تھے۔

دور غروب ہوتے ہوئے سورج کی بنفشی شعاعوں میں جب اسے اپنے آشرم کے سنہری کلس چمکتے ہوئے دکھائی دیئے تو اس کے بوڑھے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اسے آشرم سے کتنا پیار تھا پھر کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں تھی کہ اس نے ایک سال کی طویل مدت اپنے دیس سے باہر ایک دوسری سلطنت میں گزار دی تھی لیکن پنڈت گورکھ ناتھ کا کوئی کام حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

بیل گاڑی ایک موڑ پر روک دی گئی سامنے پنڈت اور پروہت قطار در قطار کھڑے تھے اور ان کے درمیان آشرم کی حسین دیوداسیاں اپنے گرو کا سواگت کرنے اور اشیرواد حاصل کرنے کے لئے موجود تھیں جونہی پنڈت گورکھ ناتھ نے بیل گاڑی کے جھروکے سے نکل کر درشن دیئے فضا میں سنکھ بجنے لگے اور تمام لوگ ہاتھ باندھ کر سرنگوں ہو گئے پھر برہمن مہاراج نے ہاتھ اٹھا کر انہیں آشیرواد دی وہ یہ دیکھ کر کسی قدر حیران ہوا کہ بیجانگر کے مندروں اور آشرم کے پنڈت پروہتوں کے علاوہ راج دربار کا کوئی آدمی اس کے سواگت کو نہیں آیا حالانکہ اس کی آؤ بھگت کے لئے سرکاری آدمیوں کا پیشوائی کے لئے آنا ضروری تھا۔

"تو کیا مہاراج دیو راۓ اس کے مذہبی تقدس کو بھول چکا ہے؟"

دیوداسیوں نے دوڑ کر بیل گاڑی کو گھیر لیا پھر پنڈت اور پروہت آگے بڑھے اور ں نے گورو دیو کے قدم چھو لئے گورکھ ناتھ نے ایک بڈھے پروہت کی طرف انگلی ی۔

"گوردھن...... مہاراج کس حال میں ہیں؟"

یہ سوال اس بات کا اشارہ تھا کہ راج رتو اس کی حالت کیسی ہے اور تمہارا گورو دیو ں مہاراج کے ذہن سے اُتر تو نہیں گیا؟

گوردھن نے پنڈت گورکھ ناتھ کا سوال سمجھ لیا تھا لیکن موقع کی نزاکت کے پیش نظر ں نے مختصر سا جواب دیا۔

"مہاراج کی طبیعت ٹھیک نہیں گورو دیو! جب سے آپ کاشی کی یاترا پر گئے ہیں وہ اداس رہتے ہیں اور کئی کئی روز رتو اس سے باہر نہیں نکلتے۔"

یہ جواب سن کر بوڑھا ایک گہری فکر میں ڈوب گیا ایک لمحہ کے بعد اس نے گویا حکم تے ہوئے کہا۔

"مجھے آج ہی آشرم میں ملو گوردھن! میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جو آگیا مہاراج!"

پھر پنڈت گورکھ ناتھ کی سواری آگے بڑھی سنکھ پھونکے گئے۔ اور کانسی کی گھنٹیوں کا بیجانگر کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔

ت کا امرت

آشرم کی دوسری منزل پر ایک وسیع اور خوبصورت کمرے میں پروہت گوردھن پنڈت رکھ ناتھ کے سامنے کھڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں فانوس روشن تھے جن کی زرد روشنی میں ردھن کے سر کی چندیا چمک رہی تھی اور وہ بالکل ایک کچھوے کی طرح دبک سا گیا تھا ے وہ کسی اہم بات کا انکشاف کرتے ہوئے خوف محسوس کر رہا ہو۔

"پھر کیا ہوا؟"

گورو گورکھ ناتھ نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"پھر......" گوردھن کے ہونٹ تھرتھرائے اور پھر پورنماشی کی رات ہم پر قیامت
گئی۔ مہاراج کا حکم تھا۔ شکنتلا اور دوشی کو عروسی کا جوڑا پہنایا جائے، اور معمولی رسوم ا
کرنے کے بعد انہیں راج رتواس میں داخل کیا جائے۔ یہ حکم سن کر ہم کانپ اُٹھے۔
راج منتری خود مہاراج کا سندیس لے کر آئے تھے، ان کے ساتھ نیزہ بردار سپا
بھی تھے جب وہ آشرم میں داخل ہوئے۔ دیوداسیاں ڈر کے مارے اپنے کمروں میں گھس
گئیں، اور انہوں نے اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں، شکنتلا اور دوشی میرے کمرے میں موجو
تھیں لیکن نہ انہوں نے سر کے بال کھولے نہ چندن ڈالا نہ جسم پر ابٹن ڈالا نہ دودھ م
نہائیں نہ ماتھے پر بندیا لگائی، نہ مانگ میں سیندور بھرا، وہ عام لباس میں اپنے روزمرہ کے
کام کرتی رہیں جیسے کوئی بھی غیر معمولی بات ظہور میں نہیں آ رہی تھی۔ راج منتری نے ا
کے سامنے مہاراج کا حکم سنایا۔ آج پورنماشی کی رات ہے اور دستور کے مطابق
دیوداسیاں راج محل میں داخل ہوں گی انہوں نے شکنتلا اور دوشی کو حکم دیا کہ فوراً تیار
جائیں اور شاہی جوڑے زیب تن کر لیں جنہیں راج منتری اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔
میں نے جواب دیا۔" گوردھن کہہ رہا تھا" گورو دیو کی آگیا کے بغیر کچھ نہیں ہو
اور وہ ابھی تک کاشی کی یاترا سے نہیں لوٹے، مہاراج کو اس وقت تک انتظار کرنا چا
جب تک وہ واپس نہیں آ جاتے۔"

یہ جواب سن کر راج منتری باؤلے کتے کی طرح چلایا۔
"نہیں مہاراج کا حکم پورا ہوگا آج کی رات وہ شکنتلا اور دوشی کے ساتھ گزار
گے۔" پھر گوردھن سانس درست کرنے کے لئے رک گیا اس کی گھبرائی ہوئی آواز
معلوم ہوتا تھا وہ کوئی بہت بڑا کشٹ کاٹ چکا ہے۔
"پھر کیا ہوا؟"
گرو گورکھ ناتھ کا اضطراب بڑھ گیا وہ چاہتا تھا اسے واقعہ کی تفصیل فوراً معلوم
جائے گوردھن کہنے لگا۔
"مجھے خطرہ تھا۔ اگر میں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو میرا سر قلم کر دیا جائے گا۔"
"تو کیا تم راج منتری کا حکم ماننے پر تیار ہو گئے؟" گورکھ ناتھ کی آنکھوں سے
برسنے لگے۔

"نہیں گورودیو! میں نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔"

"پھر کیا کیا تم نے؟"

"میں راج منتری کے قدموں میں لیٹ گیا۔ گورودیو! میں نے عرض کی۔ اگر آشرم کے دستور کی خلاف ورزی کی گئی تو دھرم کا اپمان ہوگا بیجانگر میں ایسا اندھیرا کبھی نہیں ہوا۔ کر مہا پروہت کی آگیا کے بغیر کوئی دیوداسی راج رنواس میں داخل کر دی گئی ہو لیکن راج منتری ہر قیمت پر حکم کی تعمیل چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔

"مہاراج کا حکم نہیں ٹل سکتا۔ راج دربار کی طرف سے پنڈت گورکھ ناتھ کی جگہ گوردھن کو مہا پروہت مقرر کیا جاتا ہے۔"

یہ بات سن کر دوشی اور شکنتلا دونوں غصہ سے کانپنے لگیں۔ دوشی تھرتھراتی آواز میں بولی۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"خاموش رہو لڑکی!" راج منتری چلایا۔ "تم نہیں جانتیں مہاراج کا فیصلہ اٹل ہے۔"

"فیصلے تبدیل بھی ہو جاتے ہیں منتری جی!"

"نہیں ہواؤں کا رخ بدل سکتا ہے مہاراج دیورائے کے فیصلے تبدیل نہیں ہو سکتے۔"

دوشی بڑے اطمینان کے ساتھ بولی۔ "مگر پورنماشی کی اس رات انہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" راج منتری کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

"مطلب یہی کہ میں راج رنواس میں داخل ہونے سے انکار کرتی ہوں۔"

"دوشی!" راج منتری کی گرجتی ہوئی آواز سے سارا آشرم گونج اٹھا۔ اس نے غضب آلود نگاہوں سے دوشی کو دیکھا جیسے ابھی اس کی موت کا حکم صادر کر دیا جائے گا لیکن نہ جانے دوشی کی آتما میں کہاں سے اتنی شکتی آگئی تھی وہ راج منتری کی آواز سے خوفزدہ نہیں تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

"جانتی ہو انکار کی سزا کیا ہوگی؟"

"تم مجھے موت سے زیادہ کوئی سزا نہیں سکتے۔" دوشی نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "مہاراج میرے جسم کی بوٹیاں ضر سکتے ہیں۔ لیکن میری آتما پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔"

یہ جواب راج منتری کو مشتعل کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس کے حکم پر دوشی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے مہاراج کا حکم ہی ماننے سے انکار نہیں کیا تھا ان کے رتبے کی توہین بھی کی تھی۔ راج منتری بھوکے بھیڑیے کی طرح آشرم میں غراتا رہا۔

''کیا کوئی دیوداسی اتنی گستاخ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ مہاراج دیورائے کے رنواس میں داخل ہونے سے انکار کر دے۔''

راج منتری بھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے مہاراج کی ناراضگی کا خوف نہ ہوتا تو وہ دوشی کی آنکھیں نکلوا دینے سے بھی گریز نہ کرتا لیکن وہ جانتا تھا۔ دوشی آشرم کی تمام دیوداسیوں سے زیادہ سندر اور چنچل ہے پھر ناچ سنگیت میں بھی کوئی کنواری اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لئے تو مہاراجہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ سپاہی جب دوشی کو گرفتار کر کے راج محل کی طرف لے چلے تو آشرم پر ایک قیامت بیت گئی۔ جانے سے پہلے دوشی نے کہا۔

''آج رات میں امرت پیوں گی۔ کل میری چتا کو پھولوں سے سجانا۔''

یہ فقرہ ادا کرتے وقت گوردھن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پنڈت گورکھ ناتھ کا رنگ بھی زرد ہو گیا تھا اور اس کے بوڑھے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔

''کیا دوشی پھر واپس آئی؟''

''نہیں گورو دیو! اس نے پورنماشی کی رات موت کا امرت پی لیا تھا۔ دوسری صبح راج محل سے اس کی ارتھی اٹھائی گئی تھی۔ موت کا جوا کھیل کر اس نے مہاراج دیورائے کا فیصلہ تبدیل کر دیا تھا۔''

یہ سنتے ہی پنڈت گورکھ ناتھ زخمی پرندے کی طرح تڑپ اٹھا۔

''تو کیا دوشی مر گئی؟''

''وہ مہاراج پر بھینٹ ہو گئی گورو دیو۔''

پروہت گوردھن یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ پنڈت گورکھ ناتھ کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے فانوس کی روشنی میں اس کا چہرہ ایک روحانی کرب کا منظر پیش کر رہا تھا اور اس کے بوڑھے بدن پر ایک ہلکی سی لرزش طاری ہو چکی تھی۔ گوردھن نے یہ حالت دیکھی تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

''تم دوشی کی حفاظت نہ کر سکے گوردھن؟''

گورکھ ناتھ کی آواز بھرا گئی اور وہ منہ موڑ کر سامنے وشنو کی مورتی کو دیکھنے لگا پھر
ے کی غمگین فضا میں اس کی بھیگی ہوئی آواز تیرنے لگی۔

''دوشی میری آتما تھی۔ میرے جیون کی آخری پونجی۔ جسے تم نے میرے بعد لٹا دیا۔''

''گورو دیو! میں شرمندہ ہوں۔ میں دوشی کو نہ بچا سکا۔''

بوڑھا پروہت انتہائی دُکھ بھرے لہجے میں بولا۔''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بیجانگر میں
ں دنیا لٹنے والی ہے تو میں راستے میں نہ ٹھہرتا۔ میرے علاوہ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کہ
ں میری بیٹی تھی۔ میرے کلیجے کا ٹکڑا جسے میں نے دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر پرورش کیا
''

''گورو دیو!'' گوردھن بھاگ کر بوڑھے گورکھ ناتھ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

''آپ نے دوشی کے متعلق پہلے تو کبھی نہیں بتایا تھا۔''

''کوئی باپ اپنے پاپ کا اظہار نہیں کرتا گوردھن! میں نے یہ بھید اپنے سینے میں
انے کی کوشش کی تھی۔'' بوڑھے پروہت کی آواز جیسے حلق میں اٹکنے لگی۔

''میری اور دوشی کی ماں شیلی کی کہانی بہت لمبی اور دکھ بھری ہے جب وہ مرنے لگی تو
نے اُسے قول دیا تھا۔ دوشی کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ اسے اپنے ہاتھ سے
ن بناؤں گا۔ لیکن......''

گورکھ ناتھ کی آواز ڈوب گئی۔ اچانک وہ نہایت تیزی کے ساتھ پلٹا اور کہنے لگا۔

''گوردھن! مہاراج دیورائے کو دوشی کی موت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میری آتما کو
ن کرکے وہ راج محل میں آرام کی نیند نہیں سو سکتا۔

پھر اس نے گوردھن کو شانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ں دیں'' یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں گورو دیو!''

گوردھن نے دیکھا گورکھ ناتھ کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے اور اب ان کی
ایک ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ جو کسی چیتے کی آنکھ میں شکار دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اس
چہرے کا کرب ایک خوفناک عزم وارادہ میں تبدیل ہو چکا تھا اور وہ تصور کی آنکھ سے

بیجانگر کے راج محل کو شعلوں کی نذر ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"میری بیٹی نے موت کا امرت پیا ہے گوردھن! اب بھی پیالہ مہاراج دیوراے او

اس کی بیٹی چندر کلا کو پینا پڑے گا۔"

گورکھ ناتھ کے لہجے میں جیسے شعلے لپک رہے تھے اس نے ایک لمحہ رُک کر کہا۔

"میں مدگل میں اس کی موت کا سامان تیار کر آیا ہوں۔"

"سیوک آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا مہاراج!"

"ایک سال تک میں نے لکھپت ستار کی بیٹی پرتھال کو سنگیت ودیا سکھائی ہے اس کی

آواز میں جادو ہے اور حسن میں بلا کی کشش میں چاہتا ہوں۔ بیجانگر میں پرتھال کی سند

اور مدھر گیتوں کا چرچا پھیل جائے۔"

"مگر پرتھال کے چرچے سے دوشی کے انتقام کی پیاس کیوں کر بجھ سکے گی؟"

"پرتھال کا حسن دیوراے کی موت کا پیغام بن سکتا ہے وہ اس ظالم سے میری بیٹی

کے خون کا انتقام لے سکتی ہے۔"

"تو یہ کون سی بڑی بات ہے پرتھال کے حسن کا چرچا آج ہی سے شروع ہو جا

گا۔" گوردھن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر پنڈت گورکھ ناتھ کے ساتھ آشرم کے ایک

اندھیرے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ جہاں چھت کے ساتھ کانسی کی گھنٹیاں لٹک رہی تھیں۔

پرتھال.....ایک کہانی

بیجانگر کے آشرم ہی میں نہیں بازاروں اور گلیوں میں بھی لوگ پرتھال کے حسن

جمال کی داستانیں بیان کرنے لگے تھے، ہر شخص کی زبان پر اس کے ان دیکھے حسن

کہانی..... ہر لب پر ان کے گیتوں کی تعریف تھی۔

دیوداسیاں آشرم میں آنے والی ہر لڑکی اور ہر عورت کے ساتھ پرتھال کے قصے

چھیڑتیں۔ داستان گو مہنت اور پروہت بڑے دلکش پیرایہ میں اس کے سحر انگیز نغموں،

بھری آواز اور آکاش کی اپسراؤں کو شرما دینے والے سندر روپ کا ذکر چھیڑتے، سننے وا

دل تھام کر رہ جاتے اور ان کے دل میں یہ آرزو کروٹیں لینے لگتی۔ کاش! وہ ایک نظر حسن

اس دیوی۔ گیتوں کی رانی کو دیکھ ہی سکتے مگر پرتھال کرناٹک سے دور دکن کے دیس

رہتی تھی، ایک دوسری قلمرو میں جہاں مہاراج دیورائے نہیں بلکہ فیروز شاہ بہمنی حکمران تھا۔

گورد ھن نے پرتھال کی تعریف میں ایک کویتا بھی لکھی تھی جو جنگل کی آگ کی مانند بیجانگر میں پھیلنے لگی۔ لوگ اس کویتا کو سنتے اور دل تھام کر رہ جاتے۔

حسن و جمال کے پرستار اور سنگیت کے شیدائی پنڈت گورکھ ناتھ کے دروازے پر آنے لگے۔ وہ بوڑھے پروہت کی زبان سے پرتھال کے نغمہ نواز حُسن کی داستان سننے کے لئے بے تابی کا اظہار کر رہے تھے، وہ اس کی راگ ودیا کا گرو تھا اور اس نے طلوع وغروب کے رنگین سموں میں اسے سُر سنگیت سے بہرہ ور کیا تھا۔ چاندنی راتوں اور برسات کی جھڑیوں میں اسے دل میں اُتر جانے والی راگنیاں سکھائی تھیں جب وہ اپنے گورو دیو کے چرن چھوتی اور ستار لے کر بیٹھتی تو کائنات کی نبضیں رُک جاتی تھیں۔ پرندے اپنی اڑانیں بھول جاتے تھے بہتی ہوئی ندیاں خود بخود گنگنانے لگتی تھیں اور فضا میں سحر آلود گیت بکھر جاتے تھے۔

حُسن خود ایک جادو ہے لیکن جب وہ سنگیت کے رُوپ میں ڈھل جائے تو قیامت سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ بیجانگر کے لوگوں کے لئے پرتھال بھی ایک قیامت بن چکی تھی۔ ایک ان دیکھی ان جانی قیامت، گیت کی وہ لے جو عالم خواب میں ایک سندر روپ دھار کر ذہن کے غرفوں اور دل کے دالانوں میں گھومتی ہے جادو کی وہ پراسرار دیوی جو پلک جھپکنے میں عدم سے وجود میں آتی اور ہوش وحواس لوٹ کر خوابی دھندلکوں میں غائب ہو جاتی ہے لوگ اسے سپنوں میں دیکھتے اور اپنے سپنے دوسروں کو سناتے۔

پرتھال کا وجود دکن میں تھا لیکن اس کی روح بیجانگر کے شبستانوں میں بھٹک رہی تھی۔ ایک دن یہ روح دبے پاؤں راجہ دیورائے کے راج محل میں داخل ہوئی اور اس کی نیند لوٹ کر چلتی بنی۔ پنڈت گورکھ ناتھ کا جادو چل گیا۔

دیورائے اپنی نئی محبوبہ کے کمرہ میں تھا جب اس نے پائیں باغ میں ستار پر ایک روح نواز گیت سنا وہ تڑپ کر مسہری سے اٹھا اور لپک کر دریچے میں آیا۔ چاندنی راتوں میں چندا داسی چنبیلی کے باغ میں ستار پر گا رہی تھی۔ دیورائے نے ایسا مدھر گیت پہلے کبھی نہیں سنا تھا اس نے حکم دیا۔ چندا کو اس کے حضور میں پیش کیا جائے۔ اور دوسرے ہی لمحے ستار نواز مغنیہ اس کے روبرو کھڑی تھی اس نے بتایا۔

"یہ گیت پرتھال کا ہے مہاراج! اس کی دھن بھی اُسی نے بنائی ہے۔"

"پرتھال کون ہے؟" دیوراے نے سوال کیا۔

تعجب سے دیوداسی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے حیرت پاش نگاہوں سے دیورائے کو دیکھا اور بولی۔

"کیا آپ پرتھال کو نہیں جانتے؟"

"نہیں تو...... کون ہے وہ؟"

"اس کے حسن و جمال کا چرچا تو سارے وجیانگر میں ہے لوگ اس کا نام جپتے ہیں اور اس کے گیت گاتے ہیں۔ تعجب ہے آپ مہاراج ہو کر اُسے نہیں جانتے۔"

"ہم نے پرتھال کا نام پہلی مرتبہ تمہاری زبان سے سنا ہے چندا! ہمیں بتاؤ تم اس کے متعلق اور کیا جانتی ہو۔ وہ کون ہے کس کی بیٹی ہے۔ کہاں رہتی ہے؟"

"گلاب کا پھول ویرانے ہی میں کیوں نہ کھلے اس کی مہک...... اس کی رنگت دل و نگاہ کو دیوانہ کر دیتی ہے کہتے ہیں پرتھال ایک سنار کی لڑکی ہے لیکن ایسی سندر کہ دیویاں بھی اس سے رُوپ کی بھیک مانگنے جاتی ہیں۔"

ایک لمحہ رُک کر چندا پھر کہنے لگی۔

"وہ دریائے تنگ بھدرا کے اس پار دکن کے علاقہ میں رہتی ہے اس کا روپ ستاروں کو شرماتا ہے اور اُس کی جادو بھری آواز پر جنگل کے وحشی جانور بھی جھومنے لگتے ہیں۔"

دیورائے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اس نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"تم نے پرتھال کو کہاں دیکھا تھا؟"

"دیکھا نہیں مہاراج صرف اس کا ذکر سنا ہے، بیجانگر میں پرتھال کے گُن گانے والے سینکڑوں آدمی ہیں لیکن پنڈت گورکھ ناتھ کے سوا کسی نے اسے نہیں دیکھا، سنا ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کی طرح اکثر پردے میں رہتی ہے۔"

پنڈت گورکھ ناتھ نے اسے دیکھا ہے؟" دیورائے کے لہجے میں ایک اُمید کی لرزش تھی۔

"دیکھا ہی نہیں۔ انہوں نے پرتھال کو راگ ودّیا سکھائی ہے کاشی کی یاترا کے بعد وہ ایک سال تک اُسی کے گھر مہمان رہے ہیں۔"

"بہت خوب......" دیورائے دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم اب سمجھے گورکھ ناتھ بیجانگر کو بھول کر دکن میں کیوں ٹھہر گیا تھا۔ اس نے ایک سال تک ہماری حاضری کیوں نہیں دی۔" پھر وہ دیوداسی سے مخاطب ہوا۔ "اب ہم پرتھال کی کہانی پنڈت گورکھ ناتھ ہی کی زبان سے سننا پسند کریں گے چندا! راج منتری سے کہو وہ پروہت پنڈت کو عزت کے ساتھ ہمارے حضور لائے۔ راج رنواس میں ان کا عہدہ بحال کر دیا گیا ہے۔"

یہ کہہ کر دیورائے اپنے خیالوں میں پرتھال کی تصویر لئے ہوئے کمرے کے اندر چلا گیا اور چندا دریچے کے پاس کھڑی اسے کمرے میں ہولے ہولے ٹہلتے دیکھتی رہی۔ اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

دیورائے کے ذہن میں پرتھال کا لفظ خوبصورت سوالیہ نشان بن چکا تھا۔

پریم کا سندیس

ایک سال بعد

......ٹھیک ایک سال بعد پنڈت گورکھ ناتھ راج رنواس میں کھڑا تھا اور دیورائے پہلے کی طرح پھر اس کے چرن چھونے کی کوشش کر رہا تھا مگر بجلی ایسی تیزی کے ساتھ گورکھ ناتھ نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لئے اور بولا۔

"پنڈتوں کے چرن اب اس قابل نہیں رہے کہ مہاراج دیورائے انہیں چھو سکیں۔"

دیورائے یہ فقرہ سن کر چونک اٹھا اس نے گورکھ ناتھ کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر خشونت اور دکھ کے ملے جلے آثار تھے جیسے دن اور رات گلے مل رہے ہوں۔ اس کی نگاہوں کی بے رخی بتا رہی تھی کہ وہ حکم سے مجبور ہو کر آیا ہے ورنہ اسے راج محل اور رنواس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اس کی گفتگو کا انداز بھی بدل چکا ہے اور آنکھوں میں رحم و شفقت کی بجائے خفگی کے کوندے لپک رہے ہیں۔"

دیورائے نے بھانپ لیا بوڑھا برہمن بہت زیادہ تبدیل ہو چکا ہے اور زمانے کے گرم و سرد نے اسے ایک تجربہ کار تحمل اور آہنی مزاج انسان بنا دیا ہے۔

اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کہیں بڈھے کو دوجی کی موت کا صدمہ تو نہیں کیونکہ دوسری دیوداسیوں کی نسبت وہ اُسے سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔

"گورکھ ناتھ! کاشی کی یاترا کے بعد تم ہمیں ملنے بھی نہیں آئے؟"

"جب گورکھ ناتھ مہاراج کے ذہن سے اُتر چکا تھا تو پھر اس کے نہ ملنے کا افسوس کیسا؟" جواب ترکی بہ ترکی تھا۔ دیورائے سخت پریشان ہو گیا اگر کوئی دوسرا شخص اس کے سامنے ایسا روکھا پھیکا طرز بیان اختیار کرتا تو شاید اسے معاف نہ کیا جاتا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ گورکھ ناتھ کی ہر بات برداشت کر لی جائے۔

دیورائے نے کہا۔

"تم غلط سمجھے ہو گورو دیو! ہم تمہیں بھول کر بھی نہیں بھول سکتے اور تم نے ایک سال میں ہمیں بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔"

"اگر مہاراج کو میرا اتنا ہی خیال تھا تو دوشی کے لہو میں ہاتھ بھرنے سے پہلے میرا انتظار کیا ہوتا۔"

"دوشی۔" دیورائے کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی جیسے وہ اس واقعہ کو ہنس کر ٹال جانا چاہتا ہو۔ "اس لڑکی نے ہماری توہین کی تھی۔ راجہ اور پرجا کے درمیان تمام فاصلے ختم کر دیئے تھے۔ آشرم کی دیوداسیوں کو اتنا گستاخ نہیں ہونا چاہیے۔"

"دوشی آشرم میں ضرور رہتی تھی مگر دیوداسی نہیں تھی مہاراج......"

"تو پھر وہ کون تھی جس نے اپنے مہاراج کا اپمان کیا؟" دیورائے کے لہجے میں ذرا غصے کی جھلک تھی۔

گرو ناتھ نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر گونجتی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دوشی کون تھی تو سنیے! وہ پنڈت گورکھ ناتھ کی بیٹی تھی۔ مہاراج دیورائے کے گرو کی آتما۔ اس کی نبضوں میں میرا خون دوڑ رہا تھا وہ میرے گیان وِدّیا کے سائے میں پل کر جوان ہوئی تھی وہ اپنے مہاراج کے درمیان ہر فاصلے کو بخوبی سمجھتی تھی مگر گورکھ ناتھ کی بیٹی جان دینا جانتی تھی۔ ہوس کا شکار نہیں ہو سکتی تھی آپ کی اندھی خواہش اپنے گرو کے لہو کو بھی شناخت نہ کر سکی۔ راج محل کی دیواروں نے دوشی کی آخری ہچکی ضرور سنی ہو گی پورنماشی کی رات ان دیواروں کا کلیجہ شق کیوں نہ ہو گیا۔ راج محل پر بجلی کیوں نہ ٹوٹ پڑی؟"

"گورکھ ناتھ۔۔۔" دیوانے کے جسم پر ایک خفیف سا لرزہ طاری ہو چکا تھا۔ بوڑھے
ت کی گرجتی ہوئی آواز زہر میں ڈوبے ہوئے تیروں کی طرح اس کے دل میں اترتی جا
ی تھی۔

"کیا دوشی کے متعلق مہاراج کچھ اور سننا پسند کریں گے؟" بوڑھے نے آخری تجر
یا وہ غصے کی شدت سے خود بھی کانپ رہا تھا۔

"ہمیں شما کرو گورکھ ناتھ۔ ہم سے بھول ہوئی۔" دیوانے بوڑھے پروہت کے پیچھے آ
رک گیا۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اگر ہمیں معلوم ہوتا دوشی تمہاری بیٹی ہے تو ہم وہ ہاتھ کاٹ دیتے جو سب سے پہلے
ں کی طرف اٹھا تھا وہ راج محل میں ضرور لائی گئی لیکن ہمارے سامنے آنے سے پہلے وہ
ر پی چکی تھی۔ اس نے اپنی آن پر جان دے دی تھی۔ ہم نے اس کی ارتھی کو خود کاندھا
تھا اس کے سوا ہم اور کچھ نہ کر سکے۔ ہماری طرف دیکھو گورکھ ناتھ! ہم تمہارے گنہگار
ں۔ تم چاہو تو ہم سے ہماری غلطی کی قیمت وصول کر سکتے ہو۔"

"سودا ہمیشہ جان لینے سے پہلے چکایا جاتا ہے جان لینے کے بعد نہیں۔ اب مجھے اس
قیمت وصول کرنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔"

"تو کیا تم اپنے مہاراج کو شما نہیں کرو گے؟"

دیوانے آہستہ آہستہ چلتا ہوا بوڑھے پروہت کے ساتھ آ گیا اور کہنے لگا۔

"اپنے ماتھے کے بل کھول دو گورکھ ناتھ! ورنہ ہماری آتما تڑپتی رہے گی۔ دوشی کی
یقت سنا کر تم نے ہمیں نرک میں پھینک دیا ہے۔ اس کے لئے ہم بلیدان دینے کے لئے
ر ہیں۔"

"آپ کا بلیدان دوشی کا جیون نہیں لوٹا سکتا۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں۔ ہم نے راج رتوں میں تمہارا عہدہ بحال کر دیا ہے
ہ صرف عہدہ ہی بحال نہیں کیا۔ ترقی بھی دی ہے۔ آج سے تم بیجانگر کے راج گورو ہو
ج محل کے ساتھ راج دربار میں بھی تمہاری جے ہوگی۔ بولو اپنی ناراضگی کی قیمت تم اور کیا
تے ہو؟"

"شکریہ مہاراج! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"تو پھر آج ہی تمہارے نئے عہدہ کا اعلان کر دیا جائے گا۔"

دیورائے پُرسکون لہجہ میں بولا۔ "لیکن راج گورو بننے کے بعد تمہیں آشرم چھوڑنا پڑے گا اور گوردھن تمہارا کام سنبھال سکتا ہے۔"

"ہاں مجھے گوردھن پر وشواش ہے۔" گورکھ ناتھ نے گویا نئے عہدے کی قبولیت کا اعلان کر دیا اور دیورائے نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب صرف ایک ہی پریشانی باقی تھی گورکھ ناتھ سے...... پرتھال کا ذکر کس طرح کیا جائے، دریچے کے قریب پہنچ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"راج گورو" کوئی معمولی عہدہ نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں مہاراجہ کے بعد گورکھ ناتھ وجیانگر کے سیاہ سفید کا مالک بن چکا تھا اور اس کے ایک اشارے پر منتری زنجیروں میں جکڑا جا سکتا تھا۔ یہ اعزاز یہ مرتبہ، گورکھ ناتھ سوچنے لگا کہیں دیورائے نے مجھے خریدنے کی تو کوشش نہیں کی لیکن کچھ بھی ہو اس نے دام برے نہیں لگائے تھے اب وہ راج گورو کی حیثیت سے کام زیادہ آسانی کے ساتھ ادا کر سکے گا۔ اس نے دیورائے کی طرف دیکھا جو دریچے کے پاس گم صم کھڑا تھا جیسے وہ کسی اہم فیصلے پر غور کر رہا ہو اچانک اس نے راج گورو گورکھ ناتھ کی طرف رخ موڑ لیا۔

"کل سے تم ہمارے ساتھ راج محل میں رہو گے۔ ہمیں ہر وقت تمہارے مشوروں کی ضرورت ہے۔"

"جو آگیا سرکار!"

"کئی دن سے ہمیں ایک بات نے پریشان کر رکھا ہے......"

دیورائے اپنی بات کو نامکمل چھوڑ کر پھر کہیں ڈوب گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ بوڑھے پروہت کے سامنے کسی شے کا ذکر کرنا بھی چاہتا ہے اور نہیں بھی کرنا چاہتا۔ وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے اس کے ہونٹ کھلتے کھلتے پھر سمٹ جاتے ہیں گورکھ ناتھ نے چہرے کے اضطراب سے اس کے دل کی بے تابی کا اندازہ کر لیا تھا وہ آگے بڑھ کر بولا۔

"آخر کس بات نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے؟ کیا میرا دماغ بھی اس گتھی کو نہیں کر سلجھا سکتا؟"

"تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

''تو پھر پریشانی کس بات کی ہے آپ بیان کیجیے۔ میرے بس میں ہوا تو بیجانگر کی خاطر بھنی آسمان سے ستارے بھی توڑ لاؤں گا۔''

''گورکھ ناتھ.....''

یکلخت دیورائے کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر برہمن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور کہنے لگا۔

''دکن کے آکاش پر میں نے ایک حسین ستارہ چمکتے ہوئے دیکھا ہے اگر تم اسے بیجانگر کے راج محل کی زینت بنا دو تو ''رائے رایاں'' کی تاریخ ہمیشہ تم پر فخر کرے گی۔''

''حسین ستارہ؟'' بڈھے پروہت کے ہونٹ تھرتھرائے اور اس نے معنی خیز نظروں سے دیورائے کی طرف دیکھا جیسے اس کا مطلب سمجھ جانے کے باوجود انجان بن رہا ہو۔

''آپ نے دکن کے آکاش پر کون سا حسین ستارہ دیکھ لیا ہے؟''

''پرتھال۔''

دیورائے کے دل کا بوجھ زبان پر آ گیا اور پرتھال کا نام سنتے ہی گورکھ ناتھ یوں چونک اٹھا جیسے کوئی غیر متوقع حادثہ ظہور میں آ گیا ہو حالانکہ وہ دیورائے کی زبان سے یہی نام سننے کا منتظر تھا۔

''پرتھال.....'' گرو ناتھ نے زیر لب دہرایا۔

''ہم نے سنا ہے وہ ستاروں سے زیادہ روشن اور بہاروں سے بڑھ کر جوان ہے تم اس کے سنگیت گرو ہو۔ اُسے ہمارا سندیس پہنچاؤ کہ بیجانگر کے راج محل کے دروازے اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔''

بوڑھا خلاف توقع خاموش ہو گیا اور دیورائے کی مضطرب نگاہیں اس کے ہونٹوں کے آس پاس ایک ڈھول کی طرح جم کے رہ گئیں جب اُس نے کوئی جواب نہ دیا تو دیورائے بولا۔

''کس سوچ میں ڈوب گئے ہو راج گورو! ابھی ابھی تم نے بھنی آکاش سے ستارے توڑنے کا قول دیا تھا۔

''میں اپنا قول نہیں بھولا لیکن سوچتا ہوں اگر پرتھال بیجانگر آنے پر رضامند نہ ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟''

"پھر وہ کرناٹک کے سورماؤں کی خارا شگاف تلواروں کو بے نیام دیکھے گی۔"

دیورائے سینہ تان کر کہنے لگا۔ "ہم جس چیز کو حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اُسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتے ہیں۔"

"مگر یہ بھی سوچ لینا چاہیے اس صورت میں ہمیں فیروز شاہ کی طاقت سے الجھنا پڑے گا۔ کیا یہ خطرہ مول لینا مناسب ہو گا؟"

"ہم تو اس خطرے کا مدت سے انتظار کر رہے ہیں اگر فیروز شاہ نے الجھنے کی کوشش کی تو ہم تلواروں سے اس کا سواگت کریں گے۔"

"تو پھر پرتھال کو ہر حال میں بیجانگر آنا پڑے گا۔ اپنے پاؤں سے چل کر یا بیڑیاں پہن کر۔"

"لیکن ہم حسن کو بیڑیاں پہنانا نہیں چاہتے تم کل ہی مدگل روانہ ہو جاؤ اور پرتھال کو راضی کر لو۔ ہم اسے وجیانگر کی رانی بنائیں گے۔"

یہ کہہ کر دیورائے اس کے سندر روپ کے تصور میں کھو گیا۔ گورکھ ناتھ نے معنی خیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور اُسے مہاراج کی آنکھوں میں موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آئے۔ اُس نے خود ہی تو دیورائے کے سینے میں پرتھال کے شوق دیدار کی آگ روشن کرائی تھی۔ اب اس کے اردگرد انجانی محبت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شوق کی بجلیاں لپک رہی تھیں جنہوں نے ہوش و حواس کا خرمن پھونک ڈالا تھا اور بوڑھا پروہت اپنی بیٹی کے قاتل کو اپنی تدبیر کے شکنجے میں جکڑا ہوا دیکھ کر دل ہی دل میں ایک سکون، ایک قرار، ایک اطمینان محسوس کر رہا تھا وہ جانتا تھا۔ راج گورو کا عہدہ دراصل دوشی کے بے گناہ خون کی قیمت ہے لیکن دیورائے نے یہ قیمت ادا کر کے دراصل موت کو اپنے قریب کر لیا تھا گرو ناتھ کے سینے میں دوشی کے انتقام کا جذبہ کالے ناگ کی طرح رینگتا پھر رہا تھا۔

کیا اس لالچ سے گورکھ ناتھ کا انتقام ٹل جائے گا؟

کیا وہ قیامت کی گھڑی جو دیورائے کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے رُک جائے گی؟"

شاید نہیں۔

بوڑھے برہمن کی دور اندیش نگاہیں دیورائے کے چہرے پر کئی جال بُن چکی تھیں۔

جانے وہ کن خیالوں میں ڈوب گیا تھا مگر پرتھال کے سوا وہ کسی اور شے کے متعلق سوچ ہی
کب سکتا تھا وہ تو چاہتا تھا۔ صبح کا اجالا نمودار ہونے سے پہلے روپ کا چاند اس کے محل
میں جلوہ گر ہو جائے اور وہ راج رتو اس کے ستاروں کے جھرمٹ میں اس کا استقبال کرے،
خیر کچھ بھی سہی اب اس کی تقدیر کا فیصلہ گورکھ ناتھ کے ہاتھ میں تھا۔

دیورائے ہولے ہولے چلتا ہوا صندل کے ایک سرخ صندوقچہ کے قریب آ کر رُک
گیا جس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے صندوقچہ کھولا اور اس کے ہاتھ
میں ایک طلائی گلوبند جھلملانے لگا، جو ہیرے جواہرات سے مرصع تھا اس نے گلوبند راج
گورو کی طرف بڑھا دیا۔

''پرتھال کے لئے ہمارا پہلا تحفہ۔''

پھر اس نے ایک قیمتی انگوٹھی نکالی اور وہ بھی پروہت کے حوالے کر دی۔

''اگر وہ ہمارا سندیس قبول کرے تو یہ انگوٹھی اُسے ہماری طرف سے پہنا دو۔''

''میں کل سویرے ہی روانہ ہو جاؤں گا۔''

''راج گورو کو ہماری خاص سواری لے جانے کی اجازت ہے، کل محل کے دروازے
پر یہ سواری تیار ملے گی۔''

''شکریہ!'' گورکھ ناتھ نے دیورائے کو بھرپور نظروں سے تولا پھر اس کے قدم آہستہ
آہستہ دروازے کی طرف اُٹھنے لگے۔

دیورائے کی نگاہیں ابھی تک بوڑھے برہمن کے تعاقب میں تھیں جو کمرۂ خاص سے
نکل کر ایک طویل شفاف راہداری عبور کر رہا تھا اور دروازے کی پرلی طرف اُسے محافظ
پہرے داروں کے نیزوں کی انیاں چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں گورکھ ناتھ ان چمکتی ہوئی انیوں
کی سیدھ میں رواں تھا۔ اس کے بوڑھے قدم یوں اُٹھ رہے تھے جیسے وہ تلوار کی دھار پر
چل رہا ہو دیورائے دریچے سے ٹیک لگائے اُسے دور اور...... دور ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اچانک وہ ایک بار باریک سی آواز سن کر چونک اٹھا......

''مہاراج کی جے ہو۔''

دیورائے کو یوں لگا جیسے عقبی دروازے سے اُسے موت نے آ پکارا ہو دراصل یہ اس
طوطے کی آواز تھی جس کا پنجرہ پائیں باغ کی بالکونی میں لٹک رہا تھا اور جو سارا دن......

"مہاراج کی جے ہو" کا سبق رٹتا رہتا تھا۔

"مہاراج کی جے ہو"

طوطا پھر چلایا اور دیو رائے زیر لب مسکراتا ہوا اس کی طرف چل دیا ایسے موقع پر جے پکارنا ایک نیک شگون تھا وہ سوچنے لگا۔ اگر پرتھال آئی تو وہ یہ طوطا بھی اس کی نذر کر دے گا جو اس کا دل بہلاتا رہے گا۔

اُداسی کے لمحے

جب سے شہزادہ حسن نے فیروز آباد کی طرف کوچ کیا تھا۔ پرتھال کی بے قراریاں بڑھ گئی تھیں وہ اکثر اداس اور غمگین رہنے لگی۔ سوتے جاگتے ایک عجیب سا احساس اس کی روح پر چھایا رہتا وہ بار بار جنگلی ہرنی کی طرح چونک کر اٹھتی جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھ کر ڈر گئی ہو پہلے کی مانند اب اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں نہیں بکھرتی تھیں، نہ ستار کے تاروں پر بہار کے گیت رقص کرتے تھے اب وہ بجھی بجھی اور چپ چپ سی رہنے لگی تھی جیسے کوئی چیز کھو بیٹھی ہو جیسے اپنے آپ کو کسی ان دیکھے جزیرے میں بھول آئی ہو۔ گھر والوں نے اس کے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی محسوس کی۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے جوان بیٹی کے گلابی ہونٹوں کی مسکراہٹیں کون چھین کر لے گیا ہے۔ بوڑھا لکھیت سوچنے لگا شاید گورو دیو کی جدائی اس کی پریشانی کا باعث بن گئی ہے جب سے وہ گیا تھا۔ پرتھال الجھی الجھی سی باتیں کرنے لگی تھی لیکن وہ یہ سمجھ کر خاموش رہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ پنڈت گورکھ ناتھ کی یاد خود بخود اس کے ذہن سے محو ہو جائے گی مگر بوڑھے ستار کو کیا خبر تھی پرتھال کے دل میں حسین یادوں کی جو شمع روشن ہو چکی ہے اسے زمانے کی آندھیاں بھی نہیں بجھا سکتیں۔

پرتھال کی زندگی ایک خواب میں ڈھل گئی تھی وہ اب بھی ندی کنارے جاتی اور درختوں کے جھنڈ میں بیٹھی پہروں خیالوں میں کھوئی رہتی۔ پہلے جب سانپ کی مانند پیچ بل کھاتی ہوئی ندی بھوری چٹانوں کے درمیان آ کر مدھم سا ترنم پیدا کرتی تھی تو پرتھال یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کائنات کی دیوی زندگی کے ستار پر کوئی مدھر راگ چھیڑ رہی ہو، اس کی موسیقی کی لے پر اس کے ہونٹ آپ سے آپ بہار آفرین گیت بکھیرنے لگتے تھے اس اس کی جادو بھری آواز جنگل کی فضا میں رس گھولنے لگتی تھی لیکن اب وہی موسیقی ایک طو

سسکی میں تبدیل ہو گئی تھی اور بھورے پتھروں سے ٹکراتی ہوئی لہریں الم‌ناک راگ الاپتی محسوس ہوتی تھیں شاخوں کے جھرمٹ میں کوئل کی کوک سنائی دیتی تو پرتھال کو یوں لگتا جیسے اس کے دل کی دھڑکن آواز میں ڈھل کر اس کی بے تابی کا اظہار کر رہی ہے۔

احساس کی یہ تبدیلی اچانک ہی ظہور میں آئی تھی کیونکہ گزشتہ چار روز کے اندر جو واقعات پیش آئے تھے۔ وہ بالکل غیر متوقع اور انہونے سے معلوم ہوتے تھے، کبھی کبھی تو اُسے ان واقعات پر ایک حسین سپنے کا گمان گزرنے لگتا تھا۔ بھلا دکن کے شہزادے کا ایک غریب ستار کی لڑکی سے محبت کے عہد و پیمان کرنا اور اسے شاہی محلات میں پُرتکلف زندگی گزارنے کی دعوت دینا ایک حسین سپنا نہیں تو اور کیا تھا؟

اگرچہ جاتے جاتے حسن یہ وعدہ کر گیا تھا کہ وہ بہت جلد لوٹ آئے گا اور پھر وہ سلطان معظم کی اجازت سے اسے اپنے ساتھ فیروز آباد لے جائے گا مگر رونق بیگ کی زبانی اُسے اُن مشکلات و مصائب کا اندازہ بھی ہو چکا تھا جو اُس محبت کے نتیجے میں پیش آ سکتی تھیں۔ اول تو یہی بات ناممکن نظر آتی تھی۔ سلطان ایک غریب لڑکی کو حرم سرا میں داخلے کی اجازت دے دیں گے۔ دوسرے ولی عہد کی حیثیت میں شہزادے کے لئے ضروری تھا کہ وہ شاہی خاندان یا کسی بڑے خانوادے کی حسینہ کو رفیقۂ حیات بنائے کیونکہ مستقبل میں اس لڑکی کو دکن کی ملکہ بننا تھا۔ حسن بے شک سلطنت بہمنی کا چشم و چراغ تھا۔ بہادری اور جنگجوئی میں اُس نے بڑا نام پیدا کیا تھا اور سلطان کے بعد اس کے حدود و اختیارات بھی بے کنار تھے اس کے باوجود آئین سلطنت کی رو سے شاید اُسے اپنی زندگی کے متعلق اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ اُسے محبت کی دیوانگی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کر دے، جسے قانون کی اصطلاح میں ''بغاوت'' کہا جاتا ہے مگر دکن کا ولی عہد ایک غریب و بیکس لڑکی کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لینے پر تیار ہو جائے گا؟

پرتھال جب اس قسم کی باتیں سوچتی اُس کا دماغ ستار کے کسے ہوئے تاروں کی طرح جھنجھنا اٹھتا ایک عالی مقام شہزادے کے سامنے بھلا اُس کی حیثیت ہی کیا تھی وہ ایک ایسے پھول کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی جو سارے چمن کی زینت تھا۔ اُس پھول پر پورے دکن کی نظریں لگی ہوئی تھیں، ہزاروں رنگین دامن اس کے لئے مچل رہے ہوں گے، پھر یہ کس طرح ممکن تھا وہ گل بہار اپنی شاخ سے ٹوٹ کر ایک غریب لڑکی کی جھولی میں آ

گرے، کاش وہ غریب نہ ہوتی۔ اس نے کنگلے سنار کے گھر جنم نہ لیا ہوتا یا اس کا محبوب شہزادہ کی بجائے گاؤں کا البیلا چرواہا ہوتا جو ندی کنارے بیٹھا بانسریا کی تانیں اڑاتا اور وہ اُن کی سریلی لے پر مدھ بھرے گیت الاپتی ہوئی اس کے آس پاس رقص کرتی۔ اگر یوں ہوتا تو زندگی کتنی سندر ہو جاتی لیکن مصیبت تو یہی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک وارثِ تخت سے ٹکرائی تھیں جس کی زندگی عام لوگوں سے بڑی مختلف اور انوکھی تھی حتیٰ کہ اس کی ملاقات کے لئے بھی کتنے حاجبوں اور دربانوں کے پہروں میں سے گزرنا پڑتا تھا اپنی محبوبہ کے انتخاب کے لئے سلطان کے مشورے کی ضرورت تھی اگر سلطان نے اُس کی درخواست مسترد کر دی اور اس کی زندگی کی ڈور حرم سرا کی کسی شہزادی کے ساتھ باندھ دی...... تو کیا ہو گا؟ کیا ہو گا اور پریم کی ندیا کس رخ بہے گی؟ حالانکہ یہ ڈور تو باندھی بھی جا چکی تھی۔

یہ احساس واقعی بڑا تکلیف دہ اور جاں گسل تھا۔ پرتھال کے حسین سنہرے خواب بکھرنے لگتے اور خیالات کی نازک کڑیاں کانچ کی چوڑیوں کی طرح ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگتیں وہ سوچتی کہیں اس کی زندگی جھیل کی کائی کی مانند کسی طوفان کی نذر نہ ہو جائے شہزادوں اور راجکماروں سے محبت کا خیال یقیناً بڑا خوش آئند اور حیات افروز ہوتا ہے لیکن حسین خوابوں کی تعبیر اکثر بھیانک ہوتی ہے اتنی بھیانک کہ انسانی آنکھ اُسے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی۔

سارا سارا دن وہ اسی سوچ بچار میں گزار دیتی۔ تنہائی اگرچہ پہلے بھی اسے بڑی عزیز تھی اور اس کا اکثر وقت گانے کا ریاض کرتے، گیت الاپتے اور تنہا بیٹھ کر انہوں نے خیالات کا تانا بانا بننے میں گزر جاتا تھا بس کبھی کبھار وہ گاؤں کے مکھیا کی لڑکی گوری کے ساتھ ہنس کھیل لیتی تھی ورنہ گھر میں پڑی رہتی یا فرصت کے وقت ندی کنارے جا نکلتی۔ لیکن اب اُس تنہائی کی نوعیت ہی مختلف تھی پہلے اسے اپنے سپنوں کے راجہ کا انتظار تھا وہ تصور کی نگاہوں سے نیلے پربتوں کے اس پار ایک خیالی اور مثالی محبوب کی راہ دیکھا کرتی تھی اب جب کہ اُس کا پریمی سچ مچ سر پر سونے کا مکٹ پہنے اور کلغی لگائے اس کی زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ حیرت و استعجاب کی موجوں میں ہچکولے کھا رہی تھی اور سوچنے لگی کہیں یہ سب کچھ ایک سندر سپنا تو نہیں؟

رائے نند کمار کا پیغام

ہولے ہولے پراسرار خاموشی اور تنہائی بوڑھے باپ کے لئے ایک نئی پریشانی بن گئی۔ اُسے بیٹی کے بیاہ کی فکر تو بہت دیر سے تھی مگر جب پرتھال ہی کسی جگہ شادی کے لئے رضامند نہیں تھی۔ بوڑھا کر بھی کیا سکتا تھا اور اب تو اُسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہیں بیٹی کی جوانی سپنے دیکھتے ہی نہ بیت جائے، جب سے اس نے دکن کے ولی عہد شہزادہ حسن کے لئے انگوٹھی بنا کر انعام حاصل کیا تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی لیکن سنار کی کاری گری کی بجائے اُس کی جوان اور سندر لڑکی کا چرچا عام تھا لوگ یہ سن کر حیران رہ جاتے کہ وہ بڑے بڑے زمینداروں اور ساہو کاروں کے پیغام ٹھکرا چکی ہے اُس کے حُسن کی شہرت سن کر مدگل کے رائے نند کمار نے بھی سندیس بھیج دیا جو ایک چوہان جاگیردار اور بہمنی دربار سے خطاب یافتہ تھا اس کی حویلی پر ہاتھی جھولتے تھے، اُس نے وعدہ کیا تھا اگر اُس کا پیغام منظور کر لیا گیا تو لکھپت کو ایک ہاتھی پیش کرے گا۔ اب بوڑھے سنار کو یہ شوق چرایا کہ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر فیروز آباد جائے اور شہزادہ حسن کی حاضری دے اُسے بتائے "مہاراج! جب سے آپ نے اس غریب کو عزت بخشی ہے میرے بھاگ جاگ اُٹھے ہیں، میری بیٹی چوہان گھرانے کی زینت بنی ہے اب میں معمولی آدمی نہیں آپ کی دیا سے بھگوان نے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔"

رائے نند کمار کا پیغام سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا اس کی بیٹی کتنی بھاگوان ہے۔ اس کے لئے چوہانوں کے سردار نے پیغام بھیجا ہے۔ اب اُسے معلوم ہوا اگر وہ پرتھال کا بیاہ کر چکا ہوتا تو یہ عزت کیسے ملتی رائے نند کمار اسے ہاتھی کی پیش کش کیوں کرتا؟ اور دل ہی دل میں وہ خوش ہوا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے بیٹی ابھی تک دوسرے گھر میں نہیں گئی۔ ورنہ...... ورنہ...... یہ چوہان خاندان۔ یہ رائے نند کمار...... اور یہ ہاتھی...... یقیناً بھگوان کی لیلا نیاری ہے ورنہ لکھپت سنار کو کون جانتا تھا اُسے یقین تھا۔ پرتھال اس پیغام کو سنتے ہی اپنی قسمت پر ناز کرے گی لیکن وہ اپنے بیاہ سے اتنی مرتبہ انکار کر چکی تھی کہ اب بوڑھے کو اس کے سامنے کسی کے پیغام کا ذکر کرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا اگر پہلے کی طرح اس نے اس مرتبہ بھی انکار کر دیا تو رائے نند کمار پھر کہاں ہاتھ آئے گا؟ مگر نہیں اس کی بیٹی

اتنی نا سمجھ نہیں۔ وہ چوہانوں کی عزت اور غیرت کو خوب جانتی ہے، پرتھوی راج چوہان ہی تھا جو بھری سبھا سے سنجوگتا کو اڑا لایا تھا پھر نند کمار پرتھال کو کیسے چھوڑے گا؟ مگر پرتھال انکار کیوں کرے گی؟ اُسے کہیں نہ کہیں تو ہاں کرنی ہی ہے تو پھر رائے نند کمار سے بڑا رشتہ کہاں سے آئے گا؟

اسی دن بوڑھے لکھپت نے مکھیا کی بیٹی گوری کو بلایا اور اس کی وساطت سے رائے نند کمار کا سندیس پرتھال تک پہنچایا۔ بوڑھے نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''تو اُس کو سمجھانا وہ مان جائے گی۔ کہنا چوہان سردار نے تیرے بابا کے لئے ہاتھی بھیجنا منظور کیا ہے جب میرے دروازے پر ہاتھی جھولے گا تو میری کتنی شوبھا ہو گی۔ لوگ ہماری قسمت پر رشک کریں گے اور میں...... میں ہاتھی پر بیٹھ کر فیروز آباد جاؤں گا۔ میرے پاس ولی عہد کا پروانہ ہے وہ یہ سن کر کتنا خوش ہو گا کہ لکھپت سنار ہاتھی پر سوار ہو کر اس سے ملنے آیا ہے پرتھال سے کہنا اپنے بوڑھے باپ کی عزت رکھ لے اور دیکھ گوری! تجھے بات بھول جایا کرتی ہے کہیں ہاتھی کا ذکر بھی نہ بھول جانا۔ یہ ہاتھی بھاگوانوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ بس اب تو جا۔ وہ تجھے ندیا پر مل جائے گی اور ہاں اُسے اپنے ساتھ لے کر جلدی لوٹ آنا۔ رائے نند کمار کے آدمی جواب کے منتظر ہیں۔''

گوری گئی اور لوٹ آئی مگر پرتھال اس کے ساتھ نہ آسکی۔ گوری نے بتایا کہ وہ مندر چلی گئی ہے ٹھہر کے آئے گی۔

''مندر چلی گئی ہے۔'' بوڑھا لکھپت بولا۔ ''پھر تو اس نے ضرور رائے نند کمار کا پیغام منظور کر لیا ہو گا اور بھگوان کو پرنام کرنے مندر میں چلی گئی ہو گی۔ پر تو بتاتی کیوں نہیں اس نے کیا جواب دیا ہے۔ وہ بیاہ پر راضی ہے نا؟''

''نہیں۔''

اور گوری کے منہ سے یہ ''نہیں'' سن کر بوڑھے لکھپت کا چہرہ یوں اُتر گیا جیسے ابھی اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا اور نڈھال سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔

''لکھپت چاچا! تم جی ہلکا نہ کرو۔ بھگوان نے چاہا تو اچھا ہی ہو گا۔''

''اب بھگوان کچھ نہیں چاہے گا۔ کچھ نہیں چاہے گا۔'' بوڑھے کی آواز مایوسی کے

کنویں میں ڈوبتی چلی گئی۔ "مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے پرتھال اپنے جیون میں کانٹے بکھیر رہی ہے قسمت اس پر بار بار مہربان ہوئی ہے اور وہ ہر مرتبہ اُسے پاؤں سے ٹھکرا دیتی ہے۔ میری بات یاد رکھنا وہ روئے گی، تڑپے گی، برباد ہو جائے گی۔"

"بابا......"

بوڑھے نے سر اٹھا کر دیکھا تو پرتھال سامنے کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں پھولوں کی مالا تھی جسے وہ شاید مندر سے لائی تھی اور اب دہلیز کے پاس کھڑی دکھی نظروں سے اپنے بوڑھے باپ کو دیکھ رہی تھی جس کے بدن پر غصہ اور غم کی وجہ سے ایک رعشہ سا طاری تھا۔

بیٹی کو دیکھتے ہی جیسے بوڑھے کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"تو نے اچھا نہیں کیا بیٹی! چوہان سردار یونہی کسی کے ہاں پیغام نہیں بھیجا کرتے اب میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میں رائے نند کمار کے ایلچی کو کیا جواب دوں گا۔ لوگ ہنسیں گے کہیں گے بڈھا سٹھیا گیا ہے...... اور تو...... تو شاید اپنے آپ کو راجہ بھوج کی بیٹی سمجھتی ہے مگر تیرا باپ تو ایک غریب سنار ہے بھلا چوہان اور سنار کا کیا مقابلہ اگر رائے نند کمار بگڑ گیا تو جانتی ہے کیا ہوگا۔ وہ انکار کو اپنی توہین سمجھے گا پھر ہم سب مل کر بھی اس کے غضب و قہر کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔" پرتھال ہولے ہولے چلتی ہوئی بوڑھے باپ کے پاس آئی اور اُس کے کندھوں پر ہاتھ ٹکا کر بولی۔ "بابا غم نہ کرو، رائے نند کمار ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

بڈھے کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ چوہان سردار اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے یا نہیں اسے اصل دکھ یہ تھا کہ پرتھال نے اتنے بڑے سردار کا پیغام قبول کیوں نہیں کیا جس کے دروازے پر ہاتھی جھومتے ہیں جس کی حویلی میں اس کی بیٹی راج کرے گی اور سارے علاقے میں لوگ ایک دوسرے کو لکھپت کی کہانیاں سنایا کریں گے۔

"نند کمار چاہے تو یہ سارا گاؤں پھونک سکتا ہے۔ ہمیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا سکتا ہے اور...... اور......" بوڑھا کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو پرتھال کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ تیر رہی تھی اور یہ مسکراہٹ دیکھ کر بوڑھے کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تو کیا اس کے نزدیک رائے نند کمار بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ باپ کے آنسو بھی اس کے پتھر دل کو گداز نہیں کر سکے؟ پرتھال نے دونوں ہاتھوں سے بوڑھے باپ کو سہارا

دے کر اٹھایا پھر ساڑھی کے آنچل سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "بابا! تمہاری بیٹی لوٹ کا مال نہیں جسے نند کمار ایسے لٹیرے اٹھا کر چلتے بنیں۔ وہ میرے انکار کو اپنی توہین سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے۔ ہم نے کب اس کی منت کی تھی کہ وہ پیغام بھیجے۔"

"بیٹی!" بوڑھے کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ حیرت پاش نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "پر تیرے من میں کیا ہے؟ کسی دن تو مجھے اتنی بات تو بتا دے؟"

"بس کچھ روز چپ رہو۔ پھر تمہیں آپ سے آپ پتہ چل جائے گا۔ میرے من میں کیا ہے۔"

یہ کہہ کر پرتھال بوڑھے باپ کو بازوؤں کا سہارا دیئے کمرے میں لے گئی رائے نند کمار کے ایلچی کو ناکام لوٹا دیا گیا۔ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی کہ لکھپت سنار نے چوہانوں کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کر دیا ہے۔ گاؤں کے مکھیا سکھ دیو نے یہ خبر سنی تو دم بخود رہ گیا...... کیا لکھپت سچ مچ پاگل ہو گیا ہے؟



3

جواب کا خنجر

نئی سواری

شام کا ستارہ مندر کے سنہری کلس کے عین اوپر چمک رہا تھا۔ جب بیجانگر کے راستے پر گھنٹیوں کی سریلی آواز جادو جگاتی ہوئی اُبھری۔ سورج کی بنفشی شعاعیں مٹیالے اندھیروں میں سسک سسک کر دم توڑ رہی تھیں۔ درختوں کے سائے جھٹپٹے میں مل جل گئے تھے اور زمین پر تاریکی کے ناگ رینگنے لگے تھے۔

چرواہے سرِ شام ہی اپنے ڈھور ڈنگر بستی کی جانب ہانک دیتے تھے اور غروب آفتاب کا سنکھ بجنے کے بعد یہاں ایک عجیب سا سناٹا چھا جاتا تھا۔ اس سناٹے میں گھنٹیوں کی آواز یوں بلند ہوئی جیسے ایک ساتھ چاندی کی بیسیوں چھاگلیں بج اٹھی ہوں اور ان کی موسیقی ایک سحر آفریں جھنکار کے ساتھ فضا میں بکھرنے لگے۔ آواز لحظہ بلحظہ قریب آ رہی تھی اور اس کے بڑھتے اور ابھرتے ہوئے ترنم سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی قافلہ بستی کی طرف آ رہا ہو لیکن مہاراج دیورائے کی سرکشی اور راہزنی کی وجہ سے بیجانگر کی شاہراہ کچھ عرصہ سے بند پڑی تھی اور دکنی قافلے عموماً مدگل کے راستے سفر کرتے تھے۔ پہلے بیجانگر اور دکن کے درمیان قدم قدم پر زندگی کے آثار نظر آتے تھے اور راتوں کو بھی راستہ مسافروں کی آہٹ اور قافلوں کی موسیقی سے آباد رہتا تھا لیکن اب صورتِ حال بدل گئی تھی ''رائے رایاں'' کا مہاراجہ دیورائے چند سال پہلے بھی سرحد کی تاخت میں بڑی سرگرمی دکھایا کرتا تھا لیکن بہمنی سلطان نے جوابی حملہ میں وجیانگر کی سلطنت الٹ کر رکھ دی اور مہاراجہ نے صلح کر کے اپنی جان

چھڑائی تھی۔ وہ سلطان دکن کو خراج دینے پر تیار ہو گیا تھا اور شرائط صلح کے مطابق اسے اسی وقت سلطان کے حضور حاضر ہو جانا چاہیے تھا۔ جب سلطان اس کی ضرورت محسوس کرے چند سال تک دیورائے اس معاہدے کا پابند رہا۔ وہ خراج بھی بھیجتا اور سلطانی احکام کی خلاف ورزی بھی نہیں کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ سے پھر اس کی فتنہ جو طبیعت ہنگامہ آرائی کی متمنی نظر آتی تھی اس نے حیلوں بہانوں سے خراج ہی نہیں روک لیا تھا بلکہ سرحدوں پر ڈاکہ زنی بھی شروع کر دی تھی اور دارالسلطنت گلبرگہ سے سلطان نے شہزادہ حسن کو تاکید کی تھی کہ دیورائے پر نظر رکھے۔ حالات کروٹ بدل رہے تھے اور خطروں کے پیش نظر تو دن کے اجالے میں بھی اس سنسان راستے پر سفر کرتے ہوئے انسان وحشت سی محسوس کرنے لگتا تھا۔ البتہ بیجانگر کے پجاری پنڈت اور پروہت جو کاشی کی یاترا کو جاتے وقت دکن کی سرزمین سے گزرتے تھے اسی راستے سے آجایا کرتے تھے لیکن یاتریوں کی حفاظت، دیکھ بھال اور مہمان نوازی کے لئے بہمنی سلطان نے خاص احکام جاری کر رکھے تھے۔ حکم تھا بیجانگر کا جو یاتری دکن میں آنکلے وہ حکومت کا مہمان ہوگا اور سلطانی کارندے اس کے طعام و قیام کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے سلطان نے کئی سرائیں بنوا دی تھیں۔ یاتری بنارس جاتے یا واپس آتے ہوئے انہی سراؤں میں بسیرا لیتے تھے۔ جہاں سرکاری خدام ان کی سیوا کرتے بعض یاتریوں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ دکن میں اپنے ہندو دوستوں یا عزیزوں کے ہاں رات بسر کریں۔ سلطان نے اجازت دے رکھی تھی وہ جہاں چاہیں قیام کریں لیکن دکن کے ہندو میزبانوں کو ہدایت تھی کہ مہمانوں کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ خاص خاص ہندو گھرانوں کو بھی جہاں یاتری عموماً ٹھہرتے تھے شاہی خزانہ سے وظیفہ ملتا تھا تاکہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہ جائے یہی وجہ تھی سلطان فیروز شاہ بیجانگر اور بنارس کے ہندوؤں میں بڑی عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اکثر یاتری کاشی میں اس کی ترقی، اقبال کے لئے پرارتھنا کرتے تھے۔ اس کے برعکس بیجانگر کا راجہ نہ صرف یاتریوں سے محصول لیتا بلکہ اس کے سپاہی دکن کے تجارتی قافلوں کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کرتے تھے حتیٰ کہ بیجانگر کے فوجیوں نے کئی مرتبہ دکن کے ہندو سوداگروں کو بھی لوٹ لیا تھا اور وہ روتے ہوئے سلطان کے دربار میں فریاد لائے تھے۔ رحمدل سلطان نے ان کے نقصان کی تلافی کر دی تھی اور مدگل

کے حاکم فولاد خاں کو حکم بھیجا تھا وہ دیورائے کے لٹیرے سپاہیوں پر نظر رکھے اور انہیں قرار واقعی سزا دے اس حکم کے بعد اگرچہ سرحدی مقامات پر دیورائے کی تاخت ختم ہو گئی تھی کیونکہ بہمنی سوار سرحد کے آس پاس گشت کرتے رہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بیجانگر کی شاہرہ سنسان اور ویران ہو گئی تھی۔ کیونکہ تجارتی قافلوں کی آمد ورفت بند ہو چکی تھی اور اب کوئی اکا دکا مسافر ہی اس راستے پر سفر کرتا تھا وہ بھی شام ڈھلنے سے پہلے ہی پہلے کسی بستی کا رخ کر لیتا تھا۔ اب اسی اجاڑ اور ویران شاہراہ پر گھنٹیوں کا مترنم شور شام کے ملگجے سناٹے کا سینہ چیرتا ہوا ابھرا تھا اور لحظہ بہ لحظہ یہ شور بستی سے قریب اور قریب ہوتا جا رہا تھا۔

مندر کے بوڑھے مہنت نے چھوٹی اینٹوں کی دیوار پر سے سر ابھار کر اپنی تیز نگاہیں نیم تاریک راستے پر بچھا دیں اور یہ جاننے کے لئے بے قرار ہو گیا کہ بیجانگر کی سنسان شاہراہ پر آج موسیقیاں سی بکھیرتا ہوا کون چلا آ رہا ہے؟ لیکن اس کی نگاہیں دم بدم پھیلتے ہوئے اندھیروں میں بکھر کے رہ گئیں اور اسے چند متحرک سایوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دے سکا۔

گاؤں کا بڈھا مکھیا سکھ دیو گھنٹوں کی آواز سن کر دروازے کی دہلیز ہی میں ٹھٹک کے رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ معمہ نہ آ سکا کہ یہ گھنٹیوں کی آواز کیسی ہے؟

"کوئی قافلہ جان پڑے ہے۔" بڈھا آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ پھر اس نے کھڑے کھڑے آواز دی۔

"گوری! او گوری! ذرا باہر نکل کر دیکھو یہ گھنٹیوں کا شور کیسا ہے؟"

لیکن بڈھے مکھیا کی آواز جھونپڑی کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ گوری وہاں نہیں تھی اور گوری کی بیمار ماں جو کئی روز سے چارپائی پر پڑی کھانس رہی تھی بھلا بستر سے اٹھ کر باہر کیسے جاتی گھنٹیوں کی یہ سریلی آواز ایک عرصہ کے بعد اس بستی کی فضا میں گونجی تھی۔ اس لئے ہر کوئی یہ جاننے کے لئے بے تاب تھا کہ بیجانگر کے راستے پر کس کی سواری آ رہی ہے۔

اچانک بڈھے کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔

"ارے سکھ دیو! اگر یہ راجکمار حسن کی سواری ہوئی تو؟"

سواری شہزادے کی ہو یا کوئی قافلہ ہر حال میں بڈھے سکھ دیو کو اس کا حال معلوم کرنا ضروری تھا وہ اس بستی کا مکھیا تھا۔ سردار! اور اس کا فرض تھا کہ مسافروں کی دیکھ بھال

کرے۔ مہمانوں اور مسافروں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے سلطان عالی کے احکام بڑے سخت تھے۔ بڈھا ایک لمحہ کے لئے کانپ گیا۔ پھر ایک ہاتھ کمر پر رکھے اور دوسرے ہاتھ میں مٹی کا دیا لئے وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ ابھی وہ دروازے پر ہی تھا کہ اسے کئی سائے اندھیرے میں شاہراہ کی طرف بھاگتے ہوئے نظر آئے مندر کے آس پاس بھی کچھ سائے متحرک تھے اور بوڑھا مہنت ابھی تک اینٹوں کی دیوار سے سر ابھارے قافلے کا انتظار کر رہا تھا۔ سکھ دیو دیا لے کر جھونپڑی سے باہر نکلا تو مندر کی دیوار کے آس پاس تھرکنے والے سائے اس کی طرف کھسکنے لگے۔

''جے رام جی کی۔ کھیا کاکا!''

سکھ دیو نے آنے والوں میں راموں دھوبی کی آواز پہچان لی اور دیئے کی تھرتھراتی لو پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے بولا۔

''رامو بھیا یہ کس کی سواری آ رہی ہے؟''

''کا کھیر کھیا کاکا! مجھے تو قافلہ جان پڑے ہے۔''

''پر بیجانگر کے رستے کون سا قافلہ آوے ہے؟''

''بھگوان ہی جانے۔''

اتنے میں گھنٹیوں کی آوازیں قریب سنائی دینے لگیں اور قافلہ گھنے درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کے آگے ایک مشعل بردار سوار تھا۔ جس کے نیزے کا پھل مشعل کی زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس روشنی میں لوگ ایک عالیشان بیل گاڑی کو دیکھ کر ٹھٹک سے گئے تھے جس پر ایک گول چتر سایہ فگن تھا۔ گاڑی میں چار سفید بیل جتے ہوئے تھے۔ جن پر سرخ ریشم کی چادریں جھول رہی تھیں۔ بیلوں کے گلے میں چاندی کی گھنٹیاں بندھی تھیں ان کے سینگوں پر سونے کے خول چڑھائے گئے تھے اور پاؤں میں کانسی کی جھانجھنیں تھیں بیلوں کی رفتار کے ساتھ چاندی کی گھنٹیاں اور کانسی کی جھانجھنیں ایک عجیب موسیقی پیدا کر رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے آکاش کی اپسرائیں فضاؤں میں رقص کے جادو بکھیر رہی ہیں۔

بیل گاڑی کے آگے اور پیچھے چار چار سوار تھے جن کے گھوڑوں کا رنگ سرخی مائل تھا۔ سواروں نے بیجانگر کے شاہی دستہ کی وردیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ لوگ اس سواری کو

یکھ کر حیران وششدر رہ گئے۔

"یہ تو کسی مہاراج کی سواری ہے۔"

بوڑھے مکھیا کے خشک ہونٹ پھر کانپے۔

"پر یہ کون مہاراج ہووے؟" راموں دھوبی کی آواز بھی ڈوب گئی۔

مکھیا اس سوچ میں تھا۔ دکن میں بھلا کون بیل گاڑی پر سفر کر سکتا ہے؟ یہاں بہمنوں کی حکومت ہے اور ان کی عورتیں بھی مردوں کی طرح گھوڑوں کی سواری کرتی ہیں۔ پھر یہ کون ہے؟ کہیں بیجانگر کا راجہ دیورائے تو راستہ بھول کر ادھر نہیں آ گیا۔

بیل گاڑی مندر کے پاس آ کر رک گئی اور لوگ اس کے آس پاس اکٹھے ہونے لگے۔ سکھ دیو خود چل کر دیکھنا چاہتا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ ابھی اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ گوری بھاگی بھاگی آئی اور آتے ہی چلانے لگی۔

"بابا گورو دیو آئے ہیں۔ گورو دیو۔"

"گورو دیو......"

"ہاں بیجانگر کے گورو گورکھ ناتھ! یہ سواری انہی کی ہے۔"

گوری نے بیل گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ سکھ دیو نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ واقعی گورکھ ناتھ مخملیں چتر کے نیچے بیٹھا لوگوں کے پرنام کا جواب دے رہا تھا پھر ایک لڑکی لوگوں کو چیرتی ہوئی بیل گاڑی کے پاس آئی اور اچھل کر گاڑی پر چڑھ گئی۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ گورکھ ناتھ کے چرن چھوئے اور گورکھ ناتھ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد دی۔ وہ لڑکی پرتھال کے سوا اور کوئی نہ تھی۔

بھگوان کی لیلا

گورکھ ناتھ کیا آیا۔ لکھپت سنار کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب اُس کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا "بھگوان! تیری لیلا نیاری ہے۔"

کہاں تو بوڑھا سنار رائے نند کمار چوہان کے ہاتھیوں کے سامنے ساری خدائی کو ہیچ سمجھتا تھا اور اُسے یہ صدمہ کھائے جا رہا تھا کہ پرتھال نے چوہان سردار کو انکار کر کے ایک بہت بڑی غلطی کی ہے جس کی سزا اُسے ضرور بھگتنی پڑے گی اور کہاں اب اس کے

دروازے کے باہر بیجانگر کے مہاراج دیورائے کی خاص سواری کھڑی تھی۔ یہی نہیں بلکہ
سلطنت بیجانگر کا راج گورو شاہی خاصہ کے سواروں کے ہمراہ اس کا مہمان تھا۔ واقعی بھگوان کی
لیلا نیاری تھی۔

سنار کو اس بات کا خوف تھا اگر رائے نند کمار نے طیش میں آکر اس پر حملہ کر دیا......
پرتھال کو زبردستی اٹھا لے جانے کی کوشش کی تو وہ غریب کیا کر سکے گا۔ اس قسم کی باتیں
سوچتے وقت وہ یہ بات بھول جاتا تھا کہ اس کے پاس دکن کے ولی عہد شہزادہ حسن کا خاص
پروانۂ راہداری موجود ہے اور وہ جب چاہے شہزادہ کو اپنی بپتا سنا کر شاہی امداد حاصل کر سکتا
ہے لیکن پنڈت گورکھ ناتھ کے آتے ہی جیسے وہ دنیا جہاں کے تمام دکھ اندیشے اور وسوسے
بھول گیا تھا۔ اب اُسے احساس ہوا لکھپت سنار کوئی معمولی آدمی نہیں۔ بھلا جس کی حویلی
میں بیجانگر کے مہاراج کی شاہی سواری کھڑی ہو۔ وہ کوئی معمولی آدمی ہو سکتا ہے؟

"ہرگز نہیں۔"

اگرچہ پنڈت گورکھ ناتھ نے ابھی تک اپنی اچانک آمد کا مقصد بیان نہیں کیا تھا لیکن
لکھپت دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ یقیناً کوئی خاص مقصد ہو گا۔ تبھی پنڈت گورکھ
ناتھ...... نہیں...... نہیں...... پنڈت گورکھ ناتھ کیوں...... اب وہ پنڈت تھوڑے ہیں لیکن
میری زبان بھی بڑی کتیا ہے۔ یونہی بھونکے جاتی ہے۔ ابے لکھپت کے بچے! اب تو انہیں
راج گورو کہو۔ راج گورو...... ہاں بھئی! راج گورو، مہاراج دیورائے کے بعد بیجانگر کے
سب سے بڑے آدمی۔ جن کے اشارے پر یہ ایک نند کمار کیا اگر ایک سو ایک نند کمار بھی
ہوں تو ہاتھیوں سمیت سب غائب غلہ کر دیئے جائیں۔ آیا ہے بڑا رائے نند کمار چوہان کہیں کا۔
اس چوہان کو بھی دیکھا جائے گا لیکن لکھپت! تُو نے کچھ سوچا یہ راج گورو! شاہی سواری
لے کر اچانک کیوں آدھمکے؟ آخر کوئی بات تو ہو گی لیکن وہ بتاتے کیوں نہیں۔ کیوں آئے
ہیں۔ کیا لینے آئے ہیں؟ اگر کوئی خاص بات ہے تو انہیں بیان کرنی چاہئے۔ کیا کہا۔ ابھی
آئے ابھی آٹھ پہر تو ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی کیوں بتائیں؟ جب اطمینان سے بیٹھیں گے
حرف مطلب زبان پر لائیں گے۔ میری سنیں گے اپنی سنائیں گے مگر تو بھی کیسا بے
ہے۔ ارے خاص کاموں کے لئے خاص وقت ہوتے ہیں۔ بدھو! کیا اب بھی کچھ سمجھے
نہیں؟

اچھا بھئی! راج گورو اپنی مرضی سے آئے ہیں اور اپنی مرضی ہی سے آنے کا مقصد بھی بتائیں گے۔ میں خواہ مخواہ پوچھنے والا کون۔ چلو چھٹی ہوئی لیکن یہ پرتھال بھی تو سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ کم بخت دو گھڑی کے لئے کہیں ان کا پیچھا چھوڑے تو بے شرم ہو کر پوچھ ہی لیتا۔ راج گورو! خیریت تو ہے بیجانگر سے اتنی جلدی کیوں لوٹ آئے؟ آخر یہ ایک بات پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟

آپ ہی آپ لکھپت نہ جانے کیا کیا سوچتا اور بڑبڑاتا پھرا۔ صبح جب پرتھال اپنے گورو دیو کے ہاتھ دھلوا رہی تھی۔ سنار کے جی میں آئی پرتھال کے ہاتھ سے پانی کا برتن چھین لے اور ہاتھ دھلوانے کے بہانے ہی آنے کا مقصد پوچھ لے لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر خاموش رہا اور باہر صحن کی طرف چل دیا۔ جہاں چتر سے آراستہ گاڑی کھڑی تھی۔ گاؤں کے مرد عورتیں بچے بالے بھی تو اس سواری کو دیکھنے کے لئے آئے تھے اور ساری بستی میں گھر گھر یہی چرچا تھا۔ لکھپت سنار کے گھر مہاراج دیورائے کی سواری آئی ہے۔ اسی احساس نے لکھپت کو جیسے پاگل کر دیا تھا اور وہ بار بار گھر سے باہر نکل جاتا تھا تاکہ لوگ اسے دیکھیں اور اس کے متعلق باتیں کریں۔ کہیں:۔

”کہو لکھپت چاچا! تم بھی بیجانگر جا رہے ہو نا؟ سنا ہے مہاراج دیورائے نے تمہارے ہی لئے اپنی خاصی سواری بھیجی ہے۔“

اور لکھپت جواب میں کہے۔

”ہاں بھئی! راجوں مہاراجوں کی بات کون ٹالے۔ راجہ نے بلایا ہے تو جانا ہی ہو گا۔“

ان ہی خوش کن تصورات میں کھویا ہوا وہ بمشکل دروازے تک گیا تھا کہ اسے راج گورو کی آواز سنائی دی۔ ”ٹھہرو لکھپت بھیا! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

لکھپت کے پاؤں جہاں تھے وہیں رُک گئے اور وہ انہی قدموں پلٹ گیا۔ اس کے من میں جیسے لڈو پھوٹنے لگے آخر وہ راج گورو کی زبان سے یہی فقرے سننے کے لئے تو بے تاب تھا خوشی کے مارے اسے اپنے پاؤں بہت ہلکے محسوس ہونے لگے جیسے وہ آپ سے آپ فضا میں اڑ جانا چاہتے ہوں۔ اچانک اسے ایک ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے دل میں سوچا۔ ”ارے لکھپت ایسی خوشی بھی کیا۔ ذرا دیکھ بھال کے چل۔“

ہاتھ دھونے کے بعد راج گورو کمرے میں آیا اور ایک کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جس کے پٹ باغیچہ کی طرف کھلتے تھے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لکھپت اس کے قریب ہی کھڑا تھا جیسے اس کے کسی حکم کا منتظر ہو۔

''لکھپت تمہیں یاد ہو گا جب میں یہاں پر تھال کو سنگیت وڈیا سکھایا کرتا تھا۔ تم بار بار مجھ سے ایک سوال پوچھا کرتے تھے؟''

''یاد ہے مہاراج!''

''اور تمہیں یہ بھی یاد ہو گا۔ جب میں نے بیجانگر کے لئے رخت سفر باندھا تو جاتے جاتے کیا کہا تھا؟''

لکھپت سوچ میں پڑ گیا۔ کہ بیجانگر جاتے سے پہلے انہوں نے کون سی انوکھی بات کہی تھی۔ جب اسے گزشتہ بات یاد نہ آسکی تو بولا۔

''میں بھول گیا ہوں راج گورو!''

ایک کنیا کے باپ کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے؟'' گورو کہنے لگا۔

''خیر مجھے یاد ہے۔ میں نے کہا تھا۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے لکھپت! تم نے جو سوال مجھ سے کیا تھا۔ ابھی اس کے جواب کا وقت نہیں آیا۔ کچھ دیر اور انتظار کرو۔''

''ہاں مجھے یاد آ گیا۔ آپ نے یہی کہا تھا۔''

گورکھو ناتھ نے تیز نگاہوں سے لکھپت کی طرف دیکھا پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر بولا۔

''تو سنو! اب تمہارے سوال کے جواب کا وقت آ گیا ہے۔''

''مہاراج!''

''میں تمہارے لئے خوشی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔''

لکھپت کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی اچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ وہ سننا چاہتا تھا۔ راج گورو اُس کے لئے خوشی کا کیا پیغام لے کر آئے ہیں۔ اس نے اپنی سوالیہ نگاہیں گورو کے چہرے پر گاڑھ دیں گویا جواب کا منتظر تھا۔ گورو نے اپنا منہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

''تمہیں اپنی بیٹی کے [illegible] لئے کوئی بھی رشتہ منظور کر لینے

تیار تھے لیکن میں نے پرتھال کے ماتھے پر ایک خاص چمک دیکھی تھی اور اسی دن سے میں سمجھ گیا تھا یہ خوبصورت موتی کسی راج مکٹ کی زینت بنے گا۔ بیجانگر پہنچ کر میں نے مہاراج دیورائے کے سامنے پرتھال کے حُسن کی تعریف کی۔ وہ بے تاب ہو گیا اور اپنی خاص سواری دے کر مجھے فوراً ادھر روانہ کر دیا۔ سو میں پرتھال کو بیجانگر کی رانی بنانے کے لئے لینے آیا ہوں لکھپت۔"

"مہاراج! فرطِ مسرت سے لکھپت کی چیخ نکل گئی پھر وہ جلدی سے گورو کے چرنوں میں بیٹھ گیا اور بولا۔ "یہ سب آپ کی کرپا ہے راج گورو!"

میرے قدموں سے اٹھو لکھپت! اب تم ایک راجہ کے سسر بننے والے ہو تمہیں اپنا مقام پہچاننا چاہیے۔"

"لیکن مجھے آپ کے چرنوں میں بیٹھنے سے آنند ملتا ہے۔"

"نہیں میرے چرن اس قابل نہیں۔" گورکھ ناتھ نے اسے شانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ "کہو تمہیں تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں؟"

"سورج ریت کے ایک ذرے پر مہربان ہو جائے تو کیا ذرے کو اس مہربانی پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"تو اب صرف پرتھال سے پوچھنا باقی رہ گیا۔"

"وہ انکار نہیں کرے گی۔ اسے صرف آگیا کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے وہ مجھے اپنا گورو دیو مانتی ہے پھر بھی اس سے پوچھنا ضروری ہے۔" پھر اس نے صندل کا سرخ صندوقچہ لکھپت کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے مہاراج؟"

"دلہن کے لئے مہاراج دیورائے کا پہلا تحفہ!"

لکھپت نے صندوقچہ کھول کر دیکھا۔ تو دنگ رہ گیا۔ ہیرے جواہرات سے مرصع گلوبند اور انگوٹھی کی چمک نے اس کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔ وہ سنار تھا اور اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور بنائے تھے لیکن ایسی تراش خراش اس نے آج تک نہ دیکھی تھی پھر ہیرے، جواہرات، لکھپت کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ پنڈت گورکھ ناتھ نے کہا۔

"مجھے کل واپس جانا ہے۔ مہاراج انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم پرتھال کا سامان تیار

کر دو۔ میں آج ہی اس سے بات کروں گا۔"

یہ کہہ کر راج گورو کمرے سے نکل گیا اور وفورِ مسرت سے لکھپت نے زیورات کا صندوقچہ اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ بھی اچھا ہوا پرتھال نے رائے نند کمار سے رشتہ منظور نہیں کیا۔ ورنہ مہاراج دیورائے کے پیغام کا افسوس زندگی بھر رہتا۔ اب میری بیٹی سچ مچ رانی بنے گی، اپنے راجہ کے ساتھ راج سنگھاسن پر بیٹھے گی۔ وہ بیجانگر میں راج کرے گی۔ سب لوگ اسے "رانی پرتھال" کہہ کے پکاریں گے۔ "رانی پرتھال" واہ بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔"

سارا دن انہی تصورات میں گزر گیا۔ جب لکھپت نے اپنی بیوی کو راج گورو کی آمد کا مقصد بتایا اور کہا کہ پرتھال بیجانگر کی رانی بنے گی تو خوشی کے مارے بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ وہ بولی۔

"بھگوان تیرے بھید انوکھے ہیں۔ تیری لیلا نیاری ہے۔"

یادوں کے خنجر

شام کے جھٹپٹے میں جب دھرتی پر اندھیروں کے سانپ رینگنے لگے۔ لکھپت خوشی میں جھومتا ہوا پنڈت گورکھ ناتھ کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ پرتھال کا سامان تو تیار کر دیا گیا ہے لیکن میرے لئے کیا آگیہ ہے؟ بیجانگر دیکھنے کو میرا جی چاہ رہا ہے۔ اگر مجھے بھی ساتھ لے چلیں تو من کی ایک کامنا پوری ہو جائے گی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا۔ راج گورو کا سامان بندھا پڑا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک اتھاہ غم کروٹیں لے رہا تھا۔ چہرے کی جھریاں حیرت انگیز طور سے نمایاں ہو چکی تھیں اور وہ معمول سے زیادہ بوڑھا، کمزور اور نحیف دکھائی دے رہا تھا۔ صرف آٹھ پہر کے اندر اس میں ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی حالانکہ صبح وہ ہشاش بشاش اور بے فکر نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر رونق اور تازگی تھی...... مگر اب وہی صورت ایک مرجھائے پھول کی طرح پژمردہ اور اداس نظر آ رہی تھی۔

اس کا کھردرا بے رنگ چہرہ دیکھ کر لکھپت کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے احساس کو ہتھوڑی کی ہلکی سی ضرب سے مجروح کر دیا ہو۔

''راج گورو!'' لکھپت کے لبوں پر کپکپاہٹ طاری ہوئی۔

بھگوان کی لیلا بڑی نیاری ہے لکھپت!'' بوڑھا گورو اداس لہجے میں کہنے لگا۔''میں جانتا ہوں میرے چہرے پر لکھی کی سیاہی دیکھ کر تم پریشان ہو گئے مگر قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟

راج گورو کی باتوں نے سنار کو ایک عجیب سے مخمصے میں ڈال دیا۔''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا مہاراج!''

''میرے چہرے پر قسمت کا لکھا پڑھ لو۔ زبان سے کیا بیان کروں۔ میری پریشانی ہیں کرتم بھی بڑھاپے سے نفرت کرنے لگو گے۔''

''آپ کی اداسی اور پریشانی نے مجھے فکر مند کر دیا ہے۔ کیا میں آپ کی کوئی سیوا نہیں کرسکتا؟''

''لکھپت! میں کیا کیا امیدیں لے کر آیا تھا۔ لیکن ناکام واپس جارہا ہوں۔''

راج گورو کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی لکھپت کے دل پر ایک زبردست دھکا لگا۔ ''تو کیا پرتھال نے انکار کر دیا؟'' لکھپت کے لہجے میں اضطراب، غم اور غصہ کی ملی جلی کیفیت تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اچانک زرد ہونے لگا تھا...... ''مجھے بتایئے۔ اس نے کیا جواب دیا؟''

''میں یہاں راج گورو بن کے آیا تھا۔ پرتھال نے پھر مجھے گورکھ ناتھ بنا دیا ہے۔ اس نے میرے چہرے سے دیورائے کی سیاہ مصلحتوں کے پردے ہٹا کر مجھے میری اصل صورت دکھائی ہے۔ اب میں اپنی اسی صورت کے ساتھ بیجانگر کی طرف لوٹ رہا ہوں۔''

''تو اس نے مہاراج دیورائے کا سندیس بھی منظور نہیں کیا؟''

لکھپت کے لہجے میں غصہ کی چنگاریاں اڑنے لگی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے اندر اچانک کوئی الاؤ دہک اٹھا ہے۔ اس نے راج گورو کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''مجھے صاف صاف بتایئے راج گورو! وہ بیجانگر کی رانی کیوں نہیں بننا چاہتی؟ میں اشاروں کی زبان نہ سمجھ سکوں گا۔''

''تو پھر سنو......'' گورکھ ناتھ مدھم آواز میں کہنے لگا۔''وہ کہتی ہے میں آپ کے لئے جیون تیاگ سکتی ہوں لیکن بیاہ نہیں کر سکتی کیونکہ میرا سنجوگ ہو چکا ہے۔''

سنجوگ ہو چکا ہے؟"

بوڑھا سنار نفرت و حقارت کے ساتھ چلایا..... "بھلا ماتا پتا کی مرضی کے بغیر کسی کنیا کا سنجوگ ہوا ہے؟ اس کے بیاہ کی بات کس نے چھیڑی؟ اس کے ہاتھوں پر سہاگ کی مہندی کب رچی؟ اس کی مانگ میں سندور کس نے بھرا؟ ماتھے پر بندیا کس نے لگائی؟ دولہا کب آیا؟ شہنائیاں کب بجیں؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ راج گورو! وہ جھوٹ کہتی ہے۔ مہاراج دیورائے کا سندیس ٹھکرا کر موت کے سوا اس کا سنجوگ اور کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ میں اتنی مدت چپ رہا ہوں مگر اب میری زبان خاموش نہیں رہے گی۔ دو باتوں میں اسے ایک ضرور قبول کرنا ہوگی مہاراج دیورائے یا اپنی موت۔ میں ابھی فیصلہ کیے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر سنار انتہائی غصے کی حالت میں دروازے کی طرف لپکا مگر راج گورو کی آواز سن کر اس کے قدم دہلیز پر ہی جم کے رہ گئے۔

"لکھپت واپس آ جاؤ۔ پرتھال کو ہاتھ لگانے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ وہ ایک ایسی شاخ ہے جو ٹوٹ سکتی ہے مگر لچک نہیں سکتی۔"

"جو شاخ اپنے درخت کو پہچاننے سے انکار کر دے اسے ٹوٹ ہی جانا چاہیے۔" سنار نے پلٹ کر راج گورو کی طرف دیکھا اور غصہ میں تھرتھراتے ہوئے بولا۔ "اس نے صرف میرا پیار دیکھا ہے وہ غصہ نہیں دیکھا جو اسے سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح جلا کر بھسم کر دے گا۔ وہ لکھپت سنار کی بیٹی ہے۔ اسے اپنے باپ کا کہا ماننا ہی پڑے گا۔"

"زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ لکھپت! میں نے اسے سمجھا کے دیکھ لیا مگر اس کا بھید نہ پا سکا۔ وہ ساگر کی مانند گہری اور چشمہ کے پانی کی طرح شفاف ہے۔ تم بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"آپ کا مطلب ہے گھر میں آگ لگے اور میں اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لوں تاکہ شعلے میرے شریر کو پھونک ڈالیں۔"

"پگلے! پرتھال آگ نہیں۔ وہ پھول ہے جو سارے باغ کی شوبھا ہے۔ ساز کے پردوں میں چھپا ہوا وہ راگ ہے جس کے سُر آتما کو جیون کی شکتی عطا کرتے ہیں۔ اس کے گلے میں سرسوتی کا نواس ہے۔ اگر تم نے اپنے من کی بات کرنا چاہی تو یاد رکھو سب کچھ

جیسے ستار ٹوٹ جائے گا۔ گیت مر جائیں گے اور تم خود اندھیروں میں بھٹکتے پھرو گے۔

گورو نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ بوڑھے ستار کا دل جذبات کی آنچ پر پگھلتا جا رہا تھا۔ اس نے منہ پھیر کر اپنے آنسو چھپا لئے جو آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کی سخت کھال پر ہولے ہولے پھسل رہے تھے۔

''دل چھوٹا نہ کر لکھپت! تمہیں تو ایسی بھاگوان بیٹی پر مان کرنا چاہیے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا گورو دیو!'' اس نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک عجیب مصیبت میں الجھ کے رہ گیا ہوں۔ میں جب بھی اس کے جیون کی ڈور سیدھی کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی نیا پیچ آ پڑتا ہے۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ سوچا تھا اس کے ہاتھ پیلے کر کے اپنے چاؤ پورے کروں گا۔ پر ایسا لگتا ہے میری یہ آس کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔''

''آدمی کو نراش نہیں ہونا چاہیے لکھپت! مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے۔ پرتھال رانی نہیں مہارانی بنے گی۔ اس کے ماتھے پر......''

گورو گورکھ ناتھ نے ابھی اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ پرتھال کانسی کے ایک تھال میں کسی شے پر رومال رکھے نمودار ہوئی اور اپنے باپ کو راج گورو کے پاس دیکھ کر ٹھٹک سی گئی پھر اس نے بوڑھے کے چہرے پر آنسوؤں کی دھار دیکھی جو خشک ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ کے اندر وہ معاملے کی تہہ کو پہنچ گئی۔ بیٹی کا انکار باپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بن کر پھوٹ نکلا تھا۔

''آؤ بیٹی!'' گورکھ ناتھ پرتھال سے مخاطب ہوا۔ ''باہر کیوں کھڑی ہو گئی...... میں تیرے بابا کو تیری ہی بابت سمجھا رہا تھا۔''

پرتھال دھیرے سے اندر داخل ہوئی اور ہولے ہولے چلتی اپنے باپ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''بابا! تمہاری آنکھوں میں آنسو؟''

ستار نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کرتے کے دامن سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ پرتھال قریب جا کر بولی۔

''کیا مجھ سے روٹھ گئے ہو؟''

لیکن اس مرتبہ بھی باپ نے کوئی جواب نہ دیا اور کھڑکی سے باہر خلا میں گھورنے لگا۔

پرتھال گورو دیو سے مخاطب ہوئی۔

''میں جانتی ہوں بابا مجھ سے دکھی ہیں۔ بہت دکھی ہیں۔ میں نے آج تک ان کی کوئی بات نہیں مانی۔ مگر میں کیسے بتاؤں کہ جیون میرا نہیں پھر اس کا سودا کیوں کر ہو سکتا ہے۔''

''سودا؟'' سنار طیش سے بولا۔ ''تو تو یہی سمجھتی ہے میں تجھے بیچنے کی فکر میں ہوں۔ تیری قیمت وصول کر کے اپنا گھر بھرنا چاہتا ہوں۔ تجھے بکاؤ مال سمجھتا ہوں۔''

''بابا......''

''اسی لئے تو میرے بوڑھے بالوں پر مٹی اچھال رہی ہے۔''

''لکھپت! ہوش میں رہو...... باپ کو جوان بیٹی کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

گورکھ ناتھ کی زبان سے یہ فقرہ سن کر بوڑھے سنار نے شرم کے مارے اپنا سر جھکا لیا اور بولا۔ ''راج گورو! یہ جانتی ہے میں نے اسے کتنے لاڈ پیار سے پالا ہے۔ اسے دیکھتے ہی مجھے سنسار کے سارے دکھ بھول جاتے رہے لیکن آج مجھے میرے پیار کا کیا صلہ مل رہا ہے؟ انکار نراشا...... اس سے تو اچھا تھا میں بے اولاد ہی رہتا۔ میرے باغ میں یہ پھول نہ کھلتا جس کے کانٹے میرے ہاتھوں کو لہولہان کر رہے ہیں۔''

''بابا! تم سمجھ رہے ہو۔ شاید بیٹی اپنے باپ کا حق بھول گئی ہے لیکن میں ان بیٹیوں میں سے نہیں جو ماتا پتا کی عزت کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ اور ان کا حق بھول جاتی ہیں۔ تم چاہو تو اپنے ہاتھ سے مجھے لہو میں غسل دے سکتے ہو۔ مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا سکتے ہو۔ چتا میں زندہ جلا سکتے ہو۔ اگر میری زبان سے شکایت کا ایک لفظ بھی نکل جائے تو میرے منہ پر تھوک دینا۔''

یہ کہہ کر پرتھال نے کانسی کے تھال پر دیا ہوا رومال پرے پھینک دیا۔ راج گورو اور لکھپت یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تھال میں ایک تیز خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے تھال باپ کی طرف بڑھا دیا اور بولی۔

''خنجر حاضر ہے بابا! میں بھی تمہارے سامنے ہوں۔ لٹتی ہوئی عزت بچانے کی خاطر غیرتمند باپ اپرادھی بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے موت کی نیند سلا دیا کرتے ہیں۔ تمہارے

دیک اگر میں نے بھی کوئی پاپ کیا ہے تو اپنے ہاتھ سے مجھے سزا دے لوتا کہ لوگ جان
ئیں لکھپت سنار آن رکھتا تھا۔ اس نے بیٹی کا بلیدان دے کر اپنی آن بچا لی ہے۔ بیٹی
س سے زیادہ باپ کی اور کیا سیوا کر سکتی ہے؟ بابا خنجر اٹھاؤ، اور میری چھاتی میں اتار دو۔
ں تمہیں دکھی کر کے جینا نہیں چاہتی۔"

بوڑھے باپ نے حیرت و استعجاب کے ساتھ بیٹی کی یہ باتیں سنیں۔ کبھی وہ تھال میں
تے ہوئے خنجر کو دیکھتا اور کبھی پر تھال کے چہرے پر نگاہ گاڑھ دیتا جو آنکھیں بند کیے بڑے
مینان کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔ بیٹی کی یہ جرأت اور سعادت دیکھ کر باپ کے بوڑھے
سم پر ایک کپکپی سی طاری ہوئی پھر جیسے اچانک دریا کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ لکھپت کے دل
ں بیٹی کی محبت کا سویا ہوا چشمہ یکلخت پھوٹ نکلا۔ اس نے آگے بڑھ کر پر تھال کو اپنے
ینے کے ساتھ لگا لیا اور اشکوں میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"بیٹی! باپ کتنا ہی ظالم اور کٹر کیوں نہ ہو۔ اس کا ہاتھ کبھی اپنی بیٹی پر نہیں اٹھ سکتا۔
ں نہیں جانتا تیرے من میں کیا ہے۔ تو کیا چاہتی ہے لیکن آج کے بعد میں تجھ سے کبھی
یسا سوال نہیں کروں گا۔ تیرے جی کو جو بات اچھی لگے وہی کر۔ میں تو صرف تیری خوشیاں
یکھنا چاہتا تھا۔ اگر تو اسی طرح خوش ہے تو بھی مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

"بابا! تمہاری بیٹی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جو اس کے بوڑھے باپ کے ماتھے پر
لنک کا ٹیکہ بن جائے۔ میں جان دے دوں گی پر تمہاری آن پر حرف نہ آنے دوں گی۔
س بات کا اطمینان رکھو۔"

گورو گورکھ ناتھ ایک طرف الگ کھڑا باپ بیٹی کے اس دلگداز ملاپ کو دیکھ رہا تھا۔
دونوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے لیکن پانی کے یہ شفاف قطرے گنگا جل سے
یادہ پوتر، زیادہ قیمتی اور زیادہ مؤثر تھے۔ رخساروں پر بہتے ہوئے یہ موتی لبوں کے
تھرتھراتے ہوئے کناروں میں جذب ہو رہے تھے۔ راج گورو کے جسم پر ایک لرزش سی
طاری ہوئی۔ اس نے باپ کی شفقت اور بیٹی کے پیار کا ایسا نظارہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا
چانک اُسے اپنی بے گناہ اور مقدس بیٹی روشی کا خیال آیا۔ بیجانگر کے آشرم کی حسین
یوداسی، سندرتا، ناچ اور سنگیت کی راجکماری اور بوڑھے گورکھ ناتھ کے سینے میں ایک ساتھ
یادوں کے کئی خنجر اتر گئے پھر اس کی خشک آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے بیٹی کی

پرتھال جب لکھپت سے الگ ہوئی تو اس نے دیکھا راج گورو کا گریبان بھیگ چکا تھا اور اس کے ہونٹوں کے کنارے ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ باپ سے ہٹ کر وہ اپنے گورو دیو کے ساتھ آ گئی اور بولی "گورو دیو! آپ بھی مجھ ابھاگن کو شما کریں۔"

گورو گورکھ ناتھ نے اپنے دونوں ہاتھ پرتھال کے سر پر رکھ دیئے اور کپکپائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"بیٹی! دوشی کے بے گناہ خون کا بدلہ لینے کے لئے میں تجھے بیجانگر کی رانی بنانا چاہتا تھا لیکن تو پوتر ہے...... گنگا کی موج ہے۔ جمنا کی لہر ہے اور مہاراج دیورائے تیرے پاؤں کی دھول بھی نہیں۔"

پرتھال نے کانسی کے تھال سے چمکدار خنجر اٹھایا اور اسے ہونٹوں سے بوسہ دے کر بولی...... "گورو دیو! آپ کے آنسوؤں کی سوگند، دیورائے سے دوشی کے خون کا انتقام ضرور لیا جائے گا اور پھر کوئی دوشی، کوئی دیوداسی، کوئی کنواری بیجانگر کے راج رنواس میں نہیں لٹ سکے گی۔"

پھر اس نے خنجر گورکھ ناتھ کی طرف بڑھا دیا۔ "میری طرف سے یہ خنجر مہاراج دیورائے کو پیش کیجئے اور کہیے گا۔ یہ خنجر ہی آپ کے سندیس کا جواب ہے۔"

گورکھ ناتھ نے خنجر تھام کر اسے اپنی کمر میں اڑس لیا۔ لکھپت حیران و ششدر کھڑا گورکھ ناتھ اور پرتھال کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان دوشی کے انتقام کا یہ عجیب و غریب عہد آخر کیا راز ہے؟ مگر اس نے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا کہ بیاہ کے سندیس کے جواب میں پرتھال کا مہاراج دیورائے کو ایک عریاں خنجر بھیجنا کسی مصلحت سے خالی نہیں۔

بوڑھا سنار انہیں خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے گورکھ ناتھ کی آواز سنائی دی۔ وہ لکھپت سے رخصت کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

بھیڑیا غرایا

راج رنواس میں مہاراج دیورائے کی آواز گرجتے ہوئے بادلوں کی سی ہیبت کے

[illegible]
سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ وہ زخمی بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا کمرے کے وسط میں تیز قدموں سے چکر کاٹ رہا تھا اس کے ہاتھوں میں وہ چمکدار خنجر تھا جو پرتھال نے اس کے سندیس کے جواب میں بھیجا تھا۔

طویل راہداری سے پرے بڑے گیٹ پر کرنا ٹکی پہرے داروں نے یہ گرجتی، کڑکتی اور گونجتی ہوئی خوفناک آواز سنی اور سہم گئے۔ بہت جلد کوئی نہ کوئی معرکہ ہونے والا ہے کیونکہ جب بھی دیورائے اپنے راج رنواس میں گرجتا گونجتا تو اس کے فوراً ہی بعد کرنا ٹکی سورماؤں کے دستہ خاص کو کسی نامعلوم سمت روانگی کا حکم ملتا اور کسی نہ کسی علاقے میں جنگی سکھ بجنے لگتے۔ دیورائے کے مشتعل اور غضب آلود لہجے سے دونوں پہرے دار اسی نتیجے پر پہنچے کہ کوئی نہ کوئی بات مہاراج کی توقع اور امید کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ جس نے ان کے مزاج کو برہم کر دیا ہے اور جب تک کوئی فیصلہ کن معرکہ حالات کو ان کی توقع کے مطابق نہیں ڈھال دیتا ان کے مزاج کی برہمی دور نہیں ہو سکتی۔

دیورائے غصہ میں اس زور کے ساتھ کڑکا تھا کہ راج محل کی بالکونی میں لٹکا ہوا طوطا بھی سہم کر پنجرے میں دبک گیا اور اسے "مہاراج کی جے ہو" کی گردان بھول گئی تھی۔ غریب پرندہ بھی شاید اپنے مالک کے مزاج سے واقف ہو گیا اور جانتا تھا اگر اس موقع پر اس نے چونچ کھولی "اور مہاراج کی جے ہو" کا نعرہ لگایا تو ممکن ہے مالک اپنا سارا غصہ اسی پر اتارنے کی کوشش کرے اور اس کی مالا کنٹھ والی گردن مروڑ کر اسے پائیں باغ میں پھینک دے یا محل کی کسی بلی کے آگے ڈال دے۔

راج گورو گورکھ ناتھ چپ چاپ سر نہواڑے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مؤدب کھڑا تھا دیورائے ابھی تک غرا رہا تھا۔ اچانک ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایک مردہ چیتے کے سر پر ٹکایا اور بولا۔

"ایک سنار کی لڑکی اتنی بے باک اور گستاخ بھی ہو سکتی ہے؟ ہمیں اس بات پر یقین نہیں آتا۔ گورکھ ناتھ! کیا اس کے لئے یہ عزت کچھ کم تھی کہ ہم اسے اپنی رانی بنانا چاہتے تھے۔ اس کی خاطر ہم نے اپنی خاص سواری بھیج دی۔ محافظ دستہ کے سوار ہمراہ گئے اور اس نے ہمارے محل کی زینت بننے سے انکار کر دیا۔ نہیں یہ خنجر بھیج کر اس نے ہماری طاقت اور

غیرت کو للکارا ہے۔"

خنجر ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ بار بار الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیز دھار جیسے اس کے کلیجے کو کاٹتی ہوئی نکل گئی تھی۔

راج گورو نے ایک ثانیہ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگایا پھر آہستہ سے بولا۔

"میں نے سنا ہے وہ کہیں بھی بیاہ کے لئے تیار نہیں۔ اس کا بوڑھا باپ سر پیٹ کے رہ گیا لیکن پرتھال کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا اور مجھے نراش لوٹنا پڑا۔"

"ایک لڑکی کے بیاہ کا سندیس لے کر جانا اور نراش لوٹنا یہ کوئی اچنبا نہیں گورکھ ناتھ! حیرت کی بات تو یہ ہے اس نے ہمارے سندیس کے جواب میں ایک خنجر بھیج دیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا وہ ہماری طاقت کو طاقت نہیں سمجھتی۔ کسی لڑکی نے آج تک ایسی جرأت نہ کی ہوگی۔ اپنے بیاہ کے جواب میں موت کا سامان نہ بھیجا ہوگا۔"

دیورائے گرج رہا تھا۔"اس نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ جب تک اسے اس خطرناک مذاق کا جواب نہیں مل جاتا ہمارا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ ہم اس گستاخ لڑکی کو زنجیریں پہنا کر اپنے رتواس میں لائیں گے پھر اسے معلوم ہوسکے گا۔ ایک مہاراج کے ساتھ خنجر کا مذاق کتنا مہنگا سودا ہے۔"

"تو آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"ہم شبخون مار کر اس بستی کو تباہ کر دیں گے جہاں سے ہماری سواری خالی واپس آئی ہے۔"

دیورائے آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا گورکھ ناتھ کے قریب آکھڑا ہوا۔"ہم پرتھال کو پابہ زنجیر اپنی سواری کے ساتھ دوڑا کر بیجانگر تک لائیں گے۔"

گورکھ ناتھ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جیسے وہ مہاراج کے فیصلے پر غور کر رہا ہو۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ سراسر احمقانہ اور جذبات کی رو میں بہہ کر کیا گیا تھا اور اس کے نتائج خطرناک صورت میں بھی ظاہر ہوسکتے ہیں لیکن دیورائے کے اکثر فیصلے اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ایک انتہائی جذباتی اور بہت جلد مشتعل ہو جانے والا انسان تھا۔ جس کا ہاتھ اکثر تلوار کے قبضے پر رہتا تھا۔ اس نے ابھی تک پرتھال کی شکل تک نہ دیکھی تھی بس اس کے حُسن کی تعریف سن کر اس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور اب اس کے انکار نے دیورائے

کے بدن میں جیسے انگارے بھر دیئے تھے وہ چاہتا تھا جس قدر جلد ہو سکے وہ اس دکنی حسینہ کو اپنے حضور میں دیکھے اور اسے بتائے کہ دیورائے جب کوئی فیصلہ کرتا ہے تو خون کی ندیاں بہا کر بھی اس کو پورا کرتا ہے پھر مہاراجہ کے دل میں پرتھال کے دیدار کا شوق بھی پہلے سے دو چند ہو گیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکی کیسی ہے جس نے ایک راجہ کے پیام کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے لیکن راج گورو کو کسی گہری سوچ میں دیکھ کر وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا اور بولا۔

''کیوں گورکھ ناتھ! کیا تمہیں ہمارا فیصلہ پسند نہیں؟''

''پرتھال کا جرم یقیناً ناقابل معافی ہے۔''

گورکھ ناتھ نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''لیکن مہاراج کا فیصلہ غور طلب ہے۔''

''کیا مطلب؟''

دیورائے نے اپنی تیز نگاہیں گورکھ ناتھ کے چہرے پر گاڑھ دیں۔ وہ جانتا تھا بوڑھا ہمیشہ دور کی سوچا کرتا ہے اور واقعات کا صحیح تجزیہ کرنے کے بعد اپنی رائے دینے کا عادی ہے۔ اسی لئے تو اس نے گورکھ ناتھ کو راج گورو ایسے اہم عہدے پر متعین کیا تھا لیکن اس وقت اس کا دماغ اپنے فیصلے کے خلاف کوئی رائے سننا نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھے نے پرتھال کے انکار کا ذکر جان بوجھ کر کچھ اس انداز میں کیا تھا کہ دیورائے مشتعل ہو کر حملہ کا فیصلہ کر دے۔ ظاہر ہے دکن کے علاقہ پر حملہ کرنے کے بعد وہ سلطان فیروز شاہ بہمنی کے قہر و غضب سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا اور دیورائے سے انتقام کا آخری ذریعہ اب یہی تھا......

جنگ!

حملہ کا فیصلہ گورکھ ناتھ کی مرضی کے عین مطابق عمل میں آیا تھا اور وہ خوش تھا کہ عیاش دیورائے کی تقدیر اسے جنگ کے میدان کی طرف گھیر کر لئے جا رہی تھی لیکن راج گورو کی حیثیت سے اس کا فرض تھا۔ وہ مہاراج کو اس فیصلہ کے نتائج سے بھی آگاہ کر دے۔ وہ اپنے فرض سے بھی سبکدوش ہو جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا دیورائے نتائج کی پرواہ نہیں کیا کرتا اور ایک مرتبہ جو فیصلہ اس کی زبان سے الفاظ کا جامہ پہن کر باہر آ جائے وہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔

دیورائے بوڑھے کی خاموشی سے تنگ آ گیا۔ وہ بولا۔

"راج گورو! تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔"

"مہاراج!" وہ ہولے ہولے کہنے لگا۔ "مدگل بہمنی سلطنت کا علاقہ ہے۔ اس پر حملہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا۔ ہم سلطان فیروز شاہ سے جنگ مول لے رہے ہیں۔"

راج گورو کی یہ بات سن کر دیورائے چونک اٹھا جیسے اسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔

"سلطان فیروز شاہ پر ہمارا ایک ادھار باقی ہے۔ ہم چاہتے ہیں اسی بہانے پرانا قرض بھی ادا کر دیا جائے۔ ہم محلوں میں دبک کر بیٹھنے کی بجائے جنگ کے میدانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

گورکھ ناتھ نے گہری نگاہوں سے مہاراج کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گویا وہ اس کے فیصلے سے مطمئن تھا پھر بھی ایک الجھن ابھی باقی تھی۔ وہ چاہتا تھا یہ الجھن بھی دور ہو جائے۔

"مہاراج کو یہ نہیں بھولنا چاہیے۔ اس جنگ کے بعد ہمیں ایک بڑی جنگ لڑنا پڑے گی۔ سلطان فیروز شاہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ بیجانگر کے سوار اس کے علاقہ پر چھاپہ مار کر نکل جائیں اور وہ خاموش بیٹھا رہے۔"

"گورکھ ناتھ!" دیورائے نے اپنے ہاتھ کا خنجر ایک طرف اچھالتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم تو خود سلطان سے پنجہ لڑانے کے لئے بے تاب بیٹھے ہیں۔ ہم اپنی گردن سے ذلت کا وہ جوا اتار پھینکنا چاہتے ہیں جو فیروز شاہ نے چار سال پہلے ہمیں پہنایا تھا۔"

"لیکن سرحدی علاقوں کی دیکھ بھال اب بھی سپہ سالار احمد خاں خانخاناں کی بجائے شہزادہ حسن خاں کے سپرد ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" دیورائے خوشی سے چلایا۔ "جوانی ہمیشہ غافل ہوتی ہے۔ شہزادہ حسن کی غفلت ہماری مددگار ثابت ہوگی اور ہم بہمنی بہادروں کو ناقابل فراموش سبق دے سکیں گے۔"

"تو بس پھر حملہ کی تیاری کیجئے۔"

"اس مہم میں تم ہمارے ساتھ رہو گے۔" دیورائے نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "ہم کل ہی

"مہاراج کی جے ہو۔" گورکھ ناتھ نے چلتے ہوئے کہا اور دیوانے کو پرنام کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

اچانک بالکونی کی طرف سے باریک آواز سنائی دی۔ "مہاراج کی جے ہو۔"

یہ طوطے کی آواز تھی۔ جسے سنتے ہی دیوانے کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی پھر اس نے خنجر اٹھایا اور اسے سامنے چوبی دروازے پر دے مارا۔

"پرتھال اسی دروازے سے ہمارے محل میں داخل ہوگی۔" وہ بڑبڑایا...... پھر نہایت تیزی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اچانک اس کے پاؤں رُک گئے۔ سامنے راج کماری چندر کلا کھڑی تھی۔

"تو مہاراج نے جنگ کا فیصلہ کیا ہے؟" چندر کلا نے پوچھا۔

"بیٹی! پرتھال نے بیاہ کے جواب میں ہمیں خنجر بھیجا ہے۔ ہم صرف اس کا خنجر آزمانے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا اور چندر کلا دیکھتی ہی رہ گئی۔

❁❁❁

4

آتش و خون کے ہنگامے

خون کی ہولی

دیورائے نے مدگل کو بہت پرے چھوڑ کر ایک پایاب جگہ سے دریائے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور اپنے سواروں کا رخ پرتھال کی بستی کی طرف پھیر دیا۔ اس کے گھوڑے پر زنجیریں بھی لٹک رہی تھیں۔ جن میں وہ پرتھال کو باندھ کر لانا چاہتا تھا۔

دیورائے ایک خطرناک ارادہ لے کر دکن کے سرحدی مضافات پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا سلطان فیروز شاہ بہمنی جس کے جاہ و جلال اور قوت سے پورا ہندوستان لرزہ براندام ہے حملہ کی خبر سن کر خاموش نہیں رہ سکے گا اور جذبات کی آگ اس کے تدبر کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ وہ مشتعل ہو کر یقیناً سامنے آئے گا چنانچہ اس حملہ کو روکنے کے لئے اس نے بیس ہزار فوج دریائے تنگ بھدرا کے اس پار پھیلا دی تھی تاکہ جب بہمنی سوار دیورائے کا تعاقب کرتے ہوئے سرحد پر پہنچیں تو انہیں نیزوں اور تیروں کی باڑھ پر رکھ لیا جائے۔ بیس ہزار کرناٹکی جانباز پیچھے چھوڑ کر وہ صرف پانچ ہزار سواروں کے ہمراہ مدگل کے علاقہ میں داخل ہوا تھا اور دیہات کے لوگ اس کی چمکتی ہوئی عریاں تلوار کے خوف سے گھر بار چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کسی بھی طرف جہاں انہیں اپنے پیچھے لپکتی ہوئی بھیانک موت سے پناہ مل سکے۔ دیورائے بستیاں لوٹتا اور گھروں کو نذر آتش کرتا ہوا بڑھتا رہا۔

تباہی و بربادی...... آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کی شکل

میں بھاگی چلی آ رہی تھی۔ کرناٹکی خطرہ خون کے چھینٹے اڑاتا ہوا بڑھ رہا تھا اور سارے علاقہ میں زندگی کے متلاشی انسان دیوانہ وار بھاگے پھر رہے تھے۔

اچانک رونق بیگ نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ جو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح سرپٹ بھاگا آ رہا تھا۔ رونق بیگ دکن کے ولی عہد حسن خاں کی کمان سے نکلا ہوا ایک تیر ہی تو تھا جسے شہزادے نے پرتھال کی طرف چھوڑا تھا۔ وہ ولی عہد کا خاص پیغام لئے فیروز آباد سے نکلا تھا اور پہروں کی مسافت پلوں اور ساعتوں میں طے کرتا حسین و شاداب وادی کے اُسی موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں سے ایک رستہ مدگل کی طرف نکلتا اور دوسرا گاؤں کو جاتا تھا۔ رونق بیگ اپنی منزل کے ٹیڑھے ترچھے راستے سے آگاہ تھا اس لئے منزل کے قریب پہنچ کر یوں اچانک رک جانا یقیناً کسی علت سے خالی نہ تھا۔ تو کیا اس نے دیوانے کے خطرے کو دیکھ لیا تھا؟

زرد سورج کا سنہرا تھال مغربی افق سے کوئی پانچ نیزے اوپر چمک رہا تھا اور اس کی سرخ کرنیں وادی کے گھنے درختوں کی شاخوں کے حاشیوں پر جیسے رنگ بکھیر رہی تھیں۔ رونق بیگ موڑ کاٹنے ہی والا تھا کہ اسے مدگل کے راستے پر عورتوں، بچوں اور مردوں کا ایک تباہ حال قافلہ دکھائی دیا۔ جو عجیب سراسیمگی کی حالت میں بڑھا آ رہا تھا۔ جیسے کوئی بھیانک خطرہ اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ ظاہر تھا وہ لوگ کھینچی ہوئی تلواروں سے ڈر کے بھاگے تھے۔

کبھی کبھار جب کرناٹک کے سپاہی سرحدی علاقوں میں لوٹ مار کے لئے نکلتے تھے۔ تو لوگوں کا جینا وبال ہو جاتا تھا اور تباہ و برباد ہو کر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف بھاگ نکلتے تھے لیکن کچھ عرصہ سے سرحد کی حفاظت کڑی کر دی گئی تھی۔ اس لئے لوٹ مار کا خطرہ ٹل گیا تھا...... ان لوگوں پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی؟

یہی بات معلوم کرنے کے لئے رونق بیگ نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی تھی یا کسی بھیانک خطرے کے احساس نے خود بخود اس کے قدم روک لئے تھے۔ اسے ٹھہرے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مصیبت زدہ لوگ قریب آ گئے۔ رونق بیگ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اکثر مردوں کے کپڑے خون آلود تھے۔ ان میں بعض زخموں کی وجہ سے نڈھال ہو رہے تھے عورتوں کے چہروں پر گہری اُداسیاں کھنڈ رہی تھیں اور وہ بچوں کو اٹھائے خوف کے

مارے سہمی ہوئی تھیں۔ رونق بیگ نے ایک آدمی کو اشارے سے اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ وہ کہاں سے آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے؟

آدمی جو تباہ حال قافلے کا سردار معلوم ہوتا تھا کہنے لگا۔

"کرناٹک کے سوار مدگل کے سارے علاقے میں موت کے فرشتوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں تباہی ان کے ہمرکاب چلتی ہے۔ وہ بستیاں لوٹتے اور خون کے چھینٹے اڑاتے ہوئے بڑھے آ رہے ہیں۔ مہاراج دیورائے بہ نفس نفیس ان کی قیادت کر رہا ہے۔ ان کی منزل کا کوئی علم نہیں مگر موت کے دیوتاؤں کا رخ اسی وادی کی طرف ہے۔ سنا ہے دیورائے لکھپت سنار کی سندر بیٹی پرتھال کو حاصل کرنے کے لئے آیا ہے اسی لئے..... اس نے دریا عبور کرتے ہی تباہی مچا دی ہے۔"

یہ خبر سنتے ہی رونق بیگ دم بخود رہ گیا۔

"تو کیا حاکمِ مدگل کو اس حملے کی خبر نہیں ہوئی؟ سرحد کے پہرے دار کہاں مر گئے تھے۔"

"وہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔"

ایک لمحہ خاموش رہ کر رونق بیگ نے پوچھا۔

"تم نے کرناٹک کے سواروں کو کہاں چھوڑا تھا؟"

"وہ شام تک اس وادی میں ضرور پہنچ جائیں گے۔ اس وقت وہ دیپا پور کو لوٹنے میں مصروف ہوں گے۔ انہوں نے سینکڑوں آدمی ہلاک کر دیئے ہیں جو شخص مقابلے کی جرأت کرتا ہے اسے نیزوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔"

غروب آفتاب میں صرف نصف پہر باقی رہ گیا تھا اور سورج کی شعاعوں کی تمازت ہولے ہولے ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ورنہ اگر دیورائے کے وحشی سواروں نے اس وادی کو گھیر لیا تو اس کا بچ نکلنا مشکل ہو گا۔ قافلہ آگے گزر چکا تھا اور وہ بڈھا بھی اپنے ہمراہیوں سے جا ملا تھا۔ جس نے حملے کی خبر دی تھی۔ رونق نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وادی کے پر پیچ راستے پر ہو لیا جو درختوں کے درمیان سانپ کی مانند بل کھاتا گاؤں تک چلا گیا تھا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا سائے بہت طویل ہو گئے تھے اور سورج کی زرد کرنیں

مندر کے کلس پر کسی زخمی پرندے کی طرح دم توڑ رہی تھیں۔ چاروں طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی تھی اور متوقع حملے کے ڈر سے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے ضروری سامان کی گٹھڑیاں باندھ رکھی تھیں اور گاؤں خالی کر رہے تھے۔ بعض لوگ جا چکے تھے اور باقی جا رہے تھے۔ جوں جوں شام کا جھٹپٹا بڑھ رہا تھا۔ حملہ کی دہشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ سراسیمگی کی حالت میں گاؤں چھوڑ رہے تھے۔ کسی کو دوسرے کا ہوش نہ تھا۔ رونق بیگ گھوڑا بڑھاتا لکھپت سنار کی حویلی کے سامنے جا پہنچا۔ حویلی اس کے پہنچنے سے پہلے ہی خالی ہو چکی تھی اب وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ خطرے کی بھنک کان میں پڑتے ہی لکھپت جوان بیٹی کو لے کر نکل گیا تھا۔ اس کے نزدیک دیورائے کا حملہ غیر متوقع نہیں تھا۔ لکھپت کے دل میں ایک عجیب سی کھد بد ہو رہی تھی...... بلکہ جس روز پرتھال نے کرناٹک کے مہاراج کو خنجر کا تحفہ بھیجا تھا۔ وہ اسی روز سے خطرے کی دھمک محسوس کر رہا تھا۔ جونہی اس نے سنا کہ بیجانگر کے سوار دریائے تنگ بھدرا کو پار کر کے مدگل کے علاقے میں گھس آئے ہیں اس نے رخت سفر باندھ لیا اور مکھیا کا کا سے کہہ کر گاؤں میں خطرے کا سنکھ بجا دیا۔ وہ جانتا تھا راجہ خنجر کا جواب تلوار کی دھار سے دے گا۔

رونق بیگ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ امر اطمینان بخش تھا کہ پرتھال کسی محفوظ مقام پہ پہنچ چکی تھی لیکن ولی عہد کا پیغام پہنچانا بھی ضروری تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اب اسے کہاں تلاش کرے۔ ادھر خطرہ بڑی تیزی کے ساتھ گاؤں کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

بیگ نے ایک بوڑھے مہنت کو دیکھا جو پوٹلی بغل میں دبائے رینگتا ہوا چل رہا تھا وہ گھوڑا کدا کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"بابا! کیا تم جانتے ہو لکھپت سنار کہاں چلا گیا ہے؟"

بوڑھے مہنت نے سفید بھنویں اوپر اٹھا کر بیگ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"شاید وہ پہاڑی دروں میں جا چکا ہے۔ گاؤں پر مصیبت اس کی وجہ سے آئی ہے۔"

ابھی بوڑھے مہنت نے اپنا فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ شام کے جھٹپٹے میں ایک ساتھ سینکڑوں گھوڑوں کی ٹاپیں بلند ہوئیں۔ جنہیں سن کر مہنت گھبرا سا گیا اور بوڑھے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔

"شاید وہ آ گئے۔" اور بوڑھا ایک طرف رینگ گیا۔

ناپوں کی آواز سن کر اکا دکا لوگ بے تحاشا بھاگ نکلے۔ دیورائے اپنے کرناٹکی سواروں کے ساتھ گاؤں کے سر پر آ گیا تھا۔ بیگ نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اُسے پہاڑی دروں کی طرف سرپٹ چھوڑ دیا اور شام کے دم بخود اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

بیگ کو گئے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سواروں کا ایک دستہ سیلاب کے بپھرے ہوئے ریلے کی طرح گاؤں میں گھس آیا اور آن کی آن میں سنسان گلیوں میں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ سپاہی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کے آنے سے پہلے گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ تمام گھر ویران پڑے تھے اور فضا میں گہرا سناٹا ہونک رہا تھا جیسے کبھی یہاں انسان آباد ہی نہیں تھے۔ سپاہی گھوڑوں سے اتر کر خالی مکانوں میں گھسنے لگے۔

مہاراج دیورائے اپنے خاص سواروں کے ہمراہ لکھپت سنار کی حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس اطلاع نے اسے بے حد مشتعل کر دیا کہ جس حسین مینا کو قفس میں بند کرنے کے لئے اس نے تباہی کے شعلے بھڑکائے تھے۔ وہ کسی نامعلوم سمت پرواز کر گئی جس گوہر نایاب اور گل رخسار کی خاطر منزلیں مارتا اور آتش و خون سے کھیلتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اس نے "لوٹ کا مال" بننے سے انکار کر دیا ہے اور اب کرناٹک کا مہاراج شمشیر بکف سنار کی حویلی کے سامنے کھڑا غصے میں پھنکار رہا تھا۔ قہر و غضب کے مارے اس کے جسم میں خون کا دورہ تیز ہو گیا تھا۔ اس نے شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے پنڈت گورکھ ناتھ کی طرف دیکھا جو اس کے پہلو میں حیران و ششدر کھڑا تھا۔

"راج گورو! پرتھال کہاں ہے؟"

دیورائے کے لہجے میں کڑکتی ہوئی بجلی کی گونج تھی۔ برہمن اس کی کڑک سن کر سہم گیا اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"مہاراج کے جاہ و جلال نے اسے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"ہم پرتھال کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

اور مہاراج کے حکم پر گھروں کی تلاشی شروع ہو گئی مگر خالی مکانوں میں اب کیا رکھا تھا۔ پھر بھی گاؤں کا کونہ کونہ چھانا گیا۔ گورکھ ناتھ پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ وہ ڈرتا تھا کہیں پرتھال سچ مچ کسی مکان میں چھپ کر نہ بیٹھ گئی ہو مگر یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ سارا گاؤں خالی ہو چکا ہے...... مہاراج دیورائے کی دوسری

شکست ...... دوسرا صدمہ...... دوسری ذلت...... غصہ کے جوش میں اس کے نتھنے پھولنے لگے اور زخمی سانپ کی طرح بل کھا کر اس نے حکم دیا۔

"سب مکان لوٹ لو اور گاؤں کو آگ لگا دو۔"

آگ اور خون کے سوائے دیورائے اور کوئی تحفہ لے کر نہیں آیا تھا۔ اس کے حکم پر سب مکان لوٹ لئے گئے۔ اُن اکا دکا مجبور و بے بس لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جو بھاگ کر کہیں نہ جا سکے اور اپنے مکانوں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس ہنگامے سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں کو آگ لگا دی گئی۔ مکان دھڑا دھڑ جلنے لگے اور دھوئیں کے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔

رات کے اندھیرے میں سارا گاؤں جل رہا تھا۔ نہیں دیورائے کے ارمانوں کی ارتھی جل رہی تھی۔ یہ کرناٹک کے ظالم حکمران کے دل کی آگ تھی۔ جس نے غریبوں کے گھر پھونک کر اپنی برباد محبت...... نہیں اپنی ہوس کا تماشا دیکھا تھا۔ بھڑکتے اور لپکتے ہوئے شعلوں سے آس پاس کا سب علاقہ روشن ہو گیا اور دیورائے اپنے پیچھے چیختے ہوئے شعلے اور دھوئیں کے پیچ و خم کھاتے مرغولے چھوڑ کر اپنے سواروں کے ہمراہ مدگل کی طرف پلٹ گیا۔

دریا پار اترتے ہی اگرچہ اس نے آتش و خون کی ہولی کھیلنا شروع کر دی تھی مگر پرتھال کے گاؤں کے سوا کسی پوری بستی کو آگ کی نذر نہیں کیا گیا تھا۔ یہ گاؤں پورے دو روز تک جلتا اور سلگتا رہا۔

پہلا معرکہ

فولاد خاں نے تڑپ کر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ مارا اور گرج کر بولا۔

"دیورائے نے دکن پر حملہ کر کے اپنی موت کو آواز دی ہے۔"

کرناٹکی سواروں کی تاخت کی خبر نے حاکم مدگل کو سخت مشتعل کر دیا تھا اور جوشِ غضب سے اس کی آواز تھرا رہی تھی۔

"کیا وہ بہمنی بہادروں کے نیزوں کو بھول گیا ہے۔ جن کے پھل سیدھے کلیجوں میں اترتے ہیں۔ بخدا اسے ... کی ہر اس بوند کا حساب دینا پڑے گا۔ جو مدگل کی سرزمین پر گری ہے۔ میری تلوا... اس کی ... پر جگمگائے گی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



دیورائے کا حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا اور بہمنی سردار سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ امن اور صلح کے تمام معاہدے بالائے طاق رکھ کر اپنی تلوار کو یوں بے نیام کرے گا۔ ابھی کچھ روز پہلے اس کے حملہ کی خبر سے مدگل میں بے اطمینانی سی پھیل گئی تھی اور شہزادہ حسن خاں فیروز آباد سے بگولے کی طرح اُڑتا ہوا آیا تھا لیکن بیجانگر کے سوار دریائے تنگ بھدرا کے اس کنارے ہی سے لوٹ گئے تھے۔ انہیں بہمنی علاقہ میں گھسنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ جس سے سمجھ لیا گیا تھا۔ مہاراج دیورائے امن کے معاہدوں کا احترام کرے گا مگر اچانک حملہ اور تاخت و تاراج کی اطلاع سن کر فولاد خاں غم و غصہ میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

تیز رفتار قاصد فیروز آباد کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ فولاد خاں نے شہزادہ حسن کو تمام حالات لکھ بھیجے تھے اور خود تین ہزار سپاہیوں کو لے کر دیورائے کا راستہ کاٹنے کے لئے مدگل سے نکل آیا تھا وہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھا اور سر پر فولادی ٹوپی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ اب وہ خون کی ندیاں بہانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ وہ جب فولادی خود پہن کر جنگ کے لئے نکلتا اس کے سپاہی سمجھ جاتے اب شکست و فتح کا نہیں۔ زندگی اور موت کا رن پڑنے والا ہے اور جاں نثاری کی ساعت آن پہنچی ہے۔ فولاد خاں اپنے گھوڑے کی گردن تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

موت کا سفر درپیش ہے۔ بہادر! اگر زندہ لوٹ آئے تو تمہارا سب قرض چکا دوں گا۔ تم نے کئی بار دیورائے کا تعاقب کیا ہے۔ شاید یہ آخری ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر ہو لیا اور اس کی لگام مدگل کے وسطی علاقہ کی طرف موڑ دی جہاں دیورائے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا دیورائے کی رکاب میں کرناٹک کے پانچ ہزار سورما سوار ہیں اور بیس ہزار سپاہی دریائے تنگ بھدرا کے اس کنارے چھاؤنی ڈالے پڑے ہیں۔ اس کے برعکس فولاد خاں کے ہمراہ صرف تین ہزار جانباز تھے لیکن جنگ کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے اس نے کبھی فوج کی قلت اور کثرت کو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ تعداد سے بے پرواہ ہو کر جنگ و جدل کی بازی کھیلتا تھا۔

دیورائے کو بھی خبر مل گئی تھی کہ بہمنی سردار اس کے تعاقب میں چلا آتا ہے۔ وہ پرتھال کا گاؤں پھونکنے کے بعد واپس مڑا اور نہایت تیزی کے ساتھ دریا کی طرف لپکا تاکہ ضرورت کے وقت اپنی پیدل فوج سے مدد لے سکے۔

فولاد خاں بگولے کی طرح لہراتا ہوا جب وادی میں پہنچا دیوانے نکل چکا تھا اور آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے بھی اس کے جوش انتقام کی مانند سرد ہوتے جا رہے تھے۔ بھمنی سردار اس کے قدموں کے نشانات پر پیچھے پیچھے چلا۔

وادی سے پلٹتے وقت دیوانے نے ایک اور شغل اختیار کیا۔ اس کے رستے میں جو گاؤں آیا لوٹ مار کے بعد اسے آگ لگا دی گئی۔ فولاد خاں جلد سے جلد اس کے سر پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ مزید تباہی و بربادی نہ پھیلا سکے۔ اس نے اپنی رفتار پہلے سے بھی تیز کر دی تھی لیکن دیوانے بھی غافل نہیں تھا۔ وہ آندھی کی طرح اڑا جا رہا تھا اور کسی ایسے میدان کی تلاش میں تھا جہاں اطمینان کے ساتھ بھمنی سردار کا مقابلہ کر سکے۔ آخر اس نے اپنی پسند کا میدان ڈھونڈ نکالا اور لشکر کو دو حصوں میں بانٹ کر ایک پہاڑی کے دامن میں ٹھہر گیا۔ فوج کا ایک حصہ اس کی رکاب میں تھا۔ اور دوسرا راج گورو کی سرکردگی میں پہاڑی غاروں میں دبک کر جا بیٹھا تاکہ لڑائی کے وقت اچانک عقب سے نکل کر حملہ کر دے۔

فولاد خاں راجہ کی جنگی چال سے بے خبر بھاگم بھاگ آ رہا تھا۔ اس نے کسی بھی جگہ آرام نہیں کیا کیونکہ جب دشمن کا تعاقب مقصود ہو تو آرام کا خیال پاس بھی نہیں پھٹکتا پھر ایسے دشمن کا تعاقب جو حملہ کرنے میں شیر کی مانند بہادر اور بھاگنے میں لومڑی کی طرح چالاک تھا۔ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اور بھمنی سردار یہ ٹھان کر نکلا تھا۔ اس مرتبہ وہ دیوانے کو بچ کر نہیں جانے دے گا۔ دشمن کا کھوج لگاتا ہوا فولاد خاں جب ایک پہاڑی کے دامن میں آیا تو سورج درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہا تھا اور کرناٹکی سوار پرے باندھے مقابلہ کے لئے تیار کھڑے تھے۔

یہ میدان دریائے تنگ بھدرا سے قریب ہی تھا اور ضرورت کے وقت راجہ فوراً کمک حاصل کر سکتا تھا۔ فولاد خاں نے نتائج کی پروا کیے بغیر جنگ کے نقارے پر چوٹ لگائی اور میدان میں کود پڑا۔ دونوں فوجیں گتھم گتھا ہو گئیں اور دیوانے کو اس کی حماقت کا جواب مل گیا۔

فولاد خاں چاہتا تو اس وقت تک دشمن کو نامہ و پیام میں مصروف رکھ سکتا تھا۔ جب تک فیروز آباد سے کمک نہ آ جاتی لیکن وہ ایک لمحے کا انتظار بھی بے سود سمجھتا تھا...... ”جو ہو گا سو ہو گا“ یہی سوچ کر وہ جنگ میں الجھ گیا اس کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا۔

دیورائے کی سرکوبی...... وہ ان بے گناہوں کے جوش انتقام سے پاگل سا ہو رہا تھا جو کرناٹکی سواروں کی تلوار کا لقمہ بنے تھے اور اب وہ اس وقت تک چین نہیں لے گا۔ جب تک دیورائے اپنی غلطی کا خمیازہ نہیں بھگت لیتا۔

پہلے ہی حملہ میں بہمنی جانبازوں نے دشمن کو پیچھے دھکیل دیا اور انہیں رگیدتے ہوئے دور تک لے گئے...... دیورائے ایک ٹیلہ پر کھڑا جنگ کا نظارہ کر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے سپاہی دبتے ہوئے میدان کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں تو اس کے اشارے پر ایک سپاہی نے خطرے کا سنکھ بجا دیا۔ پہاڑی گھاٹیوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے سوار اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ٹوٹ پڑے اور جیکارے لگاتے بہمنی سپاہ کو گھیرے میں لینے لگے۔

فولاد خاں اس اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھا۔ اِدھر پہاڑی ترائی کی طرف پسپا ہوتے ہوئے کرناٹکی سوار بھی سنبھل کر دائیں اور بائیں سمتوں میں پھیلنے لگے۔

نہایت ہوشیاری کے ساتھ بہمنی فوج کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ ہولے ہولے یہ گھیرا تنگ ہونے لگا اور فولاد خاں سوچنے لگا۔ یہ گھیرا موت کے خونیں چکر کی طرح آہستہ آہستہ نزدیک سے نزدیک آ رہا ہے اور اگر اسے ابھی نہ توڑا گیا تو ایک بھی جانباز زندہ نہیں بچ سکے گا۔ اس نے میدان جنگ کا بغور جائزہ لیا اور دشمن کا ایک کمزور پہلو بھانپ لیا۔ جسے توڑ کر وہ موت کے اس تنگ دائرے سے باہر نکل سکتے تھے۔

دیورائے خوش تھا اس کی چال سو فیصد ٹھیک بیٹھی تھی اور بہمنی سپاہی پوری طرح گھیرے میں آ چکے تھے۔ اس نے حکم دیا دشمن کو گھیر کر مار دو۔ ایک بھی سپاہی نکلنے نہ پائے۔

فولاد خاں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ دیورائے اس کے سامنے ایک بلند ٹیلے پر کھڑا موت کے احکام صادر کر رہا تھا اور وہ اس کے قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب تو اہم سوال یہ تھا وہ اپنے سواروں کو لحظہ بہ لحظہ سکڑتے ہوئے خونیں گھیرے سے کس طرح باہر نکالے؟ چند جانبازوں کو ساتھ لے کر وہ مردانہ وار دشمن کے کمزور بازو پر حملہ آور ہوا اس نے تمام ساتھیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور دشمنوں کے گھیرے میں محصور ہو کر لڑنا

موت کو دعوت دینا تھا۔ مگر وہ گھیرا توڑ کر نکل سکیں تو محفوظ ہو جائیں گے۔ یہی سوچ کر دشمن کو مارتے کاٹتے ہوئے وہ اپنے سپہ سالار کے پیچھے لپکے جو جان کی بازی لگا کر کرناٹکی بہادروں کی صف کاٹنے میں مصروف تھا۔ اس کی تلوار لہو میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی اور موت کا پیغام لے کر حریفوں کے سروں پر چمک رہی تھی۔ اگرچہ وہ خود بھی زخموں سے چور ہو چکا تھا اور دشمن کا سارا زور اسی پر تھا لیکن بہمنی سردار موت سے کھیلتا ہوا آخر گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو گیا اور موت کے دائرے سے نکل آیا۔ دوسرے سوار بھی اس کے پیچھے تھے۔ اب سنبھل کر لڑنے سے پہلے انہیں کچھ دیر آرام کی ضرورت تھی مگر دیورائے موت کے بھیانک دیوتا کی طرح ان کی تاک میں تھا۔ وہ جوش غضب میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ حریف اس کی چال کو مات دے کر موت کے خطوط سے نکل چکا تھا۔ اب ان کا تعاقب کرنا گویا اپنی جان سے دشمنی کرنے کے مترادف تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے بہادر سپاہیوں کو تعاقب سے باز رکھا اور بہمنی سواروں کو نکل جانے دیا تاہم وہ اس بات سے مسرور تھا کہ پہلے معرکہ میں اُسی کا پلہ بھاری رہا۔

لیکن کب تک، بہمنی سوار جب پلٹ کر آئیں گے تو کرناٹک کے سورماؤں کے لئے موت کے فرشتے بن جائیں گے۔ وہ مدگل سے لڑنے اور مرنے کا فیصلہ کر کے نکلے تھے۔

دریائے تنگ بھدرا کے کنارے پہاڑی میدان میں بے شمار لاشیں گدھوں اور جنگلی جانوروں کی خوراک بنی پڑی تھیں اور زخمی گھوڑے خوفناک انداز میں ہنہنا رہے تھے۔

رزم و بزم

پہلی جھڑپ میں دیورائے جیت گیا تھا۔ فولاد خاں بمشکل تمام موت کے خونی پنجہ سے نکل کر بھاگا تھا۔

بیجانگر کے سوار اپنی کامیابی پر نازاں تھے لیکن دیورائے کو یہ کامیابی کافی مہنگی پڑی تھی اس کے چھ بہترین سورما بہمنی تلواروں کا لقمہ بن گئے تھے اور وہ ایک بھوری چٹان پر کھڑا خونخوار بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔

"فولاد خاں نکل گیا......"

جیسے فولاد خاں نہیں، وقت کی کمان سے زندگی کا تیر نکل گیا تھا۔

سوار بھوری چٹان کے آس پاس اکٹھے ہو رہے تھے۔ زخمیوں کو میدان سے اٹھا لیا گیا تھا راج گورو نے آگے بڑھ کر مہاراج کو فتح کی مبارک باد دی لیکن دیو رائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جیسے وہ کسی اہم فیصلے پر غور کر رہا۔ پھر اس نے سپہ سالار کو حکم دیا کہ مدگل پر حملہ کے لئے گھوڑوں کی باگیں موڑ لو۔ ہم فولاد خاں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

جسونت رائے کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ اس نے سر اطاعت خم کر دیا لیکن حملے کا حکم سن کر گوزک کا باتجہ وحشی ہرن کی طرح چونک اٹھا۔

''مہاراج!''

دیو رائے نے تیز نگاہوں سے بڈھے راج گورو کی طرف دیکھا وہ کہہ رہا تھا۔

''ابھی مدگل پر حملے کا وقت نہیں آیا۔ شاید فولاد خاں راستے سے لوٹ پڑے۔'' یہ اندیشہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

''میدان سے بھاگنے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔''

راجہ غصے میں اپنی ران تھپتھپانے لگا۔ معلوم ہوتا تھا اسے کوئی غیر معمولی فکر کھائے جا رہی ہے۔ اس نے دو تین مرتبہ سامنے کی چٹان تک چکر کاٹے پھر تیزی کے ساتھ پلٹا اور بولا۔

''بہت بہتر ہم مدگل پر حملہ نہیں کریں گے لیکن پڑاؤ یہاں سے اٹھا لو۔ ہمیں گھاٹ سے کچھ اور قریب ہو جانا چاہیے۔''

اُس کا فیصلہ یقیناً عقل مندی پر مبنی تھا۔ جنگی نقطہ نگاہ سے اس کا دریا کے قریب آ جانا ہی بہتر تھا تا کہ اس سپاہ سے تعلق قائم رہے جو دریا کے دوسرے کنارے اس کے حکم کی منتظر تھی۔

پھر اسی وقت پڑاؤ اٹھا لیا گیا۔ کوچ کا سنکھ بجا اور فوج ایک کھلے میدان میں اتر پڑی جس کے شمال مشرق میں اونچے نیچے ناہموار ٹیلوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔

دریا یہاں سے چند میل کے فاصلے پر تھا اور ضرورت کے وقت پیادہ فوج کی مدد با آسانی حاصل کی جا سکتی تھی۔

تیر انداز ناہموار ٹیلوں پر پھیلا دیے گئے اور گشتی سواروں نے دو میل کے علاقہ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اب کسی بھی طرف سے اچانک حملہ یا شبخون کا خطرہ نہیں تھا لیکن خطرہ تو ان کے آس پاس ہی رینگ رہا تھا۔ موت کی طرح اچانک دبوچ لینے والا

خطرہ......

مدگل کا کوبرا اس وقت تک اپنے بل میں نہیں جا سکتا تھا۔ جب تک دشمن کو موت کی وادی میں نہ پہنچا دے یا اسے یہاں سے بھگا نہ دے۔

دیورائے نے صرف ایک عارضی فتح حاصل کی تھی اور اس فتح نے اسے پہلے سے کچھ زیادہ دلیر اور مطمئن کر دیا تھا لیکن کیا اس کے سر پر آسمان کی وہ گردش بھی تھم گئی تھی جو بڑے بڑے بہادروں کو پیس کر رکھ دیتی ہے؟

میدان کے وسط میں مہاراج کا خیمہ نصب تھا۔ جس کے اردگرد ایک خوبصورت شامیانہ کھڑا کیا گیا تھا اور آس پاس سپاہی ننگی تلواریں لئے کھڑے تھے۔

زرنگار خیمے میں شراب کی صراحی ہولے ہولے خالی ہو رہی تھی اور ایک حسین رنگی جو شاہی رتھ پر سوار محض مہاراج کا دل بہلانے کے لئے ساتھ آئی تھی۔ کیف و سرور میں رقص کے توڑے کاٹ رہی تھی۔ دیورائے روپ ساگر کی لہروں پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ جو ساکت بھی تھا اور متلاطم بھی۔ رنگی اس کے آس پاس ہی چکر کاٹ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس قدر قریب آ جاتی کہ دیورائے اس کی جھانجھنوں کی چھنک پر بے خود ہو کر جھوم اٹھتا۔ یہ جھانجھنیں اس کے دل پر بج رہی تھیں اور اس کا انگ انگ ایک نئی لذت محسوس کرنے لگا تھا۔

''پہلی جیت کا پہلا ناچ۔''

اس کے نشیلے ہونٹ آہستہ آہستہ تھرتھرائے اور اس نے خالی جام فضا میں لہرا دیا۔ نشہ کی طلب بڑھ رہی تھی۔ رنگی رقص کا دائرہ بنتی ہوئی آگے بڑھی۔ صراحی اٹھائی اور شراب جام میں انڈیل دی پھر جھانجھنوں کی تیز جھنکار کے ساتھ تیزی کے ساتھ پلٹی اور رقص کے دائرے میں ناگن کی طرح جھومنے اور بل کھانے لگی۔ دیورائے کسی دوسری دنیا کے خواب دیکھ رہا تھا۔

گورے گورے حسین اور نازک پاؤں اچانک رک گئے۔ رنگی دم بخود ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ دیورائے نے غصے میں شراب کا پیالہ خیمے کے چوبی ستون کے ساتھ دے مارا اور خوفناک آواز میں پھنکارا۔

''اسے ہمارے قریب لاؤ۔''

خیمے کے دروازے پر نیزہ بردار سپاہی ایک آدمی کو جکڑے ہوئے نمودار ہوئے جو اپنے لباس سے بہمنی لشکری نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر زخمی تھا اور خون اس کے چہرے پر متعدد لکیریں بناتا ہوا کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے خون آلود چہرے پر خوف کی بجائے غصہ کے آثار تھے اور وہ ایسی نگاہوں سے دیورائے کو گھور رہا تھا جن میں بجلی کے کوندے لپک رہے تھے۔

آٹھ بھالوں کی چمکدار رانیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

''کون ہے یہ؟''

دیورائے شیر کی طرح گرجا۔

ایک افسر نے آگے بڑھ کر ''مہاراج کی جے ہو'' کا نعرہ لگایا اور بتایا کہ یہ بہمنی فوج کا ایک خطرناک جاسوس ہے جسے گشتی سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گرفتار کیا ہے۔ گرفتاری سے پہلے اس نے ہمارے کئی سپاہی زخمی کر دیے ہیں۔''

دیورائے غصہ سے کانپنے لگا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے قیدی کی طرف دیکھا اور بولا۔

''یقیناً تم فولاد خاں کے خاص سپاہی ہو۔ ہم نے تمہیں اس کے پہلو بہ پہلو لڑتے دیکھا تھا۔ کیا تم انکار کر سکتے ہو؟''

قیدی خیمے کہ وسط میں پہنچ چکا تھا۔ رقص کے اس دائرے میں جہاں چند ساعت قبل بیجانگر کی سندر رنگی اپنے روپ کے جلوے بکھیر رہی تھی۔ اس نے اپنے لبوں کو جنبش نہیں دی بلکہ زبان کا کام نگاہوں سے لیا۔ اُف وہ نگاہیں جو شرارے اُگل رہی تھیں۔

''جواب دو...... کیا نام ہے تمہارا۔'' دیورائے چلایا۔

''شمشیر خاں......'' قیدی کے لہجے میں بھی تلوار کی کاٹ تھی۔

''شمشیر خاں......'' مہاراجہ نے حقارت سے یہ نام دہرا دیا۔ پھر کہنے لگا۔

''کیا تم نہیں جانتے۔ ہم ہر اس شخص کو کاٹ پھینکتے ہیں جو ہمارے مقابلے پر اٹھے۔''

قیدی خاموش رہا۔

''بیجانگر کے قانون میں جاسوسی کرنے والوں کے ساتھ کتوں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔''

''میں جاسوس نہیں۔''

''پھر کون ہو؟''

''صرف ایلچی۔''

یہ الفاظ سن کر دیورائے یوں اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹا اور سنبھل کر اس چوبی تخت پر بیٹھ گیا جس پر خوب صورت قالین بچھا تھا۔

''کیا سندیس لے کر آئے ہو؟''

''دکن کی سرزمین سے نکل جاؤ۔ ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔''

قیدی کا انداز گفتگو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں لیکن اس کے جواب میں مہاراجہ کا ایک بھیانک قہقہہ خیمہ میں گونجا۔

''ہم سب کچھ سوچ سمجھ کر آئے ہیں۔ یہ بتاؤ تم نے فولاد خاں کو کہاں چھوڑا تھا؟''

''وہ مدگل کے دروازے پر سلطانی کمک کا انتظار کر رہے ہیں۔''

دیورائے کے لبوں سے پھر بھیانک ہنسی ابل پڑی۔ اس کی آواز خیمہ میں یوں ابھری جیسے موت کے خونی دیوتا سسیا رہے ہوں۔

''کیا وہ پھر حملہ کی حماقت کرنا چاہتا ہے۔ مہا وشنو کی سوگند! ہماری تلوار اس کا لہو چاٹ کے رہے گی۔ ہم اُسے خوفناک سزا دیں گے۔''

خاموش رہو۔'' قیدی دیوانوں کی طرح چلایا..... ''فولاد خاں کا لہو چاٹنے والی تلوار ابھی کسی لوہار نے نہیں بنائی۔''

دیورائے غصہ میں یوں کانپا جیسے ایک شاخ تیز ہوا میں جھول جاتی ہے۔ جوش غضب میں آگے بڑھ کر اس نے تلوار کا دستہ ایلچی کے منہ پر دے مارا اور اس کے دانتوں سے خون ٹپکنے لگا۔

''ہم اس زبان کو تالو سے کھینچ لیا کرتے ہیں۔ جو ہمارا اپمان کرے۔''

''تمہیں یہ ہاتھ اٹھانا بہت مہنگا پڑے گا۔'' شمشیر خاں نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ ''قاصدوں پر صرف کمزور اور کم ظرف بادشاہ ہی ہاتھ اٹھایا کرتے ہیں۔''

اس کے دانتوں سے نکلنے والے خون کی سرخ لکیر ٹھوڑی پر بہتی ہوئی گردن تک آ گئی تھی۔ نرتکی جو نیم عریاں لباس میں ایک طرف دبک سی گئی تھی۔ حیرت پاش نگاہوں سے

ایلچی کو دیکھنے لگی...... وہ حیران تھی کیا مہاراج کے سامنے کوئی شخص ایسی گستاخی بھی کر سکتا ہے؟

اچانک موت کی پُر اسرار آہٹ کی طرح ایک سمت سے ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی لشکر گاہ میں شور وغل کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ دیورائے ایک لمحہ آوازوں کی دھمک سنتا رہا پھر اس نے تعجب سے پوچھا۔

''یہ شور کیسا ہے؟''

جب راج گورو اندر داخل ہوا تو اس کی پریشان حالت سے صاف ظاہر تھا کہ باہر کوئی خلاف توقع حادثہ رونما ہو گیا ہے۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجہ میں بولا۔

''مہاراج! فولاد خاں نے حملہ کر دیا۔''

''فولاد خاں......''

دیورائے کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا...... اس نے سوالیہ نگاہوں سے ایلچی کی طرف دیکھا ''وہ تو مدگل میں تھا؟''

''اس نے مہاراج کی آواز سن لی ہوگی۔''

ایلچی کے لہجے میں بڑی زہریلی طنز تھی۔ ''فولاد خاں کے کان ہر وقت دشمن کی آہٹ پر رہتے ہیں۔''

''تو تم صرف ہمیں دھوکا دینے کے لئے آئے تھے؟''

ایلچی کو بھول کر دیورائے دروازے کی طرف لپکا اور پردہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ راج گورو بھی اس کے ساتھ تھا۔

قرض کی ادائیگی

لشکر گاہ میں بھگدڑ مچ رہی تھی۔ دور اونچے ٹیلوں کے عقب سے بہمنی سوار اپنے گھوڑے کداتے اور کرناٹکی سپاہیوں کو مارتے کاٹتے چلے آ رہے تھے۔ سپہ سالار نے اگرچہ خطرے کا سنکھ بجا دیا تھا مگر حملہ کچھ ایسا منظم اور اچانک ہوا تھا کہ بعض سپاہی گھوڑوں پر زین بھی نہ کس پائے تھے۔

دیورائے نے یہ منظر دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے موت کی دیوی گھوم گئی......

اور خوف کی لہر اس کے بدن میں زخمی سانپ کی مانند رینگنے لگی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے راج گورو کی طرف دیکھا۔

"دشمن چال کھیل گیا ہے راج گورو!"

پنڈت گورکھ ناتھ نے اُس کی آواز کی کپکپاہٹ سے خطرے کی نوعیت سمجھ لی۔ اب صرف ایک راستہ باقی تھا۔ گھاٹ کی طرف پسپائی۔ اُس نے مہاراج کو مشورہ دیا۔

"یہ سوچنے اور افسوس کرنے کا سے نہیں۔ ابھی وقت ہے گھاٹ کی طرف نکل چلیے۔"

شاید دیورائے خود بھی اس نتیجے پر پہنچا تھا کیونکہ اب پسپائی اور فرار کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔ وہ دونوں لپک کر گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ دیورائے نے تلوار کھینچ لی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس طرف بڑھا جہاں کرناٹکی سوار دشمن کی یلغار کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جسونت رائے موت کی بازی لڑ رہا تھا۔ جب اُس نے مہاراج اور راج گورو کو بڑھتے دیکھا تو اپنے سپاہیوں کو للکارنے لگا۔ ہزیمت خوردہ سوار پھر سنبھل کر لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے مگر حملہ آوروں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہر اُس چیز کو فنا کر دیں گے جو ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرے گی۔ دیورائے کو دیکھ کر انھوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور ایک ساتھ سینکڑوں تلواریں فضا میں بلند ہو گئیں جیسے بجلیاں کوند جاتی ہیں...... جیسے آئینے چمکتے ہیں...... جیسے موت لپکتی ہے اور بیسیوں کرناٹکی سوار خاک و خون میں تڑپنے لگے۔

دیورائے اس بھیانک منظر کی تاب نہ لا سکا اور جلدی سے جسونت رائے کی طرف مڑا جو ایک زخمی سوار کو سنبھال رہا تھا۔

"جسونت! تم دشمن کو کچھ دیر روکو پھر گھاٹ کی طرف نکل آؤ۔"

یہ حکم دے کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خیمے کی طرف پلٹا۔ صرف یہی ایک راستہ تھا جو اسے موت کی وادی سے نکال سکتا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بہمنی سواروں نے عقب کی طرف سے نکل کر یہ راستہ بھی مسدود کر دیا تھا اور موت کے ایک ہزار فرشتے برق آسا تلواریں سونپے ہوئے کرناٹکی سپاہیوں کو موت کے باڑے کی طرف ہانک رہے تھے۔ اس دستے کی کمان خود فولاد خاں کر رہا تھا۔ وہ زرہ بکتر پہنے۔ سر پہ فولادی خود اوڑھے اور ہاتھ میں برچھا لہرائے سفید گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھا۔

یہ زرہ بکتر، یہ فولادی خود، یہ خون چاٹنے والا برچھا......

یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب وہ خون کی ندیاں بہانے سے دریغ نہیں کرے گا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا۔ جب تک فتح یا موت اس کا ہاتھ نہیں روک لیتی۔

فولاد خاں کو اس حالت میں دیکھ کر دیورائے نے اپنے جسم میں سر سے پاؤں تک ایک خنک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ یقیناً یہ موت کا خوف تھا جو اس کے خون میں سرایت کر رہا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ کرناٹک اور گجرات کے راجوں اور راجپوت سورماؤں میں اس کی بہادری ضرب المثل تھی...... ویس کے سپاہی اس کے نام کی سوگند اٹھاتے اور یہ جانتے تھے کہ بیجانگر کا مہاراج جب دشمن پر حملہ کرنے نکلتا ہے تو موت کی کالی دیوی اس کے ہمرکاب چلتی ہے۔ وہ مدت سے سلطان دکن فیروز شاہ بہمنی سے جنگ آزمائی کے سپنے دیکھ رہا تھا اس نے بہمنی لشکروں سے کئی معرکے لڑے تھے۔ وہ کرناٹک کے پہلو میں ابھرتے ہوئے اسلامی خطرے کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا تاکہ رائے رایاں کا زرد پھریرا جنوبی ہند پر لہرانے لگے مگر یہ قسمت کہاں تھی اسے ہر مرتبہ ناکامی ہوئی تھی اور آخری جنگ میں اسے سلطان کا باجگزار بننا پڑا تھا مگر وہ بزدل نہیں تھا...... وہ ذلت کا جوا اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ دکن کی سرحدوں کو تاخت و تاراج کرنا اس کا معمول بن چکا تھا پھر کون کہہ سکتا ہے۔ وہ موت سے خائف تھا۔

موت دیورائے کی کتاب حیات میں ایک بے معنی سا ورق تھا لیکن فولاد خاں کو آتے دیکھ کر اسے زندگی میں پہلی مرتبہ موت کا خطرہ محسوس ہوا شاید وہ آج تک اس خطرے سے دوچار ہی نہیں ہوا تھا۔

اس کا زرنگار خیمہ جہاں کچھ دیر پہلے بیجانگر کی سندر زنگی اپنے حسن و شباب کے جادو جگا رہی تھی۔ اس وقت بہمنی سواروں کے گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو چکا تھا پہرے دار موت کا لقمہ بن گئے تھے خون میں نہایا ہوا ایلچی شمشیر خاں موت کا سرخ لبادہ اوڑھے فولاد خاں کے گھوڑے سے گھوڑا ملائے چلا آ رہا تھا۔ دیورائے کو دیکھ کر اس نے دور ہی سے اپنا برچھا فضا میں لہرایا اور خوفناک آواز میں دھاڑا۔ ”دیورائے“

وہ دیورائے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ بہمنی سوار خونی دیوتاؤں کی طرح اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اب لڑنے اور مرنے کے سوا دوسرا راستہ ہی کون سا تھا؟ تقدیر نے اس کے ساتھ کیسا فریب کھیلا تھا۔ چند ہی ساعتوں کے اندر شطرنج کی چال کی طرح چلتی

ہوئی بازی ہر گئی تھی۔

سوچ بچار کا سمے بیت چکا تھا اس نے راج گورو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور حملہ آوروں کے گھیرے میں ایک خلا دیکھ کر گھوڑا اس طرف سرپٹ ڈال دیا۔ فولاد خاں کے مقابلے سے بہتر تھا کہ وہ بھمنی سوار کی تلوار کا زخم کھا کر نکل جائے۔

گرد و غبار کے بادل لہرائے اور بیجانگر کا مہاراج اپنی سپاہ کو موت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر غبار کے بادلوں میں روپوش ہو گیا۔

شمشیر خاں نے دور ہی سے اسے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور دیورائے کا قرض چکانے کے لئے اس کے پیچھے ہولیا۔

دیورائے ہوا کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ جیسے وہ جادو کے کسی کل دار گھوڑے پر سوار ہو۔ تقریباً ایک کوس کا فاصلہ پلک جھپکنے میں طے ہو گیا۔ بھاگتے وقت اس نے بدنصیب سپاہ کی بھی خبر نہ لی جسے وہ بیجانگر سے ساتھ لے کر لڑنے کے لئے نکلا تھا لیکن سپاہ تو راجہ کے لئے لڑتی مرتی ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ اس وقت خطرے کی سرحد سے بہت دور نکل آیا تھا اور دریا کا گھاٹ تین چار کوس باقی تھا۔ جہاں بیس ہزار بہادر اس کے ایک اشارے پر اپنی جانیں لڑا دینے پر تیار بیٹھے تھے لیکن خطرہ تو اس کے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔

جونہی وہ ایک ٹیلے کا موڑ کاٹنے کے لئے مڑا۔ شمشیر خاں نے اپنا گھوڑا بڑھا کر اس کا راستہ کاٹا اور برچھا تھام کر بولا۔

"گھوڑا روک لو دیورائے! میں تمہارا قرض لوٹانے آیا ہوں۔"

دیورائے شمشیر خاں کو دیکھ کر بوکھلا اٹھا۔ یقیناً وہ اس وقت لڑنا اور وقت ضائع کرنا نہ چاہتا تھا۔ اگر اس دوران میں خود فولاد خاں اپنے سواروں کو لے کر اس کے سر پر آ دھمکا۔ تو بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ اس نے ایلچی کو طرح دے کر نکل جانا چاہا۔ وہ گھوڑے کی باگ کھینچتے ہوئے بولا۔

"ہمیں نکل جانے دو شمشیر خاں! ہم تم سے الجھنا نہیں چاہتے۔"

شاید شمشیر خاں کا گھوڑا بھی دشمن کو پہچان گیا تھا۔ وہ پچھلے قدموں پر اچھل کر زور سے ہنہنایا اور اس کی ہنہناہٹ تلواروں کی جھنکار کی طرح خاموش فضا میں بکھر گئی۔ شمشیر خاں نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ اس اثنا میں دیورائے نے اپنی گردن سے سفید و شفاف

موتیوں کا قیمتی ہار اتار کر اس کی طرف اچھال دیا۔

"ہمارا راستہ چھوڑ دو۔ یہ رہا تمہارا انعام۔"

اس کے جواب میں شمشیر خاں نے ہاتھ بڑھانے کی بجائے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور موتیوں کا ہار گھوڑے کے قدموں میں جا گرا۔

"شمشیر خاں انعام لینے کے لئے نہیں۔ انعام دینے کے لئے حاضر ہوا ہے۔" اُف کتنا بھیانک مذاق کیا تھا اس نے۔

"ضد نہ کرو شمشیر خاں! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر انعام تھوڑا ہے تو تم قیمت بڑھا سکتے ہو۔"

"سپاہی ہیرے اور موتی نہیں کھایا کرتے مہاراج! وہ تو دشمن کا لہو پی کر زندہ رہتے ہیں۔" شمشیر خاں نے پرچھا تولتے ہوئے کہا۔

"اس وقت ہمیں نکل جانے دو۔ ہم تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

دیوراج کے لہجے میں ہارے ہوئے جواری کی التجا تھی۔

شمشیر خاں کے خون آلود لبوں سے بے اختیار ہنسی کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ اس نے حقارت سے دیوراج کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کم ظرف بادشاہ سپاہی کا احسان نہیں صرف اس کی تلوار کا گھاؤ یاد رکھتے ہیں...... تم نے تو فولاد خاں کو پیس ڈالنے کی سوگند کھائی تھی۔ اب تمہاری بہادری کیا ہوئی؟"

دیوراج کا چہرہ ہولے ہولے تمتمانے لگا۔ شمشیر خاں کہہ رہا تھا۔

"شاید تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ میں کمک لے کر آیا ہوں لیکن اطمینان رکھو۔ میں بالکل تنہا ہوں۔ تم پر پیچھے سے حملہ نہیں ہوگا۔"

شمشیر خاں کا چہرہ خون کے سیاہی مائل سرخ دھبوں کی وجہ سے بڑا خوف ناک اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ جب وہ ہنستا تو اس کی کھردری کھال پر خون کی بے ترتیب لکیریں سمٹنے اور پھیلنے لگتیں جن سے اس کے چہرے کی سنگینی اور ہولناکی میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس نے دیوراج کو للکار کر کہا۔

"تلوار سنبھالو!"

"شمشیر خاں! کیا تم یہ لڑائی کسی دوسرے وقت پر نہیں اٹھا رکھتے؟"

"میں نہیں جانتا تھا۔ بیجا نگر کا مہاراج اپنے ظرف کی طرح دل کا بھی اتنا ہلکا ہے۔ مجھے تو صرف ایک قرض چکانا ہے اور میں وہ قرض چکائے بغیر نہیں لوٹوں گا۔"

یہ کہہ کر شمشیر خاں نے برچھا سنبھالا اور گھوڑے کو دیوانے کی طرف ہانک دیا۔ اب مقابلہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دیوانے نے بھی تلوار سنبھالی اور حریف کے حملہ کا انتظار کرنے لگا مگر برچھے سے بھی زیادہ خوفناک شمشیر خاں کے خون آلود چہرے پر دو چمکتی ہوئی آنکھیں تھیں جو بھالے کی نوک دار انیوں کی طرح دیوانے کے سینے میں گھستی جا رہی تھیں۔ شاید یہ خوفناک آنکھیں ہی تھیں جن کی وحشیانہ چمک نے اسے اس قدر سراسیمہ کر دیا تھا۔

لوہے سے لوہا ٹکراتے ہی گھوڑوں نے اپنی کنوتیاں بدلنا شروع کر دیں۔ دیوانے نے حریف کا وار تلوار پر روکا۔ وہ کمزوری جس کا چند لمحے قبل اس نے اظہار کیا تھا۔ اب زائل ہو چکی تھی اور اس وقت وہ زخمی سانپ کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ جب لڑائی ٹھن ہی گئی تو تلوار کا وار بھرپور پڑنا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ہلکا سا چکر دیا اور شمشیر خاں کے گرد اس طرح گھوما جیسے اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن پٹھنی حریف اس کی کسی حرکت سے غافل نہ تھا۔ جونہی دیوانے کی تلوار فضا میں ابھر کر نیچے آئی۔ شمشیر خاں نے نیچے سے برچھے کا ایسا ہاتھ مارا کہ دیوانے کی تلوار ٹوٹ کر دور جا گری اور اس کے ساتھ ہی برچھے کی نوک اس کے چہرے پر ایک گہری لکیر سی کھینچتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی خون کی تیز دھار بہہ نکلی اور راجہ کا چہرہ لہولہان ہونے لگا۔ اگر وہ جلدی سے اپنا گھوڑا پیچھے نہ ہٹا لیتا تو شمشیر خاں کا برچھا اس کی گردن کاٹ چکا ہوتا۔ اپنے مہاراج کو بے بس اور نہتا دیکھ کر راج گورو نے جو ایک طرف چپ چاپ کھڑا لڑائی کا تماشہ دیکھ رہا تھا اپنی تلوار اس کی طرف پھینک دی۔ جسے اس نے ہوا ہی میں دبوچ لیا۔

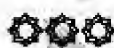
شمشیر خاں اپنے دوسرے خوفناک حملہ کے لئے گھوڑا کدانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے کی سی وحشیانہ چمک پیدا ہوئی۔ شاید حریف کے چہرے پر خون کی ابلتی ہوئی لکیر نے اسے بے رحم بنا دیا تھا لیکن دیوانے کے نزدیک ایک ایسے انسان سے مقابلہ کرنا بے سود تھا جو اس کا خون پینے کی قسم کھا کر تعاقب میں نکلا تھا۔

لہو کی بوندیں ٹپ ٹپ اس کے سینے پر گر رہی تھیں۔ برچھے کا زخم اگرچہ کاری نہیں تھا

مگر ایک ہی وار نے اس کے چہرے کو خون کا غسل دے ڈالا تھا اور اب وہ اس فکر میں تھا کہ شمشیر خاں کے دوسرے حملے سے پہلے ہی کسی سمت کو بھاگ نکلے اچانک اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور گھاٹ کی طرف نکل گیا اُسے بھاگتے دیکھ کر راج گورو نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے پیچھے ہولیا۔ شمشیر خاں نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔ صرف بھاگتے ہوئے حریف کو بلند آواز سے پیغام دیا۔

"دیورائے! یہ مت بھولنا میں اپنا قرض ادا کر چکا ہوں۔"

پہاڑی ٹیلوں میں اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔ مگر دیورائے نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز دور اور دور ہوتی ہوئی آخر خاموشیوں میں ڈوب گئی ٹیلے کی ترائی میں شمشیر خاں نے بھی گھوڑے کی باگ موڑی اور واپس ہولیا۔



5

شب خون

...ر کی اُڑان

کرناٹکی سورماؤں میں صرف گنتی کے چند خوش نصیب اپنی جان بچا کر بھاگ سکے
...یا تو لڑائی میں مارے گئے یا زندہ گرفتار ہوئے۔

دیوراے کو اُس کی حماقت کا جواب مل گیا۔

وسیع اور ناہموار میدان میں یہاں وہاں لاشیں یوں بکھری پڑی تھیں جیسے مٹی کے
...ن تودے اُبھر آئے ہوں۔ وہ سب کے سب اپنے مہاراج کی خونیں ہوس کا لقمہ بنے
...اور اس ویران میدان میں اب کوئی اُن کی بے کفن لاشوں پر رونے اور ماتم کرنے والا
...نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا جو اُن پر دو آنسو ہی بہاتا اور پوچھتا کہ موت کی دیوی نے تمہیں
...ں دبوچ لیا؟ زندگی تم سے کیوں روٹھ گئی؟ تمہارے بعد تمہاری اولاد تمہاری ستی
...تریاں، جوان بہنیں اور بوڑھی مائیں جو دروازوں کے پٹ کھولے تمہاری راہ دیکھ رہی
...ں گی۔ اب تمہیں کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں گی؟ جب بیجانگر میں یہ خبر پہنچے گی کہ کرناٹک
... تین ہزار سورما میدان جنگ میں کھیت رہے ہیں اور حریف کے گھوڑوں نے ان کی
...وں کو اپنے سموں سے کچل ڈالا ہے تو کتنے گھروں سے دردناک چیخیں بلند ہوں گی کتنے
...توں میں موت کا سیاپا ہو گا۔ کتنی دلہنیں اپنے بال نوچ لیں گی اور اُن کی مانگ کا سندور
... جائے گا لیکن بیجانگر کا ظالم حکمران اپنے راج رنواس میں بیٹھا کسی حسین زنگی یا آشرم کی
...ں گمنام دیوداسی کے گورے گورے ہاتھوں سے دارو کا پیالہ پی رہا ہو گا تا کہ وہ شکست کا

صدمہ بھول جائے۔

دیوراجے کی حماقت کی سزا اس کے سپاہیوں نے بھگتی تھی۔ کتنی خوفناک اور بھیانک سزا بہمنی سواروں کے نیزے اُن کے گردوں کو چیر کر پار نکل گئے تھے اور گھوڑوں کے سموں سے روندی ہوئی لاشوں کی صورتیں تک مسخ ہو چکی تھیں۔

اُن کا بہادر سپہ سالار جسونت راؤ زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا۔ اس نے فولاد خان کے برچھے کا زخم کھایا تھا جو زرہ بکتر کا کاٹتا ہوا اس کے شانے میں اُتر گیا تھا۔ بیجانگر کا زرد پھریرا جس پر جنگلی سؤر کا نشان تھا۔ خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا اور بے سوار گھوڑے ایک طرف گھیر لئے گئے تھے جن کے ہنہنانے کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

فولاد خاں میدان کے وسط میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں کچھ دیر پہلے مہاراج کا شاہی خیمہ نصب تھا۔ اب وہاں بہمنی علم لہرا رہا تھا۔ اور فولاد خاں اس کے نیچے کھڑا اپنے سپاہیوں کی فہرست دیکھ رہا تھا، جو لڑائی میں کام آئے تھے اُن کی تعداد ستر سے زیادہ نہیں تھی مگر فولاد خاں کو اُن جانفروشوں کی موت کا بڑا قلق تھا وہ ظلم و بربریت کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔

شمشیر خاں خود بھی زخموں کی شدت سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کے سر سے دو پیالے خون بہہ چکا تھا اور چہرے پر زردیاں سی کھنڈ رہی تھیں۔ فولاد خاں نے فوراً اس کی مرہم پٹی کا حکم دیا۔ وہ شمشیر خاں ایسے بہادروں پر جان قربان کر سکتا تھا۔ جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے تھے پھر اس نے بتایا کہ ہم اسی میدان میں پڑاؤ کریں گے گھاٹ یہاں سے تین چار کوس کے فاصلہ پر تھا اور دریا کے اس پار "زرد خطرہ" پر پھیلائے کھڑا تھا بہمنی سردار اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا جب تک خطرہ بالکل نیست و نابود نہ ہو جائے۔

کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ہارا ہوا دشمن رات کے اندھیرے میں دریا عبور کر کے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے پھر سرحدی بستیوں پر ٹوٹ پڑے؟

فولاد خاں اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے دیوراجے کے بچ نکلنے کا بے حد افسوس تھا۔ اگرچہ میدان میں تین ہزار کرناٹکی سورماؤں کی لاشیں ابدی خاموشی کی زبان سے اپنے مہاراج کی آشاؤں کا نوحہ پڑھ رہی تھیں اور اب بظاہر کسی نئے حملے کا اندیشہ بھی

نہیں تھا۔ مگر فولاد خاں اُس کی فتنہ جو عادات سے غافل نہیں تھا۔ جو بار بار اُسے دکن کی سرزمین میں قتل و غارت گری پر ابھارتی رہتی تھی۔

شہداء کو دفن کرنے کے بعد دشمن کی لاشیں گڑھے کھود کر دبا دی گئیں۔ طلایہ گردستہ گھاٹ کے قرب و جوار تک چکر کاٹنے لگا۔ سپاہیوں کو آرام کرنے کا موقع ضرور مل گیا مگر انہیں ہتھیار کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ فولاد خاں نے خود بھی زرہ بکتر نہیں اتارا تھا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ جنگ جاری ہے اور یہ جنگ اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک تقدیر دیورائے کے لہو سے فتح نامہ تحریر نہیں کرتی۔

رات ابھی اپنے آشیانہ فلک سے نہیں اُتری تھی۔ صرف مٹیالے اندھیرے رینگنے لگے تھے کہ اچانک فیروز آباد کی سمت سے گرد و غبار کے بادل نمودار ہوئے۔ صرف ایک اشارے پر سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی سنانیں اور تلواریں سنبھالے تیار کھڑے تھے۔ فولاد خاں بہمنی پرچم سنبھالے خود فوج کے آگے موجود تھا۔

غبار کا دامن چاک ہوا اور دکنی سوار گھوڑے دوڑاتے نظر آئے۔ انہیں دیکھتے ہی فوج نے غلغلہ انداز نعرہ بلند کیا۔ سوار قریب آئے تو پتہ چلا شہزادہ حسن خاں خود فوج لئے آیا ہے اور یہ اُس کے دستہ ہراول کے سپاہی تھے۔ ولی عہد کی آمد کی خبر زندگی کی ایک مسرت بخش لہر بن کر دوڑ گئی۔ جنگ کی کوفت سے مرجھائے ہوئے کھردرے چہرے لالۂ صحرا کی طرح کھل اٹھے۔

دیورائے کے حملے کی خبر سنتے ہی شہزادہ حسن نے گھوڑے کی باگ موڑ لی تھی۔ اُس نے کوچ میں ایک پل کی کوتاہی بھی نہیں کی تھی اور بگولے کی مانند اُڑتا آیا تھا۔ وہ اس مرتبہ خود دیورائے کی بابت ایک خطرناک، بھیانک اور تباہ کن عزم کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ بیجانگر کا لٹیرا اس کی محبوبہ کو لوٹنے اور گرفتار کرنے کا ارادہ لے کر مدگل پر حملہ آور ہو۔ شاداب بستیوں کو تاخت و تاراج کرے۔ گاؤں کے گاؤں پھونکتا چلا جائے۔ بے گناہوں کے خون کے چھینٹے اڑائے اور ہر اس شے کو تباہ و برباد کر دے جسے زندگی سے کوئی واسطہ ہو اور وہ خود فیروز آباد کی محلسرا میں آرام کی نیند سو سکے؟

کاگ ایک باز کی کونج پر جھپٹنے کی جسارت کرے اور باز اپنی شکاری اڑانیں بھول کر کسی چٹان کے گوشہ میں دبک جائے؟

ایک کسان کا تیار کھیت بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر کر دیا جائے اور وہ کھیت کی منڈیر پر بیٹھا ملہار کی تانیں اُڑائے؟

پرتھال کی خاطر حملہ..... بس یہ خبر سن کر دیوانہ کر دینے کے لئے کافی تھی غیرت عشق نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا وہ چاہتا تھا۔ ان آنکھوں کو آگ کی مانند دہکتی ہوئی سلاخوں سے پھوڑ دے جو اس کی محبوبہ کی طرف اٹھتی ہیں ان لشکروں کو موت کی وادی میں دھکیل دے جو پرتھال کے گاؤں پر حملہ آور ہوئے تھے دکن کا شہزادہ اتنی طاقت ضرور رکھتا تھا کہ وہ دیورائے کو اس کی گستاخی کی سزا دے سکے اس کی کلائی کو مروڑ دے اس کے ناپاک سینے میں ایک تیر ترازو کر دے جس کے اندر ایک ہوس آلود دل دھڑک رہا تھا۔

دیورائے نے یقیناً اپنی موت کو آواز دی تھی بہمنی خون دشمن کی ہر خطا معاف کر سکتا تھا لیکن اپنے وطن کی دوشیزہ پر..... اپنی عزت اور غیرت پر ہاتھ اٹھانے کا جرم کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔

دیورائے کا جرم اب زندگی کی آخری ہچکی تک اُس کا تعاقب کرے گا کیونکہ بہمنی شہزادہ غیرت عشق کا جوش کھا کر محل سے نکلا تھا۔ اُس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی۔

"اب دیورائے کا بدلہ چکائے بغیر فیروز آباد میں قدم نہیں رکھوں گا۔"

کاش، بیجانگر کے مہاراج نے بہمنی غیرت کا اندازہ لگایا ہوتا۔

شہزادہ پانچ ہزار سرفروشوں کو لے کر چلا تھا۔ آنے والے سواروں نے بتایا تھا وہ اس قدر مشتعل ہے کہ پہلے اس کے چہرے پر غصہ کی ایسی قہر آلود شکن کبھی نہیں دیکھی گئی فولاد خاں نے اگرچہ دشمن کو سانپ کی مانند کچل کر رکھ دیا تھا اور خود مہاراجہ بھی بمشکل اپنی جان بچا کر نکلا تھا پھر بھی ولی عہد کی قسم کا ذکر سن کر وہ تھرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بہمنی شہزادے جو کہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔

ولی عہد کے استقبال کے لئے اس نے فوج کو شاہی آداب کے مطابق آراستہ کیا اور افسروں کو درجہ بدرجہ جگہ دی۔ پرچم اُس نے خود سنبھال رکھا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ابھی اس نے جنگ سے منہ نہیں موڑا۔

شام کے اندھیرے آہستہ آہستہ گہرے ہو چکے تھے اور قطار در قطار دور تک پھیلے

ے سوار ان اندھیروں میں تاریک دھبوں کی طرح ہلتے جلتے نظر آتے تھے۔

فولاد خاں کے حکم پر پندرہ بیس سواروں نے بڑی بڑی مشعلیں روشن کرلیں اور انہیں ...وں پر چڑھا لیا۔ سوار اور گھوڑے ہلکی زرد روشنی میں نہا سے گئے۔ اُن کے زرہ بکتروں، ...ادی گوپیوں، نیزوں، برچھیوں اور تلواروں پر شعاعیں تھرتھرانے لگیں۔ چند گھوڑے ...نائے...... اور دور جھاڑیوں کے جھنڈ میں گیدڑوں کی ہوانک سنائی دی۔ پھر فضا پر خاموشی ...ا گئی۔ اس خاموشی میں شاہی فوج کے گھوڑوں کی ٹاپیں اُبھریں اور ان کی آواز بتدریج ...ر ہوتی چلی گئی۔

ولی عہد کی سواری قریب دیکھ کر سپاہیوں نے ایک مرتبہ پھر نعرہ لگایا ''اللہ اکبر'' کی ...ں شگاف آواز سے فضا گونج اٹھی اور فولاد خاں نے گھوڑا بڑھا کر شہزادے کا خیر مقدم ...ا۔ فولاد خاں یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہ نوجوان شہزادہ لوہے کا لباس پہن کر نکلا ...اور رونق بیگ کے ساتھ دوسرے خاص افسر بھی لوہے میں غرق تھے۔

تو اُس کا مطلب ہے۔ سپاہیوں کی زبانی اُس نے جو کچھ سنا تھا وہ حرف بحرف ...ست تھا اور ولی عہد دیورائے سے نہیں موت سے نبرد آزما ہونے کے لئے آیا تھا۔ اس ...عقب میں پانچ ہزار منتخب جانباز ہتھیاروں سے لیس تھے۔

گھوڑے کی لگام کھینچتے ہی اس نے سب سے پہلے دیورائے کے متعلق سوال کیا۔

''میں بیجانگر کے بدبخت راجہ کے سوا دوسری کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔''

فولاد خاں نے مختصر الفاظ میں دونوں جھڑپوں کی روداد سنائی۔

''اُس کے تین ہزار سپاہی گڑھوں میں دفن کر دیئے گئے ہیں۔''

''لیکن وہ خود بھاگ نکلا۔'' شہزادے کے تلخ لہجہ میں غصہ، نفرت و حقارت کی ...نگاریاں سی اُڑیں، مشعلوں کی روشنی میں فولاد خاں نے اس کے چہرے پر موت کے سائے ...چتے ہوئے دیکھ لئے۔

''تم نے اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟''

''شمشیر خاں نے اُس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ برچھے کا زخم کھا کر فرار ہو گیا۔''

فولاد خاں نے شہزادے کا غصہ دھیما کرنے کی خاطر وضاحت کی ''لیکن اس کے ...روں کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا گیا۔''

"ہم صرف دیوانے کا سر اپنی ٹھوکروں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ابھی وہ دریا کے اس پار ہوگا۔ بھاگ کر کہاں جائے گا؟"

"دریا کے اُس پار۔" شہزادہ بدستور اسی چبھتے ہوئے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ جو تلوار کی مانند تیز تھا۔ "دیوانے کا سر کاٹنے کے لئے ہمیں دریا پار کرنا ہوگا۔"

فولاد خاں نے سرِ اطاعت جھکا دیا۔

"خانہ زاد صرف اشارے کا منتظر ہے میں نے ابھی تک سپاہیوں کو ہتھیار کھولنے کی اجازت نہیں دی۔"

"تو بس ٹھیک ہے ہم آج ہی رات دریا عبور کریں گے۔ مشعلیں گل کر دو اور آگے بڑھو، دیوانے کو اپنے زخم پر مرہم لگانے کی فرصت بھی نہیں ملنی چاہیے۔"

ولی عہد کی بات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ سلطانِ معظم سے جنگ کے احکام لے کر آیا ہے اور اب دیوانے کی موت دکن میں نہیں اس کے اپنے دیس میں ہوگی۔

فولاد خاں فوج کو روانگی کا حکم دینے کے لیے مڑا ہی تھا کہ شہزادے نے اُسے روک لیا۔

"ٹھہرو فولاد خاں! مشعلیں گل کرنے کی ضرورت نہیں۔ دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے انہیں یہیں جلتا رہنے دو۔ فوج کا ایک دستہ یہاں رہے گا تاکہ زخمیوں کی نگہداشت کر سکے۔ باقی فوج ہمارے ساتھ کوچ کرے گی اور رات کے اندھیرے میں ہم دریا پار کرینگے۔"

فولاد خاں نے اس تجویز سے اتفاق ہی نہیں کیا بلکہ اُسے شہزادے کی جنگی قابلیت پر رشک سا آ گیا۔ دریا کے اُس کنارے سے دیوانے کی نگاہیں تمام رات یقیناً اس میدان پر لگی رہیں گی جہاں اُس نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔ جہاں تلواریں خون میں ڈوب ڈوب کر ابھری تھیں جہاں اس کے تین ہزار سورما سپاہی موت کا دارو پی کر ہمیشہ کی گہری نیند سو چکے تھے۔ اس کی نگاہوں کو دھوکہ دینے اور حملہ سے بے خبر رکھنے کے لئے اس قتل گاہ میں مشعلوں کا روشن رہنا کتنا ضروری تھا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ مغل سپاہ پڑاؤ ڈال چکی ہے۔

چند ہی لمحوں کے اندر زخمیوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے ایک دستہ متعین کر دیا گیا۔ سپاہیوں کو ہدایت کر دی گئی کہ مشعلوں کے علاوہ وہ الاؤ بھی روشن کریں تاکہ آگ کی روشنی دور ہی سے نظر آ سکے۔ جسے دیکھ کر دیوانے کے زخمی سینے میں بھی الاؤ دہک اٹھیں۔

تعاقب

شہزادہ دیوارائے کے قتل کا عزم لے کر آیا تھا مگر دشمن کی سرزمین پر اُترنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پرتھال سے ضرور ملنا چاہتا تھا۔ اس کی پیاسی نگاہیں اپنی گل اندام محبوبہ کے چہرے پر بکھرنے اور حُسنِ یار کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں جس کے عشق کی غیرت نے اُسے دیوارائے کے قتل پر اُکسایا تھا اور ظاہر ہے وہ اس ارادہ کو پورا کئے بغیر لوٹنے والا نہیں تھا۔ اگر ایک سنار کی لڑکی نے محض اُس کے پیار کی خاطر بیجانگر کے مہاراجہ کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا تو کیا وہ دکن کا ولی عہد ہو کر اُس کی توہین کا انتقام بھی نہیں لے سکتا؟ محبت کے لئے اُسے خون کے دریا میں کودنا ہی تھا اور نتیجہ جو ہو سو ہو۔ اسی لئے وہ پرتھال سے ملنے۔ اُسے دیکھنے اور اُس سے دو باتیں کرنے کے لئے بے قرار تھا لیکن بے رحم وقت نے اُسے مہلت ہی کب دی تھی کہ اُس سے ملاقات کر سکے۔ رونق بیگ کی زبانی اُسے جو حالات معلوم ہوئے تھے۔ وہ بڑے الم انگیز اور دردناک تھے، موت کے ڈر سے پورا گاؤں پہاڑی دروں میں دُبکا پڑا تھا جیسے بھیڑ بکریوں کو کسی باڑے میں جمع کر دیا جائے اور کیا معلوم ان قیامت خیز دنوں میں اُن لوگوں کو کھانے کے لئے بھی کچھ میسر آیا تھا یا نہیں؟

اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں لپک گیا اُس نے رونق بیگ کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ اپنے سواروں کو لے کر اُن پہاڑی دروں کا رُخ کرے جہاں لکھپت سنار اپنی "جوان پونجی" کو لے کر چھپا بیٹھا ہے۔ وہ انہیں بتائے کہ بہمنی فوجیں دیورائے کی سرکوبی کے لئے پہنچ گئی ہیں اور اب مدگل میں کسی جگہ کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ لوگ پہاڑی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئیں اور حسبِ معمول زندگی بسر کریں۔

رونق بیگ کو اُس نے یہ ہدایت بھی کی۔ وہ پرتھال اور اس باپ کو اپنے ساتھ لے آئے اور واپسی پر اسی میدان میں قیام کرے، اطلاع ملتے ہی میں کچھ دیر کے لئے آؤں گا اور ان سے ملوں گا۔

رونق بیگ یہ خوشخبری بھی ساتھ لے جا رہا تھا کہ تباہ شدہ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے شاہی خزانے سے روپیہ دیا جائے گا اور سب لوگوں کے نقصانات سلطانِ عالی پورے

کریں گے۔

یہ ملاقات کا ایک بہانہ بھی تھا اور اُن کی تسلی اور دل دہی کا ایک ذریعہ جو دیورائے کے وحشی ارمانوں کو پھونک کر خود بھی انتقام کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

اِدھر رونق بیگ اپنے سواروں کو لے کر پہاڑی دروں کی طرف روانہ ہوا۔ اُدھر شہزادہ کی سرکردگی میں فوج دریا کی طرف بڑھی لیکن اُس گھاٹ پر پہنچنے کے لئے جہاں دریا پایاب تھا اُسے کئی کوس کا چکر کاٹنا تھا۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ دشمن کو اس کی آمد کی خبر نہ ہونے پائے اور وہ اچانک اُن کے سر پر پہنچ کر موت کا طبل بجا دے۔

رات کے اندھیروں میں فوج سیدھا راستہ چھوڑ کر اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان پایاب گھاٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ راہبر آگے آگے راستے کی نشاندہی کرتے جا رہے تھے اور گہری تاریکی میں اُن کی نگاہیں چیتے کی سی تیزی اور ہوشیاری کے ساتھ مڑی تڑی پگ ڈنڈی پر دوڑ رہی تھیں۔

گھوڑوں کی رفتار مدھم تھی اور سفر خاموشی کے ساتھ جاری تھا۔ فولاد خاں شہزادہ کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ یہ دونوں سب سے آگے تھے اور راہبروں کے اشارے پر بڑی احتیاط سے گھوڑے بڑھائے جا رہے تھے۔ سب جانتے تھے وہ ایک خطرناک مہم سر کرنے جا رہے ہیں دشمن کی سرزمین پر اپنے سے تین گنا زیادہ فوج سے لڑنے کا فیصلہ یقیناً خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس مہم کی کمان خود ولی عہد کر رہا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے شہزادہ کوئی غلط فیصلہ کرنے کا عادی نہیں، وہ جنگ کی گھات کو سمجھتا ہے اور اپنی سپاہ کو صرف اسی وقت لڑائی کی آگ میں جھونکتا ہے جب کامیابی یقینی ہو آٹھ نو کوس کا چکر کاٹ کر آدھی رات کے قریب فوج گھاٹ پر آ گئی۔

دریائے تنگ بھدرا دکن اور بیجانگر کے درمیان کوہستانی ندی کی طرح پیچ و خم کھاتا ہوا بہتا تھا اور دونوں سلطنتوں میں پانی کی یہی بل کھاتی ہوئی لکیر حد فاصل تھی دریا کا پاٹ کچھ زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن پایاب جگہوں پر جہاں پانی کی روانی کا زور کم تھا اور پاٹ کافی دور تک پھیل جاتا تھا۔

ساحل کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا ایک طویل سلسلہ تھا کہیں کہیں چھتری دار درخت بھی تھے جو رات کے اندھیرے میں کالے کلوٹے دیو نظر آ رہے تھے اور جب ہوا

سے ان کی شاخیں جھومتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے سیاہ فام بھوتنے ناچ رہے ہوں۔ گھاٹ سے تقریباً نصف فرسنگ کے فاصلہ پر گھنے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک ذخیرہ بھی تھا جو کافی دور تک چلا گیا تھا۔ یہ ذخیرہ گیدڑوں کا مسکن تھا۔ جنگلی سؤر اور کبھی کبھار بھیڑیے بھی بسیرا لینے کے لیے اِدھر آنکلتے تھے۔

گیدڑوں کی ہوا تک دور ہی سے سنائی دیتی تھی۔ شاید "پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگا رہے تھے لیکن انسانوں اور گھوڑوں کو دیکھ کر وہ خاموشی سے دبک گئے اور جھاڑیوں میں سے اپنی تھوتھنیاں نکال کر گھاٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

راہبر پانی میں اُتر گئے اِدھر اُدھر چل پھر کر انہوں نے پایاب جگہ کا تعین کیا پھر شہزادہ نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ ولی عہد کی اس جرأت نے سپاہیوں کو ہر خطرہ سے بے پروا کر دیا۔ وہ بھی دیوانہ وار دریا میں کود پڑے۔

ہوا کے سرد جھونکوں سے بعض سواروں کے دانت بجنے لگے ایک تو سردیوں کا زمانہ دوسرے دریائی سفر لیکن ان کے سینوں کے اندر دل انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ پانی یہاں کم گہرا تھا۔ بہاؤ بھی تیز نہیں تھا اور لہروں کے بھنور بھی خطرناک نہیں تھے گھوڑے لہروں کو کاٹتے ہوئے بڑھے اور گھاٹ کی خاموش فضا "شڑپ شڑپ" کی آوازوں سے بیدار ہو گئی۔ کبھی کبھی کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ کی گھنٹیاں سی بج اٹھتیں۔

سیاہ رات میں ستارے جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے اور دریا کی لہروں پر ان کے تھرتھراتے ہوئے عکس یوں رقص کر رہے تھے جیسے سطح آب سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں جیسے دریا کو آگ لگ رہی ہو لیکن جب ایک ساتھ متعدد گھوڑے پانی کو کاٹنے لگے تو لہروں کے ارتعاش کے ساتھ روشنی کے دیئے تیز تھرتھراہٹوں میں ہچکولے کھاتے ہوئے پانی میں ڈوبنے لگے۔ کرنوں کے خطوط سیماب کی لکیروں کی مانند بھاگے دوڑے اور ٹوٹ گئے۔

ستاروں کے دیئے بجھتے رہے فوج دریا کو پار کرتی رہی اور تھوڑی ہی دیر میں سات ہزار جنگی سوار دشمن کی سرزمین پر جا اترے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بھی جھاڑیوں، سرکنڈوں کا سلسلہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلا تھا اور اُن سے پرے پہاڑی ٹیلے شروع ہو گئے تھے جو بیجانگر تک پھیلے ہوئے تھے۔

دیورائے کی فوج تک پہنچنے کے لئے اب انہیں چار پانچ کوس واپس چلنا تھا اور شہزادہ حسن نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ فولاد خاں کے سپرد کر دیا اور حکم دیا کہ وہ ساحل کے ساتھ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھے، دوسرا حصہ اپنے ساتھ رکھا جسے دریا کا ساحل چھوڑ کر آگے بڑھنا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ سب سے پہلے فولاد خاں گھاٹ کی جانب سے حملہ کر دے اور شہزادہ بالکل اس کی مخالف سمت سے دشمن پر ٹوٹ پڑے اس نے ہدایت کی دیورائے اگر ہاتھ لگے تو اُسے زندہ گرفتار کیا جائے۔ شاید وہ حسن کے مجرم کو پرتھال کے حضور قیدی بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ فوج دو حصوں میں منقسم ہو کر تیزی کے ساتھ آگے بڑھی۔ رات ڈھلنا شروع ہو گئی تھی اور وہ جلد سے جلد دشمن کے سر پر پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ اسے خواب خرگوش سے بیدار کرنے کا لطف اٹھا سکیں۔

رفتار تیز تر کر دی گئی دونوں دستے موت کے خطوط بن کر دیورائے کی طرف بڑھنے لگے۔

اس بات کا خطرہ بھی تھا کہ دشمن کے پہریدار کہیں خبردار نہ ہو جائیں ان کی غفلت ہی بیجانگر کے مہاراج کے لئے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ وہ شکست کھا کر بھاگا تھا اس نے دریا کے گھاٹ پر یقیناً کڑا پہرہ لگایا ہوگا تاکہ بہمنی لشکر شب خون نہ مار سکے لیکن حملہ آور نہایت خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے جیسے موت رینگتی ہے۔

''خون کی تحریریں''

پچھلی رات کا زرد چاند آہستہ آہستہ اُفق پر اُبھرنے لگا اور کپاس کے پھولوں کی مانند زرد شعاعیں بلند درختوں کی شاخوں پر بکھرنے لگیں، رات کے پچھلے لمحوں میں ہر شے نیند کے اتھاہ سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چاروں طرف بھیانک اور مہیب سناٹا طاری تھا لیکن گہرے سناٹے میں ساحل کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک پُراسرار، پُرہول سی آوازیں اُبھری جیسے دور کہیں موت کے گھنگرو بج رہے ہوں۔

ہاں یہ موت کے کارواں کی گھنٹیوں ہی کی تو آواز تھی۔ فولاد خاں اپنا لشکر لئے ساحل کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔

دیورائے کی فوج گھاٹ سے صرف ڈیڑھ کوس ہٹ کر خیمہ زن تھی اور اس کے خیمے کم وبیش ایک کوس تک چلے گئے تھے۔ لشکر گاہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سرما کے چاند کی

دھم سی زرد روشنی میں خیمے سیاہ دھبے سے بن کر رہ گئے تھے۔

سیاہ چیتا جب شکار کے لئے نکلتا ہے۔ تو بلی ایسے نرم قدموں سے چلتا ہے اور تیز نگاہیں اندھیروں کو چیرتی ہوئی اپنے شکار کو بھانپ لیتی ہیں۔ مدگل کے چیتے نے بھی دشمن کا پڑاؤ ڈھونڈ نکالا تھا۔

تین ہزار سوار دائیں بائیں ایک کوس طویل خط بنا کر پھیل گئے پھر جس طرح کمان سے تیر چھوٹتے ہیں فولاد خاں کے اشارے پر وہ اپنے گھوڑے اڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔

کرناٹک کے طلایہ گرد محافظ جو لشکر سے صرف اڑھائی سو گز کے فاصلہ پر پہرہ دے رہے تھے۔ پہلے ہی حملہ میں لقمۂ اجل ہو گئے۔

سپاہی اپنے خیموں میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے لیکن تین ہزار گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آواز خوفناک دھماکے کی مانند ان کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ ہڑ بڑا کر اُٹھے لیکن موت ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ جلدی جلدی تلواریں سنبھال کر وہ خیموں سے باہر نکلے۔ مقابلہ بے سود تھا۔ حملہ آوروں نے آتے ہی انہیں نیزوں کی باڑھ پر رکھ لیا اور لشکر گاہ میں دردناک چیخیں گونجنے لگیں۔ موت کے دیوتا رقص کرنے لگے۔ نیزوں کے پھل خون میں ڈوب گئے اور زندگی کی تلاش میں بیجانگر کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔

دیورائے اپنے پُرتکلف خیمے میں اُس زخم کی شدت سے تلملا رہا تھا۔ جو شمشیر خاں کے ہاتھ سے کھا کر آیا تھا جب اُسے خبر دی گئی کہ بہمنی سواروں نے موت ایسے نرم قدموں کے ساتھ دریا عبور کر کے شب خون مارا ہے اور اس وقت ایک ہزار کے قریب سپاہی خاک و خون میں تڑپ کر ٹھنڈے ہو چکے ہیں تو وہ دم بخود رہ گیا۔

یہ خبر اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھی وہ جانتا تھا۔ فولاد خاں کی رکاب میں ڈھائی ہزار سے زیادہ سوار نہیں ہو سکتے اور اتنی قلیل تعداد کے ساتھ بیس ہزار کے لشکر جرار پر حملہ کرنا اگر اپنی موت کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں تو اور کیا تھا؟ شاید جوشِ انتقام میں بہمنی سردار پاگل ہو گیا ہے۔ دیورائے خونی بھیڑیے کی طرح غرایا۔

''یقیناً فولاد خاں کی موت ہی اُسے گھیر کر لائی ہے۔'' پھر اس نے حکم دیا۔

''دشمن کو روکو، تلواروں سے اس کا سواگت کرو۔ آج وہ جان لے گا کہ شیر کی کچھار پر چڑھ دوڑنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

آہ بد قسمت دیورائے جو اتنا بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ فولاد خاں نہیں بلکہ دکن کے و
عہد شہزادہ حسن کی تلوار تھی جو بجلی کے کوندے کی طرح اس کے سر پر جگمگائی تھی۔

جلدی جلدی ایک سپاہی نے اُسے زرہ بکتر پہنایا۔ سر پر فولادی ٹوپی رکھی۔ کمر می
پٹکا اور شمشیر باندھی اور وہ لپک کر باہر آیا۔ اس کا خیمہ لشکر گاہ کے وسط میں تھا اور شاہی خی
سے صرف تین چار فرلانگ کے فاصلے پر بہمنی سوار بیجانگر کے سپاہیوں کو کاٹ رہے تھے۔

مہاراجہ گھوڑے پر سوار ہوا تو فوج کے بڑے بڑے افسر، راؤ اور مہاماتر اُس کے گر
اکٹھے ہو چکے تھے۔ سالارِ فوج وردھن سر جھکائے حاضر تھا اور راج گورو اس کے پہلو می
کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ کیا حکم دیتا ہے۔

"دشمن کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں۔ اُسے اپنی جیت کا گھمنڈ ہے مگر اس
یہ گھمنڈ توڑ ڈالو۔ ایک بھی سوار زندہ بچ کر نہیں جانا چاہیے۔"

وردھن یہ حکم سنتے ہی ہوا ہو گیا۔

بہمنی سواروں نے لشکر کا ایک بازو صاف کر دیا تھا۔ اب وردھن نے دوسرا بازو آ
بڑھایا لیکن سواروں اور پیادوں کی جنگ میں پلہ گھوڑ سواروں ہی کا بھاری ہوتا ہے دیورا
بھی اپنے مصاحبوں کے ساتھ آگے بڑھا۔

نیند میں ڈوبے ہوئے سپاہی آنکھیں ملتے ہوئے جاگتے اور موت کی بھٹی میں جھونک
دیئے جاتے۔

جب زرد چاند نے اُفق سے سر ابھار کے دیکھا تو دریائے تنگ بھدرا کے جنو
مشرقی گھاٹ کی دھرتی پر کرناٹکی سپاہیوں کا خون اپنے مہاراج کے "ہوس آلود عشق"
داستان تحریر کر رہا تھا۔ دکن کی مہ جبین حسینہ کو پابہ زنجیر لے کر آنے کی تمنا رنگ لا رہی تھی
پرتھال کے جلتے ہوئے گاؤں کا دھواں چتا کی بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل ہو چکا تھا
اب بیجانگر کی سرزمین پر مدگل کی بستیوں کو تاخت و تاراج کرنے کا حساب بیباق کیا جا
تھا۔

سینکڑوں لاشیں خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔ بہمنی سواروں کے نیزے سینو
میں اور تلواریں گردنوں پر چمک رہی تھیں۔ زخم کھا کھا کر گرنے اور تڑپنے والے سپاہیوں
دلدوز اور جگر خراش آوازوں سے قیام گاہ میدانِ حشر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ موت کے

وہاں اور کچھ نہیں تھا اور اگر کچھ تھا تو دیورائے کی ہاری ہوئی تقدیر۔

مہاراجہ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ ناقابلِ یقین اور ناقابلِ برداشت منظر اس کی روح مدافعت کو زخمی اور نحیف و نزار کر دینے کے لئے کافی تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بیس ہزار بہادر صرف دو اڑھائی ہزار سواروں کا مقابلہ کیوں نہیں کر سکتے اور دشمن کے ہاتھوں بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ذبح کیوں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے وہ لڑائی کے تمام گر بھول چکے ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے جھرجھری سی آ گئی لیکن کچھ بھی ہو بہرحال اس وقت وہ اپنے دیس میں تھا۔ اپنی سرزمین پر اپنی "گلی" میں اس نے جنگ کو ترجیح دی...... آگے بڑھ کر سپاہیوں کو للکارا اور وجے نگر کے تازہ دم بہادروں کا ایک دستہ آگے بڑھایا جو اتنی دیر میں ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح ہو چکا تھا۔

یقیناً اب تلوار ہی فولاد خاں اور دیورائے کے درمیان فیصلہ کرے گی۔

سواروں نے ایک مرتبہ پھر پیادوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ وجے نگر کے بہادروں میں ایک ہزار گھوڑا سوار بھی تھے۔ جو محاذ پر پہنچ گئے تھے۔ دیورائے نے ان کو جنگ میں دھکیل دیا۔ پیادہ سپاہی زخم کھا کر بھاگ نکلے تھے۔ بیجانگر سے اِدھر اب اُن کی اور کوئی..... منزل نہیں تھی۔

لیکن بیجانگر دور تھا اور موت کی منزل قریب تھی۔

جنوب کی طرف سے شہزادہ حسن کے چار ہزار سوار عقاب کی مانند جھپٹے اور میدان جنگ سے بھاگنے والے پھر خونخوار بھالوں کی زد میں آ پھنسے ولی عہد نے لشکر گاہ کے جنوبی بازو پر ہلہ بول دیا تھا۔

صبح کاذب کا مکرا اُجالا دیورائے کے سیاہ اعمال پر خون کی لکیریں کھینچتا ہوا طلوع ہوا۔ جب اس نے اپنے عقب میں بھی تلواروں اور نیزوں کی چمک دیکھی تو سکتہ میں آ گیا دوسرے لمحے ایک سپاہی نے یہ دل شکن خبر سنائی۔

"مہاراج! پیچھے سے دکن کا ولی عہد اپنی فوج لئے بڑھا آ رہا ہے میری آنکھوں نے پانچ چھ ہزار سواروں کو دیکھا ہے۔"

صبح کی ٹمیالی روشنی میں جنوب کی سمت سواروں کا بادل بڑھتا ہوا نظر آیا۔ دکن کے سیاہ پرچم صبح کی ہواؤں میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔

"دکن کا ولی عہد۔ شہزادہ حسن خان نے۔۔۔ [illegible] اپنے لئے [illegible] جانباز دل والے
سپاہی نہیں ہوں گی۔ جب شہزادے جنگ لڑ سکتے ہیں تو [illegible] ساتھی [illegible] ان کے
پرچم تلے [illegible]
[illegible] کی طرح [illegible]
[illegible]
[illegible] تمام [illegible]
[illegible]
[illegible] آب [illegible]
خود اس کو ڈھونڈتی [illegible] ہر لمحہ [illegible] قریب آتی جا
رہی ہے۔۔۔۔ ایک طرف فولاد خان اور دوسری طرف۔۔۔۔ شہزادہ حسن [illegible] کی طرح
[illegible] حملہ کر دیا
[illegible]
[illegible]
موت کی چوکھٹ پر دم توڑ چکے تھے۔

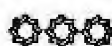
تلواروں کی جھنکار کے ساتھ ہی [illegible] آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور فضا میں
[illegible] موت کا [illegible] آ رہے
[illegible]

وردھن چکر کاٹ کر دیوانے کے سامنے آیا اور سر جھکا کر بولا۔ [illegible]
[illegible] آپ اپنی جان بچا لیجئے [illegible]
[illegible] گھوڑے [illegible]
اس جھنڈ کی طرف سرپٹ بھاگا۔ جا [illegible]
ہوا تھا جب [illegible] میں عام
بھگدڑ مچ گئی۔ بھمنیوں نے اپنے گھوڑے تعاقب میں ڈال دیے اور [illegible] جلد
جلد حساب [illegible]

بھمنی فوج کا ہر سوار دیوانے کو تلاش کر رہا تھا۔ [illegible]

اور سواروں کے حلقہ میں کھڑا شہزادہ حسن کف افسوس مل رہا تھا کہ دیوراے ہاتھ سے نکل گیا۔ دور دور تک پڑی ہوئی لاشوں کو بغور دیکھ لیا گیا تھا۔ ان میں بیجانگر کے مہاراج کی شکل دکھائی نہ دی۔ وہ ایک مرتبہ پھر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے نو ہزار سورما میدان میں کھیت رہے اور صرف دو ہزار زخمی گرفتار ہو سکے تھے۔ ولی عہد کو قیدیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے فولاد خاں کو حکم دیا کہ اسی میدان میں پڑاؤ کیا جائے اور گھوڑے سے اتر آیا۔

[illegible]



[illegible]

[illegible]

6

محبت کی دھڑکنیں

بدشگونی

تنگ و تاریک اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے پہاڑی درے انسانوں کا مسکن بن گئے تھے۔ اور موت کے خوف سے وہ ان اندھیرے غاروں میں یوں دبک گئے...... جیسے خوف بھیڑیئے کے ڈر سے بکریاں باڑے میں سہم جاتی ہیں۔

کھردری چٹانیں، آڑے ترچھے، چوکور، مدور اور نوکیلے پتھر، گرد و غبار، مکڑیوں کے جالے، چمگادڑوں کی بیٹیں، گھٹی گھٹی سی متعفن اور بوجھل فضا، یہاں اور رکھا ہی کیا تھا۔ بس یہی غنیمت تھا کہ ان پہاڑوں کے کھوکھلے سینوں میں انہیں پناہ مل گئی تھی۔

انہی دروں میں دو وقت آگ روشن ہوتی تھی اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے جو کچھ میسر آ جاتا پکا لیا جاتا۔ جب لکڑیاں سلگتیں اور دھوئیں کی سیاہ لکیریں دروں کی تاریک فضا میں پیچ و خم کھانے لگتیں تو کتنی دیر تک "کھوں کھوں" کی آوازیں پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی رہتیں اور پہاڑوں کا سینہ جلتا۔ سلگتا اور دُکھتا رہتا بعض اوقات تو بوڑھوں کی کھانسی رُکنے کا نام ہی نہ لیتی لیکن انہیں مجبوراً سانس روکنا پڑتا کڑوے دھوئیں سے بچوں کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلتا اور بوڑھوں کی "کھوں کھوں" کے ساتھ بچوں کی "زوں زوں" بھی شروع ہو جاتی۔ مگر یہ سب آوازیں پہاڑی دروں میں گھٹ کر رہ جاتیں۔

خوف اور دہشت کے مارے کئی ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو گیا تھا وہ اپنے معصوم بچوں کو تھپک تھپک کر بھوکا ہی سلا دیتیں اور خود سینے پر پتھر کی سل رکھ کر لیٹ رہتیں

یں۔ فضا میں ایک عجیب سا تعفن تو پہلے ہی گھل رہا تھا۔ اب سانسوں کے دباؤ سے ہوا زیادہ کثیف اور بوجھل ہو گئی تھی ان کا جی چاہتا تھا وہ کھلی فضا میں سانس لیں لیکن یہ خطرہ ون مول لیتا؟

سب جانتے تھے باہر موت ہے درندگی ہے۔ بیجانگر کے سوار اور ان کے خوفناک الے ہیں جن کے پھل سیدھے کلیجوں میں اترتے ہیں پھر وہ باہر کیوں نکلتے؟ اور زندگی تو رف ان تنگ و تاریک دروں ہی میں سمٹ آئی ہے جہاں تعفن تھا، اندھیرا تھا، دھواں تھا، کھوں کھوں" اور "زوں زوں" تھی موت کے ڈرے سہمے ہوئے مجبور انسانوں کے گھرے ہرے سانس تھے جن سے فضا اور بوجھل ہوئی جا رہی تھی۔

وحشت اور دہشت کے مارے پورا گاؤں لمبے لمبے پہاڑی غاروں میں گھس آیا تھا وہ ن اجڑی ہوئی تباہ حال بستیوں کی کہانی سن چکے تھے جنہیں بیجانگر کے سواروں نے کمینوں یت جھلس ڈالا تھا۔ کتنے معصوم بچے شعلوں میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے تھے کتنی بلکتی وئی ماؤں کی ممتا جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ کتنے نردوش بے گناہ آدمی بھالوں اور تلواروں کا کار ہو گئے تھے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تھا کہ بیجانگر کا مہاراج ہر اس شے کو نیست و بود کرنے پر تل گیا تھا۔ جو اس کے پاؤں کی ٹھوکر اور پرتھال کے سر کے درمیان حائل ہو کتی تھی وہ اس مغرور حسینہ کو زندہ گرفتار کرنے کی سوگند کھا کر نکلا تھا۔ جس نے بیاہ کے پیام کا جواب خنجر کی نوک سے دیا تھا۔ وہ اس کے سندر روپ کو شعلوں کی چتا میں جلا کر بھسم کر دینا چاہتا تھا تاکہ آئندہ کوئی کنواری مہاراج کو خنجر دکھانے کی جرأت نہ کر سکے جبھی تو اس نے دریا عبور کرتے ہی تباہی و بربادی کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔

یہ تو لکھپت سنار ہی تھا۔ جس نے بھیانک خطرے کی بو دور ہی سے سونگھ لی تھی اور حسوس کر لیا تھا۔ کوئی نہ کوئی خوفناک مصیبت آنے والی ہے۔ پھر اس نے مکھیا کا کا سے کہہ کر گاؤں والوں کو پہاڑوں کی طرف ہانک دیا اور وہ ان دروں میں آ کر دبک گئے تھے ورنہ جہاں ان کا گاؤں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ وہاں خود بھی جل مرے ہوتے بستی کو پھونک کر دیو رائے اگرچہ واپس چلا گیا تھا لیکن مدگل کی فضاؤں میں خطرے کے گدھ ابھی تک اپنے منحوس پروں کو پھڑپھڑا رہے تھے اور یہ متعفن، تنگ و تاریک درے اسی بستی کی کھلی فضا اور صاف ہوا سے کہیں بہتر تھے۔ جس کے آس پاس موت گھات لگائے بیٹھی تھی۔

پہاڑوں کی ترائی ہی سے گھنے جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا لیکن بڑے بڑے
چھتری دار درختوں اور جھاڑیوں نے گویا ایک چہار دیواری کی شکل اختیار کر لی تھی [illegible]
رات کے اندھیرے میں چند نوجوان پہاڑی غاروں سے باہر نکلتے اور قریبی
چشمے سے پانی کے گھڑے بھر لاتے تھے ورنہ دن کے وقت تو ادھر کسی انسان کا سایہ بھی نظر
نہ آتا تھا اور ان اونچے نیچے پہاڑوں کو دیکھ کر کوئی شخص یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ان
کے پیٹ کھلے ہیں جو سینکڑوں انسانوں کا مسکن بن چکے ہیں۔ جہاں "کھوں کھوں" اور "ٹھوں ٹھوں
زوں" کی آوازیں ضرور گونجتی ہیں لیکن پہاڑوں کے اندرونی حصوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی
ہیں۔

بوڑھے لکھپت نے ایک چھوٹی سی مشعل تیار کر لی تھی۔ جسے وہ کونے میں لگا کر روشن
کرتا تھا۔ اس کی مدھم شعاعیں طویل غار کے اندھیرے کونوں تک تھرتھراتی آتیں۔ جس کی روشنی
میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ پہلے روز تو اندھیرے میں انہیں یہ بھی پتہ نہ چل
سکا کہ کون ... کہاں بیٹھا ہے ... وہ مشعلوں کی لوؤں کی مانند چمکتی دیواروں کے ساتھ
لگ کر بیٹھ گئے تھے اور ساری رات انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ [illegible]
دن بھی کچھ اسی طرح گزر رہے تھے وہ مجرم تھے اور بھاری دلوں کے ساتھ [illegible] کا حکم
سننے کی خاطر جمع ہو گئے تھے [illegible]
بچوں کے [illegible] آوازوں [illegible]
"ہے بھگوان ...... ہے بھگوان" کی ایک دل فگار سی پکار تھی [illegible]
کبھی گہری سسکی پر ٹوٹتی تھی۔

تیسرے روز [illegible] خبر لائے [illegible] اور جنگل [illegible] کے
درمیان ایک خوفناک جنگ ہوئی ہے جس میں [illegible] فتح [illegible] بھاگ نکلا ہے اور
دیوان [illegible] کے [illegible] جنگل کی طرف [illegible]
[illegible] خبر سن کر ان کے چہرے [illegible] ان کی آنکھوں [illegible]
سے ایک [illegible] خوف جھانکنے لگا۔ کانوں میں [illegible] بجنے لگیں [illegible]
کی [illegible] لکھپت [illegible]
"لکھپت چاچا اب کیا ہوگا؟"

شکست کی خبر سن کر کھسیت خود بدحواس ہو گیا تھا۔ کھیا کے پتے جیسے بدن پر بھی ایک نامعلوم سی لرزش طاری تھی سب لوگ سہم گئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے اب کیا ہو گا... کیا دیوراج کا قہر و غضب انہیں پہاڑوں کے سینوں سے بھی ڈھونڈ نکالے گا [illegible]

سب کو خاموش اور گم صم دیکھ کر ایک تحیر آمیز آواز ہوتے ہوئے بلند ہوئی۔ "دل چھوٹا نہ کرو...... دیوراج کا ظالم ہاتھ ہمارے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔ دکن کے راجکمار کوئی دن میں آیا چاہتے ہیں۔ یہ ویرانے بھی خوبصورت بستی لگنے لگے گی۔"

یہ بھتال تھی جس کی پرترنم آواز ایک جادو کی طرح ابھری اور غار کے آخری گوشے تک بکھر گئی۔ وہ سب کے سب بھتال کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک کونے سے کھیا کی بوڑھی آواز تھرتھرائی۔

"ہاں یہ بھتال ٹھیک کہتی ہے۔ دکن کے راجکمار جلد ہی آ پہنچیں گے اور......"

ابھی بوڑھے نے اپنا فقرہ بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک بڑی سی عجیب چمگادڑ کسی چٹان کی دراڑ سے نکل کر اپنے لمبے لمبے پروں کو پھیلاتی، مشعل کے گرد چکر لگانے لگی۔ اسے دیکھ کر دو تین لڑکیوں کی ایک ساتھ چیخ نکل گئی۔ اتنے میں چمگادڑ بڑی تیزی کے ساتھ مشعل کی جانب جھپٹی [illegible] مشعل ایک جھٹکے کے ساتھ بجھ گئی۔ یکلخت طویل غار میں اندھیرا [illegible] سناٹے میں چمگادڑ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی [illegible] فضا میں چکر کاٹ رہی تھی۔ [illegible] مشعل [illegible] چمک گئی [illegible] لمحے وہ تیزی کے ساتھ ایک چٹان سے ٹکرائی اور [illegible] نیچے آ گری [illegible] تاریکی میں [illegible] رینگتے اندھیرے میں تھرتھراتی خوشیاں [illegible]

جب مشعل دوبارہ روشن ہوئی تو [illegible] تھرتھرائیں جیسے مرگھٹ میں [illegible] خوفزدہ تھے [illegible] آنکھوں کی [illegible]

مشعل کا بجھنا اور چمگادڑ کا مرنا یقیناً ایک منحوس سانحہ تھا اور [illegible]

کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ سب کسی گہری فکر میں ڈوب گئے تھے گم صم کھیا کاکا کی بوڑھی کھال کی جھریاں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر خوف کے سائے لرزاں تھے۔ وہ ہولے ہولے زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شاید اس نحس شگن سے ڈر کر پرارتھنا کر رہا تھا۔ گوری اس کے قریب ہی ایک کونے میں دبکی بیٹھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

پرتھال نے اُن کے چہروں پر ایک نئے خوف کو کروٹیں لیتے دیکھ لیا تھا اور وہ بھانپ گئی تھی۔ اُس وقت ان کے دلوں میں کیا کھد بد ہو رہی ہے۔ ان پر سب تباہی، بربادی اور مصیبت محض اسی کی وجہ سے آئی تھی۔ اس کا سندر روپ اُن کے لئے موت کا خطرہ بن گیا تھا لیکن وہ خاموش تھے، اُن کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر حُسن کی قوت سے مرعوب ہو گئے تھے یا پرتھال کو انہوں نے کوئی اعلیٰ ہستی سمجھ لیا تھا ورنہ کل تک جس کی جوانی پر اُنگلیاں اُٹھتی تھیں۔ گھر گھر باتیں ہوتی تھیں اور لوگ جس کے بیاہ سے انکار کا ذکر سن کر دانتوں میں اُنگلی داب لیا کرتے تھے۔ آج وہی سندر کنیا ان کے نزدیک پوتر ساوتری...... آکاش کی دیوی اور مقدس اپسرا کا روپ دھار چکی تھی جس نے ساہو کاروں، بڑے بڑے زمینداروں اور امیر لوگوں کے رشتے ٹھکرا دیئے۔ چوہان سردار رائے تندکار کا پیغام قبول نہ کیا اور بیجانگر کے مہاراج دیورائے کے رنواس کی مہارانی بننے سے انکار کر دیا۔ وہ یقیناً کوئی معمولی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ احساس تھا جس نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی زبانوں پر خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔ عورتیں اُسے ایسی نگاہوں سے دیکھتیں۔ جن میں ایک عجیب سا تحیر لرزتا تھا اور جوان لڑکیوں کے دلوں میں تو بیک وقت حسد اور رشک کے جذبات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے وہ سوچتیں کاش کوئی رائے تندکار اُن کے بھی بیاہ کا سندیس بھیجتا۔ ان کی خاطر بھی کسی مہاراجہ کی سواری آتی اور وہ شاہی چتر کے سایہ میں راج سنگھاسن پر کسی مہاراج کے پہلو میں بیٹھتیں لیکن ان کے خیال کے ہر دائرے میں بس پرتھال ہی رقص کرتی۔ اسی کا سندر روپ جلوے بکھیرتا اور اب ان کی خوفزدہ...... وحشت آلود نگاہوں نے پرتھال کو یوں گھیر لیا تھا۔ جیسے وہ پوچھ رہی تھیں۔

"اے سندری! تمہارا روپ ابھی اور کیا گل کھلائے گا؟ ہمارے سروں پر منڈلانے والی نحوستیں کب ختم ہوں گی؟"

پرتھال جانتی تھی۔ چمگادڑ کی موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں اُن کے یہاں پناہ گزیں ہونے سے پہلے یہ پہاڑی درے انہی منحوس پرندوں کے مسکن تھے اور ہر شام ایک دو نہیں بیسیوں چمگادڑیں چٹانوں کی دراڑوں اور پتھروں کے سوراخوں سے نکل کر سرِ شام ہی فضا میں منڈلایا کرتی تھیں۔ یہی اُجاڑ سنسان اور ویران غار اُن کی سورگ تھے لیکن جب اس "سورگ" میں انسان آبسے تو وہ چیخیں چلاتی اور لمبے لمبے پروں کو پھڑ پھڑاتی کسی نامعلوم جگہ کی طرف پرواز کر گئیں۔

اور لوگ تو مصیبت کے وقت خواہ مخواہ ہر بات سے شگون لیتے ہیں۔ دل کے کسی گوشہ میں دبکا ہوا خوف نحوست کے سیاہ نقاب اوڑھ کر باہر آ جاتا ہے اور آنے والی خیالی مصیبت کے تصور ہی سے کانپنے لگتے ہیں بدشگونی کا یہی سانحہ یہاں پیش آیا تھا۔ سب کے سب یوں ہراساں نظر آ رہے تھے جیسے سچ مچ اُن کی موت کے فرمان جاری ہو چکے ہوں۔

سکھ دیو کاکا کی بڑبڑاہٹ ابھی تک جاری تھی اور لکھپت سہمی سہمی نظروں سے چمگادڑ کی سیاہ لاش کو گھور رہا تھا۔ مرگ آسا خاموشی سے تنگ آ کر وہ تعجب سے بولی۔ "بابا....! کیا تم بھی......"

اور لکھپت کی نگاہیں بیٹی کی طرف پلٹیں وہ حیران نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ "ہاں بیٹی! میں بھی......"

"یعنی تم بھی یہی سمجھتے ہو۔ ہم پر کوئی مصیبت آنے والی ہے؟"

"تو نہیں جانتی بیٹی! چمگادڑ ایک منحوس پرندہ ہے سیانے کہتے ہیں اس کا سر پر منڈلانا بُرا شگن ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی کشٹ آتا ہے۔"

لکھپت سنار نے جیسے لوگوں کے دل کی بات کہہ دی تھی انہوں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلائے اور اس کی تائید کر دی۔ سب لوگوں کے دلوں میں یہی اندیشہ رینگ رہا تھا۔ کوئی نئی مصیبت، نئی تباہی منہ کھولے ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔

"تم سمجھے نہیں بابا—" پرتھال کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "چمگادڑ بے شک ایک منحوس پرندہ ہے مگر اس کے مرنے سے ہمارے سر پر منڈلانے والی نحوست ختم ہو گئی ہے کٹھن سے بیت گیا ہے کشٹ کٹ گیا ہے اب ہمیں کوئی چنتا نہیں کرنی چاہیے۔"

لکھپت کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے اس کے حلق کی گہرائی سے بمشکل مدھم سی آواز نکلی اور حیرت و استعجاب نے ایک لفظ کی شکل دھار لی۔ وہ لفظ تھا۔

"پرتھال بیٹی!"

"مجھ پر وشواش رکھو بابا! چمگادڑ کی موت نے چیتاونی دی ہے کہ ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا۔" پرتھال کے لبوں کے گوشوں پر ابھی تک ایک جیتنی ہوئی ... جسم لرز رہا تھا جس نے چمگادڑ کی موت کی جسے وہ بدشگونی سمجھ بیٹھے تھے ایک ایسی عجیب اور انوکھی تعلق بیان کی تھی کہ سب لوگ حیران رہ گئے پھر ایک کونے سے بیکھو دیوکا کی آواز سنائی دی۔

"ہاں پرتھال سچ کہتی ہے۔ جانو اب دکھ کا سماں بیت گیا نحوست چمگادڑ مر گیا ہے۔" وحشت اور خوف کے سائے سمٹ کر ایک نقطے میں تبدیل ہو گئے۔ لوگوں کے چہروں پہ تازگی سی لہرا اٹھی لیکن مسرت کے اس احساس میں ایک تعجب ابھی تک انہیں پاگل سا بنائے ہوئے تھا وہ سوچ رہے تھے کہیں لکھپت سنار کی سندر بیٹی سچ مچ ایک دیوی تو نہیں جس نے پرتھال کے روپ میں جنم لیا ہو آخر وہ ایسی باتیں کس طرح سوچ لیتی ہے جو عام انسانوں کی فکر سے بہت بلند ہیں۔ ضرور اسے گیان ہوتا ہے اور اس کے سر پر مہادیو شنکر جی کا ہاتھ کا سایہ ہے۔

ایک ساتھ ان کے ہونٹ تھرتھرائے اور پہاڑ کا کھوکھلا سینہ ایک ہلکی سی گونج سے تھرتھرا اٹھا۔

"پرتھال دیوی کی جے!"

پھر غیر ارادی، غیر شعوری طور پر ان کی گردنیں جھک گئیں انہوں نے مہا شنو کی سندر جھلک دیکھ لی تھی۔

اچانک دروں میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی دھمک ابھری یوں جیسے سینکڑوں سوار پہاڑی غاروں کی طرف بڑھ رہے ہوں بات کچھ سنانے میں گھوڑوں کے سم پتھروں سے ٹکرا کے ایک عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ جو ہولے ہولے بتدریج قریب آتی جا رہی تھی۔

لکھپت کی بھویں سکڑ گئیں آنکھوں میں الجھن ... لوگوں نے حیرت ... اس کے سکون کو منتشر ہوتے دیکھا۔ ایک ساعت کے اندر ہی اندر دروں میں پھر خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی گھوڑوں کی ٹاپیں دلوں کی دھڑکنوں میں تحلیل ہونے لگیں آنکھوں کی پتلیاں حیرت، خوف اور وحشت سے پھیل گئیں۔

[illegible] ٹاپوں کی آواز قریب [illegible] اور قریب آتی چلی گئی اور دلوں کی دھڑکن تیز...... تیز...... اور تیز ہوتی چلی گئی [illegible]

پھر ٹاپوں کی آواز تو پہاڑوں کے پُراسرار سکوت میں ڈوب گئی اور اس سکوت سے انسانی آوازیں ابھرنے لگیں۔ شاید آنے والے سواروں نے ڈیروں کو گھیر لیا تھا اور اپنے اندر داخل ہونے کے متعلق صلاح مشورہ کر رہے تھے [illegible]

[illegible] خوف اور دہشت کے مارے [illegible] اندر دبکے ہوئے انسان پتھر کے بت بن گئے [illegible] جیسے ان کی قوت گویائی [illegible] تراشیدہ پتھروں کی مانند بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے تھے۔ ابھی ابھی ان کے دھڑکتے ہوئے دلوں نے جس خطرہ کی [illegible] آ پہنچا تھا [illegible] ان کی نبضیں ڈوبنے لگیں [illegible] پھر ان کی [illegible] نگاہیں [illegible] قتالہ کو اٹھتے [illegible] دیکھ رہے [illegible] کی طرف [illegible]

”تو کیا اس نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ [illegible]

[illegible] لیکن کسی میں [illegible] نہیں تھی [illegible] قتالہ بیوی! ہمارے جیتے جی موت تمہیں [illegible]

مگر وہ [illegible]

[illegible]

”شکر ہے میں ٹھیک جگہ پہنچ گیا ہوں۔ ورنہ یہ پہاڑی رستے تو بھول بھلیاں [illegible] نہیں پھر یہ [illegible]“

[illegible] ”میں [illegible] تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ قتالہ کہنے لگی [illegible] حال میں [illegible]

اُس کی آواز میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ تھی۔ ایسی کپکپاہٹ، ایسی لرزش جو دکن کی عورتوں کی زبان پر صرف اپنے محبوب کا ذکر کرتے وقت طاری ہوتی ہے۔

"وہ دیوراے کا تعاقب کر رہے ہیں۔"

رونق بیگ نے جواب دیا۔ "شاید انہوں نے اس وقت دریائے تنگ بھدرا کو عبور کر لیا ہو گا۔ جان عالم بیجانگر کے ظالم راجہ کو قتل کرنے کی قسم کھا کر نکلے ہیں۔"

پرتھال یہ سن کر دم بخود رہ گئی پھر رونق بیگ نے مختصر الفاظ میں دیورائے کے فرار اور ولی عہد کے تعاقب کا قصہ سنایا اور بتایا کہ وہ اسے اپنے ہمراہ لے جانے آیا ہے جان عالم اس سے ملنے کے لئے بڑے بے قرار اور مضطرب ہیں۔

اپنے محبوب شہزادے کا سندیس اور شوقِ ملاقات کا ذکر سن کر پرتھال کے انگ انگ میں بجلی کی سی لہر دوڑنے لگی۔ دل سے طرب انگیز احساس کی کرنیں سی پھوٹیں اور من مندر میں اُجالا ہو گیا۔ اس کا بدن ایک عجیب سے کیف، ایک لطیف سے سرور میں جھوم گیا اور وفورِ مسرت سے لرزتی آواز میں وہ بولی۔

"میں جانتی تھی رونق بیگ! میری پتا کا حال سن کر جان عالم ضرور آئیں گے لیکن کہیں وہ مجھ سے خفا تو نہیں۔ میں انہیں یاد تو آتی رہی ہوں نا؟"

"وہ بھلا تم سے خفا کیوں ہونے لگے۔ تم تو اُن کی زندگی بن چکی ہو۔"

چند قدم کے فاصلے پر گھپ اندھیرے میں ایک سایہ کی طرح کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا حیران و ششدر، مبہوت و متحیر، زمین اُس کے پاؤں کے نیچے یوں گردش کر رہی تھی جیسے کوئی لٹو گھومتا ہے۔ جیسے دریا کی تیز و تند لہریں بھنور میں چکر کاٹتی ہیں۔ اُس پر کیسا حیرت افزا، تعجب انگیز انکشاف ہوا تھا۔ اس کی بیٹی، ایک غریب سنار کی لڑکی، دکن کے ولی عہد شہزادہ حسن کی "زندگی" بن چکی ہے۔ بوڑھا حیران تھا۔ اس کے کانوں نے یہ کیا سن لیا ہے کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر رونق بیگ پرتھال سے کہہ رہا تھا۔

"جب تک جان عالم تمہیں دیکھ نہیں لیں گے۔ انہیں چین نہیں آئے گا۔"

اور بوڑھے سنار کو اپنے کانوں میں نقارے سے بجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے جسم پر ایک لرزہ خیز کپکپاہٹ طاری ہوئی اور ذہن آہستہ آہستہ جھلملاتے اجالوں کے

سیلاب میں اُبھرنے ڈوبنے لگا۔

رونق بیگ نے اُجڑے ہوئے گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے سلطانِ معظم کے احکام بھی پرتھال کو سنا دیئے تھے وہ خوشی سے لڑکھڑاتی ہوئی درے کی طرف مڑی۔

دوسرے ہی لمحے غم وفکر سے اُترے ہوئے چہروں پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دروں میں دُبکے ہوئے انسان خوشی سے اُچھل پڑے۔

دیوانے بھاگ چکا تھا۔

شہزادہ حسن چھ ہزار بہمنی سواروں کو لے کر اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔

موت اپنے منحوس آشیانے کو لوٹ گئی تھی اور مدگل کی ہر بستی اور ہر گاؤں میں زندگی کا البیلا رقص شروع ہو چکا تھا وہ بے خوف وخطر اپنے گھروں کو واپس جا سکتے تھے۔

سلطان معظم کی طرف سے یہ اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ اُن کے نقصان کی تلافی شاہی خزانہ سے ہوگی۔ انہیں اناج، کپڑا اور روپیہ عطا ہوگا۔

اور سندر پرتھال کو جس کے سر پر مہاوشنو کے ہاتھ کا سایہ تھا۔ اس کے ماں باپ سمیت ولی عہد کے حضور میں طلب کر لیا گیا تھا جو دیوانے کی سرکوبی کے لئے فیروز آباد سے شاہی فوج لے کر نکلا تھا۔

اب پرتھال بہمنی راجکمار کو وہ سب بپتا سنائے گی جو آگ کے بھڑکے ہوئے شعلوں کی صورت میں اُن کے گاؤں پر آئی تھی۔ جس کے ڈر سے وہ ہنستے بستے گھروں سے بھاگ کر "چمگادڑوں کی اس تاریک جنت" میں آ دبکے تھے اور جب ولی عہد یہ المناک کہانی سن چکا۔ تو مصیبت زدہ لوگوں کے زخموں پر خود مرہم لگائے گا انہیں انعام واکرام سے مالا مال کر دے گا اور پرتھال دیوی اُن کے لئے زندگی کی نئی خوشیوں کا سندیس لے کر لوٹے گی۔

نیم تاریک غاروں میں مسرت کا ایک عجیب سا اُجالا پھوٹ رہا تھا اس اجالے میں پرتھال اپنا سامان لپیٹ رہی تھی اور لکھپت سنار لڑکھڑاتی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"چنتا نہ کرو ہم جلدی لوٹ آئیں گے میں ولی عہد کو خود اپنی مصیبت کی کہانی سناؤں گا، اور اُن کی دیا سارے گاؤں کو نہال کر دے گی۔"

پھر یکلخت وہ سکھ دیوی کی طرف پلٹا اور کہنے لگا۔

"پرکھیا کا کا تم کیوں ہمارے ساتھ نہیں چلتے؟"

"نہیں لکھپت! راجکمار نے مجھے نہیں بلایا۔ یوں جانا ٹھیک نہیں [illegible]

[illegible] چلی گئی۔"

پرتھال [illegible]

[illegible]

"پرتھال دیوی ٹھیک کہے ہے۔" [illegible]

بہت سے لوگوں کی آواز سن کر سکھ دیو کے چہرے پر خوشی [illegible]

"تو پھر مجھے [illegible]

[illegible] چنچل تک پاس بھلا

تھا ہی کیا [illegible]

[illegible]

پرتھال کی معیت میں جب [illegible]

[illegible] روشنی میں رونق

[illegible]

چٹانوں پر بھوت ناچنے لگے تھے لیکن یہ "بھوت" زندگی کے [illegible]

[illegible] اس رات

[illegible]

[illegible]

وصال ملاقات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہیں۔ اسی طرح [illegible]

[illegible] لطیف کی

لذت سے انار کی کچی شاخ کی مانند کانپ [illegible]

ایک دوشیزہ کے بدن پر اس وقت [illegible]

سندور لگائے آنکھوں میں کاجل کی [illegible]

چلا لیے لرزتی، کانپتی اور سمٹاتی ہوئی اپنے دیوتا کی آرتی اتارنے جا رہی ہو۔

وفورِ انبساط سے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ جھاڑی دروں سے نکلے دیو اور گوری بھی اُن کے ساتھ ہو لیے...... ابھی فیصلہ ہوا تھا کہ کھیا کی حیثیت سے نکلو دیو ولی عہد کے سامنے اپنی بپتا خود بیان کرے جو آگ کے شعلوں کی صورت میں اُن کے گاؤں پر نازل ہوئی تھی۔

روانگی سے پہلے جنید نے ان سب کے لیے ایک علیحدہ خیمہ نصب کرا دیا تھا اور صبا رفتار قاصد ولی عہد کی طرف دوڑا دیا تھا جو اُسے پرتھال کے صحیح سلامت پہنچنے کی خبر دے سکے۔

روانگی کے بعد جنید کے خیمے کے چوبی ستونوں کے سہارے کھڑی اس کی راہ تک رہی تھی۔ اسی دوران میں گوری کئی بار اس کے پاس آئی تھی۔ لیکن پرتھال نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ستون کو چھوڑ کر اپنا رخ کبھی دوسری طرف کر لیتی لیکن پرتھال کو جیسے شہزادے کے انتظار میں ستون بنا رہا تھا۔ اسے کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ جوں جوں سورج غروب ہو رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ شام کے قریب گوری نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا:

"کیا اپنے راجہ کی راہ دیکھتے دیکھتے تو بانس کی طرح سوکھ جائے گی؟ کیا خبر راجکمار آج بھی آئیں یا نہ... دیکھو تو سہی سورج کی روشنی بھی ڈوبتی جا رہی ہے۔ میں تو جانوں آج کوئی نہیں آنے کا۔"

اور پرتھال نے جواب دیا تھا۔

"نہیں جانتی گوری! آخر میرے راجہ ضرور آئیں گے۔ تو نہیں کہتی دل پہلے دھڑکنے کی آواز سن سکتی ہے اور جانتی ہے گوری تیرے دل میں یہ دھک دھک کیوں ہو رہی ہے؟"

واقعی جب گوری نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا تو دل کبوتر کی طرح دھڑک رہا تھا...... جیسے ابھی اچھل کر باہر آ جائے گا۔ گوری حیران سی رہ گئی۔

"ہائے رام! یہ دھڑکن تو......"

"یہ دھڑکن نہیں پگلی!" پرتھال نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر کیا ہے یہ؟"

"یہ تو میرے راجہ کے گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک ہے۔ جس پر سوار ہو کر وہ مجھے ملنے آ رہے ہیں۔"

یہ سن کر گوری کی ہنسی یوں بکھر گئی۔ جیسے چھاگل سے پانی چھلک جاتا ہے اس نے بصد مشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اری! یہ تیرا دل ہے یا کوئی راستہ جس پر گھوڑے بھاگتے ہیں ٹاپوں کی دھمک ابھرتی ہے۔"

اور پرتھال نے جواب دیا تھا۔

"گوری جب کسی سے پریم ہو جائے تو دل اس کے پاؤں تلے بچھ جاتا ہے اور نگاہیں اس کے راستے کا غبار بن جاتی ہیں۔"

حیرت سے گوری کی آنکھیں پھیل گئی تھیں ابھی وہ کچھ کہنے کے لئے سوچ ہی رہی تھی، کہ شام کے ملگجے اندھیرے میں دریا کی جانب ٹاپوں کی آواز ابھری تھی۔ گرد و غبار کا ایک ہیولا سا لہراتا دکھائی دیا تھا دوسرے ہی لمحے جب اس غبار کا دامن چاک ہوا تو انہیں ایک سوار سرپٹ گھوڑا دوڑائے آتا نظر پڑا تھا اور پرتھال کے ہونٹوں سے خوشی کے مارے ایک چیخ سی نکل گئی تھی۔

"وہ دیکھو میرے راجہ آ گئے۔"

گوری نے خیمہ کے غرفہ میں سر ڈال دیا وہ شہزادہ حسن کو دیکھنا چاہتی تھی جس کے روپ کی تعریف وہ پرتھال سے سن چکی تھی۔ سچ مچ وہ شہزادہ حسن ہی تھا۔ گوری دم بخود رہ گئی تھی اور پرتھال کا دل تو جیسے بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

بیگ کا پیغام سنتے ہی شہزادہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا سے باتیں کرنے لگا تھا۔

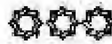
وہ تنہا آیا تھا صرف ایک سوار اس کے پیچھے پیچھے تھا جو پیغام لے کر گیا تھا۔ ابھی آسمان پر شام کا ستارہ نہیں چمکا تھا اور فضا میں ڈوبتے ہوئے سورج کی تمازت باقی تھی۔ کہ وہ اپنی منزل پر آ پہنچا تھا۔ بیگ نے خود آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی جو پسینے میں شرابور یوں ہونک رہا تھا جیسے بھٹی دہکانے والی دھونکنی چلتی ہے گھوڑے کی اس حالت سے بیگ نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ سرپٹ آیا ہے اور رستہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکا۔

کھلے اور وسیع خیمہ کے جالی دار غرفہ سے پرتھال نے اپنے مندر کے دیوتا کو آتے دیکھ لیا تھا اور اس کا دل ناچ اٹھا تھا۔

پھر تھوڑی ہی دیر بعد جب اسے سندیس ملا کہ ولی عہد نے اسے اپنے خیمۂ خاص

میں طلب کیا ہے تو اس کے سارے جسم پر ایک حیات افروز لرزش طاری ہو گئی تھی اور ملاقات کے پر کیف احساس سے اُسے اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی معلوم ہوئی تھیں اور اپنے جسم پر وہی سرور افزا لرزش لئے ڈولتے اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ ولی عہد کے خیمہ میں داخل ہو رہی تھی۔ جسے رونق بیگ نے سپاہیوں کی چھولداریوں سے قریباً نصف فرسخ پرے نصب کرایا تھا۔

خیمہ پر ولی عہد کا خاص پھریرا لہرا رہا تھا اور چند بہمنی محافظ لمبے لمبے بھالے اٹھائے اور کمروں میں تلواریں لٹکائے اس کے اردگرد پہرہ دے رہے تھے۔



بیگ نے آگے بڑھ کر خیمے کا اطلسی پردہ ہٹایا اور پرتھال نے اپنے لرزتے ہوئے پاؤں اندر رکھے پھر بیگ تو دروازے ہی پر رک گیا وہ ایک سحر زدہ انسان کی طرح ہولے ہولے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔

خیمہ کے اندر قریباً چار گز چوڑی ایک گلی چاروں طرف پھیلی تھی اوپر سائبان تھا۔ اندرونی قنات میں شاہی خیمے کا دروازہ اڑھائی گز اُونچا تھا۔ اور اس میں سرخ بنات کا پردہ لہرا رہا تھا۔

سلطانی بارگاہیں نصب کرتے وقت دروازوں کی بلندی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا تاکہ اُن سے گزرتے وقت گردن کو خم دینے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

سلطانِ معظم اور شہزادوں کے سر خدائے واحد کے سوا کسی کے آگے نہیں جھک سکتے تھے۔

گلی میں ایک بے دود مشعل روشن تھی اس کی روشنی میں خیمہ کی اندرونی دیواریں چمک رہی تھیں اندر ایک عجیب سی خوشبو پھیل رہی تھی۔ پرتھال شاہی خیمہ میں داخلہ کے آداب سے آگاہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی۔ کتنے فاصلے سے ولی عہد کو جھک کر سلام کرنا چاہیے اور سر جھکا کر کتنی مرتبہ ہاتھوں کو جنبش دینا ضروری ہے۔

مشعل کی روشنی میں سرخ بنات کا پردہ جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ پرتھال نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹایا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کا محبوب، مملکت بہمنی کا چشم و چراغ شہزادہ حسن اپنے بازو کھولے اس کے لئے چشم براہ تھا لیکن جوشِ محبت میں آگے بڑھ کر بغل گیر ہونے کی بجائے آدابِ شاہی کے مطابق اُس نے کورنش بجا لانا ضروری سمجھا سلام

کرنے کے بعد وہ ہولے ہولے آگے بڑھی حتیٰ کہ ولی عہد سے دو گز کے فاصلہ پر جا کے کھڑی ہو گئی۔ دراصل وہ اپنے دل کے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کنیز کا ہدیہ سلام قبول ہو۔'' اس نے شاہی محلسرا کی عورتوں کے مخصوص لہجہ میں کہا۔

شہزادہ حسن چونک اٹھا وہ نہیں جانتا تھا بیگ نے اس کی محبوبہ کو شاہی آداب سے خبردار کر دیا تھا تاکہ جب بھی وہ محلسرا میں داخل ہو تو اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرے۔

وہ چپ چاپ کھڑا اُسے پیاسی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ بے دود فانوسوں کی روشنی میں پرتھال کا چہرہ یوں چمک رہا تھا۔ جیسے چاند نیلے اور سیاہی مائل آسمانوں سے ٹوٹ کر اس کی بارگاہ میں آ گیا ہو۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو دعوتِ سپردگی دے رہے تھے اور ہونٹوں کے گوشوں پر ایک نادیدنی لرزش اس بات کا اظہار تھا کہ وہ بھی ملاقات کی مسرت سے ہمکنار ہے۔ ایک لمحہ..... صرف ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ بے تابی کے ساتھ آگے بڑھا پھر پرتھال اس کے مضبوط و توانا بازوؤں کے حلقہ میں کسمسا رہی تھی۔

اُف..... ہم آغوشی کی وہ اولین ساعت، وصالِ محبوب کی پہلی کیفیت، سرورِ محبت کا پہلا تجربہ، کیفِ نہایت کا آغاز،

مگر یہ ہم آغوشی تھی یا تلی ہوئی گھٹاؤں کے سینے میں بجلی کی تڑپ یا شعلے ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔

کیسا عجیب سرور تھا۔ جس کی کیفیت و لذت سے وہ دونوں آج تک بے خبر تھے جیسے انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ شراب پی لی ہو اور نشہ کی لہر ان کے ذہن و شعور کو سرور و کیف کی ان دیکھی۔ ان جانی رفعتوں کی طرف لے اُڑے۔

پرتھال نے یوں محسوس کیا جیسے کہکشاں آسمان کی بلندیوں سے ٹوٹ کر اس کے دامن میں آ گری ہے یا وہ خود اُوپر ہی اُوپر سیلاب نور کی وادیوں میں پرواز کر رہی ہے جن کے زمردیں کناروں پر شفق اپنے رنگ بکھیرتی اور چاند اپنی سیمیں کرنیں پھیلاتا ہے کیفِ نہایت کے آغاز نے اس کے سینہ میں بلاخیز تموج پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے محبوب کی آغوش میں ابدی اور سرمدی خوشیوں کا جھولا جھولتی رہے۔

خود شہزادہ حسن کی کیفیت بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی محسوس کر رہا تھا زندگی صرف انہی فانی اور گزر جانے والے لمحوں کا نام ہے جن میں وہ اپنی محبوبہ کو بازوؤں

کے گھیرے میں لئے خیالی فضاؤں میں گھوم رہا ہے اور کنوارے جسم کے نرم و گداز لمس نے اس کے ہوش و حواس سلب کر لئے تھے اور اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات باقی رہ گئی تھی کہ وہ پرتھال کو اپنے آغوش میں لئے اسی طرح پڑا رہے تا آنکہ قیامت آ جائے۔ موت کی دیوی اپنا گجر بجا دے۔

اس کے علاوہ سوچ کی تمام قوتیں شعلۂ کیف کی گرمی میں جل کر فنا ہو چکی تھیں اور دل نے اپنے دروازہ کے پٹ بھیڑ لئے تھے کہیں کوئی اندیشہ کوئی وسوسہ سانپ کی طرح رینگتا ہوا اندر نہ گھس آئے۔ بھلا خوشی کی اس ساعت میں مستقبل کے خطروں اور اندیشوں کا کیا کام۔

حیرت انگیز خبریں

چند لمحے وہ اسی طرح کھوئے رہے۔ خیمہ کے سکوت میں جہاں سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی وہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن رہے تھے۔ دھک...... دھک...... دھک......

حسن کا ہاتھ اس کی ٹھوڑی تک آیا تو وہ کسمساتی اور شرماتی ہوئی اس کے بازوؤں کے حلقہ سے نکل کر پرے ہٹ گئی۔

وہ دونوں بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے دلوں میں تمناؤں کا ایک دفتر پنہاں تھا۔ ہزاروں آرزوئیں سینوں میں تڑپ رہی تھیں لیکن لبوں پر خاموشی کی مہریں لگی تھیں گفتگو کا موضوع کیا ہو۔ محبت کے سوا بھلا وہ اور کس موضوع پر اظہار خیال کر سکتے تھے؟

سبقت آخر پرتھال ہی نے کی۔ اس کے ہونٹ بے شک ہل رہے تھے لیکن نگاہیں فرش پر گڑی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"جان عالم! فیروز آباد جا کر آپ نے کنیز کی خبر بھی نہ پوچھی۔ آپ نے تو جلد آنے کا وعدہ کیا تھا۔" اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

"نہیں...... میں نے تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کیا۔" حسن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہیں کیا معلوم...... ہر سانس کے ساتھ تمہارا نام زبان پر آتا رہا۔"

"لیکن یہ تو سوچئے! اگر بیجانگر کا ظالم راجہ اپنے ظلم میں کامیاب ہو جاتا تو کیا ہوتا؟"

"کیا ہوتا؟"

"میں تو مر گئی ہوتی۔"

"لیکن موت تمہارے دشمن کا مقدر بن چکی ہے۔"

پرتھال نے سر اُٹھا کر حسن کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید اور راج ہنس کی سی لمبی گردن میں موتیوں کا وہ ہار جھلملا رہا تھا جو شہزادہ نے اسے پہلی ملاقات میں بخشا تھا فانوس کی تیز روشنی میں موتیوں سے شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔

شہزادہ آگے بڑھا تو کہنے لگی۔ "میری آتما اور شریر دونوں میرے پریم کی امانت ہیں دیورائے اگر مجھے قید بھی کر لیتا تو اُسے ایک بے روح جسم کے سوا اور کچھ نہ ملتا۔ اس کے راج رتو اس کی چوکھٹ عبور کرنے سے پہلے میری آتما اپنے پریم کی بھینٹ چڑھ چکی ہوتی۔"

شہزادہ نے اُس کے بازو تھام لئے۔

"اطمینان رکھو، ہمارا پیار بے بسی کی موت نہیں مرے گا۔ سلطانِ معظم کے کانوں تک یہ خبر پہنچ چکی ہے کہ دیورائے دکن کی ایک ہندو لڑکی کو گرفتار کرنے آیا تھا، یہ سنتے ہی وہ مشتعل ہو گئے۔ بولے، اب دیورائے سے حساب بے باق کرنے کا وقت آ گیا ہے اس نے ہماری سلطنت پر نہیں، ہماری عزت اور غیرت پر ہاتھ اُٹھایا ہے، ہم ان ہاتھوں کو قلم کر دیں گے۔"

پرتھال کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔

"تو کیا سلطانِ عالی کو میرے بارے میں علم ہو چکا ہے۔"

"بے شک!" حسن نے جواب دیا۔ "انہیں یہ اطلاع بھی مل چکی ہے تم نے دیورائے کے پیغام کا جواب خنجر سے دیا تھا۔" سلطان یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔

"ہم اس بہادر لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس نے زبانِ خنجر سے گفتگو کی۔"

سلطان عورتوں کے متعلق بڑی غیرت رکھتے ہیں انہوں نے دیورائے کے خلاف جنگ کے احکام صادر کر دیئے ہیں۔ احمد خاں خانخاناں کو کوچ کا حکم مل چکا ہے، وہ دو ایک روز میں آیا ہی چاہتے ہیں، سلطان بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوں گے، اُن کا ارشاد ہے سلطانی لشکر کے پہنچنے سے پہلے میں دشمن کو دریا کے اُس پار بھی چین سے نہ بیٹھنے دوں۔ دیورائے نے عہد نامے توڑ دیئے دکن پر حملہ کیا۔ مدگل کی بستیوں کو لوٹتا اور پھونکتا رہا۔ یہی نہیں اس نے مملکتِ دکن کی ایک بیٹی کی عزت لوٹنا چاہی اور یہ جرم ناقابلِ معافی ہے،

سلطان عورتوں کی عزت کی خاطر تو اپنی جان کی بازی لگا دیا کرتے ہیں اب وہ اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک بیجانگر کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا دیتے۔ جب تک دیورائے کو اس کے جرم کی سزا نہیں مل جاتی۔ جب تک وہ پابہ زنجیر سلطانی بارگاہ میں پیش نہیں کیا جاتا۔"

شہزادہ کی باتیں سن کر پرتھال دم بخود رہ گئی وہ سمجھتی تھی دیورائے کے فرار کے ساتھ جنگ ختم ہو گئی ہے، اب زیادہ سے زیادہ بیجانگر اور دکن کی درمیانی سرحد پر پہرہ سخت کر دیا جائے گا تاکہ دیورائے کو دوبارہ تاخت و تاراج کا موقع نہ مل سکے لیکن اُسے کیا خبر تھی۔ اصل جنگ تو اب شروع ہونے والی تھی۔ سلطان نے ولی عہد کو محض تعاقب کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ شہزادہ کے پیچھے پیچھے وہ خود بھی لشکرِ جرار لے کر چلا آ رہا تھا۔ امیر الامراء احمد خاں خانخاناں اور امیر فضل اللہ انجو شیرازی عامل برار کو فیروز آباد کے احکام مل چکے تھے اور اُن کے پیچھے سلطان خود اپنے خاص لشکر کے ساتھ جنگ کا جھنڈا باندھے روانگی کے لئے تیار تھا۔ اس نے ولی عہد کی جاگیر فیروز آباد ہی کو اپنا فوجی مستقر بنایا تھا کیونکہ گلبرگہ کی بہ نسبت فیروز آباد، بیجانگر کی سرحد کے قریب تھا۔ سلطان کے ساتھ محلات کی بیگمیں اور خان زادیاں بھی گلبرگہ سے فیروز آباد منتقل ہو رہی تھیں۔

ایک عظیم اور فیصلہ کن جنگ کی تیاریاں، دیورائے کی تباہی و بربادی کے سامان بہمنی سرداروں کے بعد سلطانِ دکن کا بنفس نفیس لڑائی کے لئے نکلنا یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور اس کا سبب...... اس کی علت خود پرتھال تھی۔

جنگ کی خبروں نے اسے متوحش سا کر دیا اور خاموش گم صم سی کھڑی وہ حیرت پاش نگاہوں سے شہزادہ کو دیکھ رہی تھی۔

کیا اس کا وجود...... اُس کا حسن اتنی بڑی جنگ کا پیش خیمہ بن جائے گا؟ یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

"تم حیران کیوں ہو گئیں؟"

حسن نے اُسے مبہوت و ششدر دیکھ کر پوچھا۔ "کیا تمہارے نزدیک ظالم دیورائے کو اُس کے ظلم و ستم کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔"

"نہیں جانِ عالم! ظالم اور اپرادھی کو سزا ضرور ملنی چاہیے لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں

سکتی تھی۔ سلطان میری خاطر اتنی بڑی جنگ لڑنے پر تیار ہو جائیں گے۔"

"سلطان عزت کو امارت اور غربت کی ترازو میں نہیں تولتے انہیں مملکت کی ہر لڑکی کی عزت عزیز ہے، وہ مسلمان ہو یا ہندو جو بادشاہ اپنی رعایا کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ خود بھی قابل عزت نہیں۔"

پھر اس نے پر تھال کو بتایا کہ سلطان بہت جلد فیروز آباد پہنچنے والے ہیں اور وہ اُسے اپنے حضور بلائیں گے، سلطان کی بارگاہ میں حاضری کے آداب اُسے بیگ سمجھا دے گا لیکن گفتگو کے دوران اُسے اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں بلکہ ولی عہد کی محبوبہ اور دکن کی ہونے والی ملکہ ہے۔ اسے اپنی باتوں سے سلطانِ معظم کو متاثر کرنا چاہیے تاکہ وہ اس کے بارے میں بہت اچھی رائے قائم کر سکیں اسی رائے پر اُن کی آئندہ زندگی کا دارومدار ہے، شہزادہ نے یہ بھی بتایا۔ سلطان معظم کی آمد تک وہ رونق بیگ کے زیر تربیت رہے گی، بیگ چند ہی روز میں اُسے ضروری باتیں سکھا دے گا۔ حاضری کے آداب، گفتگو کا سلیقہ، نشست و برخاست کے انداز اور رموز کی وہ باتیں جو سلطانِ عالم کو متاثر کر سکتی ہیں تاکہ وہ جان لیں کہ ولی عہد کی نگاہِ انتخاب نے پتھر نہیں پارس تلاش کیا ہے۔ ایک انمول ہیرا جو تاج شاہی کی زینت بن سکتا ہے۔

اب پر تھال کو معلوم ہوا۔ وہ ایک بہت بڑے امتحان سے دوچار ہونے والی ہے اُسے محض اس لئے بلایا گیا ہے کہ سلطان کے حضور پیش کرنے سے قبل ضروری امور سے آگاہ کر دیا جائے۔ اُسے اپنے حسن و جمال کے علاوہ حسن گفتگو سے سلطان دکن کو اپنا ہمنوا بنانا ہے اسے یہ ثابت کرنا ہے۔

وہ عام عورتوں سے مختلف اور حکمرانی کی صلاحیت رکھتی ہے امور سلطنت میں مشورہ دے سکتی ہے۔

مزاج شاہی سے واقف اور شہزادوں کی محفل میں بیٹھ سکتی ہے۔

گھوڑے کی سواری کر سکتی ہے۔

تیر و شمشیر سے کھیلنا جانتی ہے۔

شعر و نغمہ سے رغبت رکھتی ہے۔

موسیقی سے آشنا ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



بادشاہ اور رعایا کے درمیانی فاصلوں کو سمجھتی ہے۔
شاہی تقاریب میں حصہ لے سکتی ہے۔
انعام واکرام دے سکتی ہے۔
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سحر کلام سے اپنے مخاطب کو متاثر ہی نہیں کر سکتی بلکہ اپنی بات منوانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

شاہی محلسرا میں داخلہ سے قبل پرتھال کا ان سب باتوں میں دسترس حاصل کرنا ضروری تھا۔ وہ ایک سنار کی لڑکی تھی جس کی تربیت گاؤں میں ہوئی، شاہی آداب وقواعد کو سمجھنا اور ان میں بہت جلد مہارت پیدا کر لینا دیہات کی ایک الھڑ دوشیزہ کے بس کی بات نہیں تھی لیکن پرتھال نے مسلسل ایک برس تک پنڈت گورکھ ناتھ سے شعروادب اور موسیقی کی تعلیم وتربیت پائی تھی اور ایسی کئی باتوں میں مہارت رکھتی تھی۔ جو صرف شہزادیوں اور راجکماریوں ہی کو سکھائی جاتی ہیں۔ گورکھ ناتھ نے پرتھال کے ماتھے پر خوش بختی کی چمک دیکھ لی تھی اسی لئے وہ اسے اعلیٰ تعلیم دیتا رہا تھا اور آج وہی تعلیم اس کے پریم کی ناؤ کی چپوار بن گئی تھی۔

شہزادہ بہت جلد اپنے جنگی پڑاؤ کی طرف واپس چلا جانا چاہتا تھا۔ جہاں اُس کے خاص پرچم تلے چھ ہزار بھی خوار تلواریں سونتے کھڑے تھے۔ پرتھال کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اُس نے لکھپت سنار کو بلایا۔

بوڑھا جب ولی عہد کے خیمہ میں داخل ہوا۔ وہ حیرت واستعجاب کی سی کیفیت سے دو چار تھا جیسے وہ جاگتے میں کوئی پُرشکوہ خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک غریب سنار کی ولی عہد دکن کی بارگاہ میں عزت وتکریم کے ساتھ پیش ہونا ایک اچنبھا، ایک خواب ہی تو تھا۔ حیرت ومسرت کے مارے اس کے بدن پر لرزہ سا طاری تھا۔ ولی عہد نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا رونق بیگ اس کے ساتھ تھا۔

جب وہ کورنش کی رسم ادا کر چکا تو ولی عہد نے اپنے قریب مسند پر بٹھایا اُس کی خیریت پوچھی اور اُسے یہ خوشخبری سنائی کہ سلطانِ معظم اس کی بیٹی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں لہٰذا تربیت کے لئے وہ کچھ روز رونق بیگ کے زیر نگرانی رہے گی۔ لکھپت کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے یہی اعزاز بہت تھا کہ سلطان نے اس کی بیٹی سے

ملنے کی خواہش کی تھی۔

ستار سوچ رہا تھا پرتھال کی زندگی سنہرے سپنوں میں ڈھل چکی ہے شاید اب اُن سپنوں کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔

رخصت سے قبل ولی عہد نے لکھپت کو ایک خلعتِ فاخرہ عطا کیا اس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے اور دماغ میں جیسے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں، اسی کیفیت میں وہ ولی عہد سے رخصت ہوا۔ پرتھال ہولے ہولے قدم اٹھاتی اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ خیمہ کے دروازہ سے اس نے پلٹ کر شہزادہ کی طرف دیکھا، اس کی نگاہوں میں ایک دعوت ایک التجا تھی۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان سے کہہ رہی تھی۔ ”جانِ عالم! میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ سلطان عالی کے پہنچنے سے پہلے ہی آ جایئے۔ میں تنہا اُن کے حضور نہ جا سکوں گی۔“

ولی عہد کی نگاہیں دُور تک اُن کا تعاقب کرتی رہیں حتیٰ کہ اُن کے سائے اندھیرے میں گھل مل گئے۔



شہباز خاں کے زخم بھر چکے تھے اور وہ ولی عہد کے ہمراہ جنگی پڑاؤ پر جانے کے لئے بیتاب تھا۔ شہزادہ نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔

دوسری صبح ابھی سورج کو طلوع ہوئے چند ساعتیں گزری تھیں کہ حسن نے اپنے گھوڑے کی باگ دریائے تنگ بھدرا کی طرف موڑ دی، شہباز خاں اس کے پیچھے پیچھے تھا اور اپنے خیمہ کے دروازہ پر پرتھال گم صم کھڑی انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد جب گوری نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو اسے معلوم ہوا شہزادہ کی سواری کبھی کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے اور وہ خیمہ کی طناب تھامے خالی راستے پر نظریں جمائے کھڑی ہے۔

وہ جلدی سے مڑی اور خیمہ کے اندر بھاگ گئی۔ گوری حیران و ششدر اسے دیکھتی رہ گئی۔



7

سپاہیانہ جوش

کوشک ہائے سلطانی

دکن کی تاریخ ایک نیا ورق اُلٹ رہی تھی۔

فیروز آباد...... جسے سلطان فیروز شاہ بہمنی نے آباد کیا تھا اس وقت سلطانی فوجوں کی بہت بڑی چھاؤنی بن گیا تھا۔ گلبرگہ، دولت آباد، ساغر اور برار کی فوجیں شہر سے باہر بھورہ ندی کے کنارے کنارے خیمہ زن تھیں۔ فیروز آباد کے باہر ایک اور فیروز آباد فوجی چھاؤنی کی صورت میں آباد ہو گیا تھا۔

سلطانِ عالی کا لشکر خاص جو صرف سلطان کے سیاہ پرچم کے نیچے لڑتا تھا۔ قلعہ میں کوشک ہائے سلطانی کے آس پاس پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔

فیروز آباد فوجی شہر بن گیا تھا۔

قلعہ کی بلند و بالا مدور برجیوں اور بڑے بڑے کنگوروں پر سیاہ پرچم لہرا رہے تھے۔

فیروز آباد کا پُرشکوہ دربار عام فوج کے سپہ سالاروں اور لشکریوں سے پٹا پڑا تھا سلطانی امیر جنگی لباس پہن کر نکلے تھے اُن کے کھردرے چہروں پر خشونت کے آثار تھے اور آنکھیں غیظ و غضب کا اظہار کر رہی تھیں۔ یقیناً انہیں کوئی بڑا معرکہ درپیش تھا کیونکہ سلطان جنگی کونسل کا اجلاس اسی وقت کرتا تھا جب اُسے کسی اہم جنگ کے لئے اپنے امیروں سے صلاح مشورہ لینا ہوتا تھا۔

وہ اپنے لشکرِ خاص کے ساتھ حسن آباد گلبرگہ سے چل کر فیروز آباد میں آیا تھا جو اس کا

سرحدی دارالحکومت تھا۔ گلبرگہ سے روانگی سے پہلے ہی اُس نے دولت آباد، ساغر اور برار کے لشکروں کو فیروز آباد پہنچنے کے احکامات بھی دیئے تھے اور بیجانگر کے مہاراج دیورائے کے خلاف اشتہارِ جنگ دے دیا تھا لیکن فیروز آباد کے دربارِ عام میں وہ اپنے سپہ سالاروں، لشکریوں اور شہریوں کے سامنے اشتہارِ جنگ کی وجہ بیان کرنا چاہتا تھا۔

سلطان کی فوج میں ترک، خطائی، افغان، راجپوت، بنگالی، گجراتی، تلنگی، کھتری اور مرہٹی، ہر نسل اور ہر قوم کے سپاہی موجود تھے اور وہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے ساتھ مربیانہ سلوک کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی سپاہی بھی اُس پر جان چھڑکتے اور اُس کے اشارہ پر ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتے تھے۔

دیورائے نے کئی مرتبہ کوشش کی، وہ سلطانی فوج کے راجپوتوں، کھتریوں اور مرہٹوں اور بنگال، گجرات اور تلنگانہ کے ہندو بہادروں کو جو سلطانی پرچم کے نیچے دادِ شجاعت دیتے اور بہمنی فوج میں اہم عہدوں پر ممتاز تھے دھرم کے نام پر نہ صرف بغاوت پر آمادہ کرے بلکہ انہیں اپنے ساتھ ملا لے لیکن سلطان کے حُسنِ سلوک، عدل و انصاف اور ہر مذہب و ملت کے ساتھ مساوی سلوک نے ہندو لشکریوں کو بھی اُس کا گرویدہ بنا رکھا تھا اور وہ اسی طرح سلطان کی وفاداری کا دم بھرتے، جیسے مسلمان سپاہی اس کے اطاعت گزار تھے۔

سلطان خود اگرچہ امامیہ کے شعار کا پابند اور ملا اسحاق سرہندی کا معتقد تھا لیکن وہ سرزمین دکن کے لاکھوں ہندوؤں کا بھی بادشاہ تھا۔ وارنگل، تلنگانہ اور گونڈوانہ کے ہزاروں بہادر اس کی فوج میں ملازم تھے اور وہ اُن کے حقوق و مفاد کی نگہداشت خود کرتا تھا اس نے جہاں بزرگوں کے مقابر اور اسلامی عبادت گاہوں کی تعمیر میں دل کھول کر روپیہ صرف کیا وہیں ہندوؤں کے لئے مندر اور شوالے بھی تعمیر کرائے تھے حتیٰ کہ وہ بیجانگر کے اُن یاتریوں کے آرام و طعام کا بندوبست بھی کرتا تھا جو کاشی یاترا کے لئے اس کی مملکت سے گزرتے تھے یہی وجہ تھی۔ جہاں دکن کی مسجدوں میں اُس کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں ہوتی تھیں وہاں مندروں اور شوالوں میں پجاری اس کے نام کا سنکھ پھونکتے اور اُس کی ترقی اقبال کے لئے پرارتھنا کرتے تھے۔

ایک بے تعصب صلح جو اور رحمدل حکمران تھا لیکن جب کوئی دشمن اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد ناموں کی خلاف ورزی کرتا۔ صلح کے معاہدے توڑتا اور اس کی مملکت میں تاخت

و تاراج کرکے اسے جنگ کی دعوت دیتا تو وہی رحمدل انسان غیظ و غضب کا پیکر بن جاتا تھا۔ اس کا ہاتھ اچھل کر شمشیر کے قبضہ پر جا پڑتا اور اس کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگتیں۔

وہ اپنی مملکت میں کسی حریف کو جبر و تعدی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا اس کی موجودگی میں کوئی دشمن اُس کی رعایا کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا وہ اپنی رعایا کے جان و مال کا محافظ تھا۔ اگر وہ عزت کے لٹیروں کی سرکوبی نہ کرے تو ملک سے امن و امان اُٹھ جائے اور بھیڑیے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح چیر پھاڑ کر کھا جائیں اُن کی شہ رگوں کا خون چاٹ لیں اور اُن کے جسموں کی بوٹیاں اڑا دیں۔

دیورائے سے بھی یہی حماقت سرزد ہوئی تھی اگر چہ وہ سلطان کا باجگزار تھا لیکن پرتھال کے شعلۂ حسن نے اُس کے ہوش و حواس جلا کر خاک کر دیئے تھے وہ اس گلبدن کو حاصل کرنے کے لئے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دکن کی سرحدی بستیوں پر حملہ آور ہوا تھا اور سلطان کے نزدیک اس کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ قطعی طور پر ناقابلِ معافی۔

لڑکی ہندو ہو یا مسلمان، مملکت کی عزت تھی اور کسی کی عزت پر اُٹھنے والے ہاتھوں کے متعلق سلطان کا ایک ہی حکم تھا ''ان کو قلم کر دو۔''

دیورائے کے ہاتھ قلم کرنے اور اُسے دکن کی بستیوں پر حملہ کی سزا دینے کے لئے سلطان نے بنفس نفیس جنگ کا جھنڈا باندھا تھا۔ دیورائے کے خلاف اشتہار جنگ دیا تھا اور اپنے فوجی امیروں کو حکم بھیجا تھا۔ وہ لشکروں سمیت فیروز آباد پہنچ جائیں۔

اور فیروز آباد اس وقت بہمنی لشکروں کا خیمہ ذخر گاہ بن چکا تھا۔ بھورہ ندی کے کنارے حدِ نظر تک سپاہیوں کی چھولداریاں نصب تھیں۔ ترک، خطائی، افغان، کھتری راجپوت، مرہٹے اور تلنگی سورما اپنے اپنے جھنڈوں کے نیچے سلطانِ عالی کے حکم کے منتظر تھے۔

فوجی امیر عالی، سپہ سالار اور معزز شہری جنہیں حاضری کا شرف حاصل تھا دربارِ عام میں سینوں پر ہاتھ باندھے بہمنی حکمران کے لئے چشم براہ تھے اور سب لوگ یہ سننے کے لئے بیتاب و مضطرب تھے وہ دیورائے کی قسمت کا کیا حکم صادر کرتا ہے۔

جنگی کونسل

شاہی محل کی برجیوں پر قرنا کی پرہیبت آواز کے ساتھ ہی جب سلطان معظم طرہ شاہی

سے مرصع فولادی خود اوڑھے، زرہ بکتر پہنے اور بازوؤں پر لوہے کی چمکدار آستینیں چڑھائے اپنے کمرۂ خاص سے باہر نکلا تو لمبے تڑنگے نیزہ بردار محافظوں نے ایک ساتھ اپنی گردنیں خم کر دیں اور اس کے ساتھ محل کی بلند بالا اور طویل راہداری میں شاہی نقیب کی آواز گونجنے گرجنے لگی۔

"حدِ آداب...... پیشِ نظر...... آمد سلطانِ ظفر"

آداب و دستور کے مطابق مراہم دربار یا مشاورت پر سلطان کو اس کے تمام القابات و خطابات کے ساتھ پکارا جانا ضروری سمجھا جاتا تھا تا کہ ہر شخص اُس کی عظمت اور بلند درجات سے آگاہ رہے اس مقصد کے لئے خاص نقیب اور چاؤش مقرر تھے۔ جو سلطان کے آگے آگے القابات و خطابات کے ساتھ اس کی آمد کا اعلان کرتے جاتے تھے بعض اوقات ایک ہی شخص یہ خدمت سر انجام دیتا تھا اور کبھی کبھار کئی نقیب آمدِ شاہ کی خبر دیتے تھے۔

قرنا کی آواز آمدِ سلطان کا اعلان کر کے خاموشیوں میں تحلیل ہو گئی لیکن اس سناٹے میں نقیب کی پُر ہیبت اور پُر شکوہ آواز جس میں بجلی کی سی چمک لپک اور رعد کی سی کڑک دھمک تھی۔ بدستور گونجتی اور گرجتی رہی۔

حدِ ادب...... پیشِ نظر...... آمد سلطانِ ظفر

آفتابِ دکن...... شاہ لشکر شکن......

عالم پناہ...... فیروز بخت و سکندر جاہ......

سلطان ابن سلطان۔

خاقان ابن خاقان، ظلِ سبحانی...... بادشاہِ غازی، ابو المظفر الغازی، سلطان فیروز شاہ بہمنی، الملقب بروز افزوں شاہ ابن داؤد شاہ بہمنی، اورنگ نشین دکن خلد اللہ ملکہ، و سلطنتہ، تشریف لائے ہیں۔

حدِ ادب، پیشِ نظر، آمد سلطانِ ظفر سرنگوں، نگاہ روبرو۔

نقیب کی گرجتی ہوئی آواز نے قصرِ شاہی کے در و دیوار پر جیسے ایک زلزلہ سا طاری کر دیا تھا۔ یہ آواز برق و رعد کی طرح قصرِ عالی سے دربار تک گونجتی چلی گئی اور چاروں طرف ایک پُر شکوہ، پُر عظمت سناٹا چھا گیا۔

سلطان بڑھے، بڑے پروقار قدموں سے راہداری عبور کرنے لگا۔ اس کے آگے آگے دس قدم کے فاصلہ پر نقیب شاہی نشان اٹھائے اس کی جلال افروز سواری کی خبر دیتے جا رہے تھے اور اُن کی مہیب آوازیں شاہی محل سے ایوانِ عام تک سنائی دے رہی تھیں۔

سلطان چلتا رہا۔ آوازیں گونجتی رہیں۔

اُس نے پورے دو سال کے بعد جنگی لباس زیب تن کیا تھا۔ فولادی ٹوپی کے نیچے لوہے کی جالی دار زنجیر کندھوں تک لٹک رہی تھی۔ آہنی سینہ بند پر سلاطین بہمنی کا خاص نشان ”عقاب“ اپنے دونوں پروں کو پھیلائے ہوئے جیسے فضا میں جھپٹ رہا ہے۔

فولادی ٹوپی کے نیچے اس نے سیاہ پٹکا باندھ رکھا تھا، جو اس کی ٹھوڑی پر حلقہ کئے ہوئے اوپر چلا گیا تھا۔ کمر میں وہ خاندانی تلوار آویزاں تھی جو تاج و تخت کے ساتھ اُس نے بزور حاصل کی تھی۔ یہ اس امر کا اعلان سمجھی جاتی تھی کہ اُسے کوئی اہم مہم درپیش ہے۔

سلطان کی عقابی آنکھوں میں سرخ ڈورے اس کے دلی جوش وخروش کے مظہر تھے اور ماتھے کے شکن کسی بدنصیب کے خطِ تقدیر پر خندہ زن تھی۔

راہداری سے نکل کر وہ بڑے بڑے مدور ستونوں والے برآمدے میں نمودار ہوا۔ مسلح پہرے داروں نے یہاں بھی اپنے سر جھکا دیئے جو ننگی تلواریں دورویہ کھڑے تھے۔

دربار کے موقع پر محل سے ایوانِ عام تک بہمنی محافظوں کا پہرہ رہتا تھا نیزہ بردار اور تیغ بدست سپاہی جو ”جانباز“ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے ان راستوں پر چاق و چوبند کھڑے رہتے تھے جہاں سے سلطانِ معظم کو گزرنا ہوتا تھا۔ نقیب کی آواز انہیں ہشیار و مستعد کر دیتی تھی اور سلطان کے قدموں کی چاپ سنتے ہی اُن کے جسموں میں جیسے بجلی کی سی لہر دوڑ جاتی اور ”سرنگوں، نگاہ روبرو“ کی للکار کے ساتھ ہی وہ مؤدب کھڑے ہو کر اپنی گردنیں خم کر دیتے تھے۔

جب ایوانِ عام کے محلاتی دروازے پر ”حدِ ادب، پیش نظر، آمد سلطان ظفر“ کی پرشکوہ اور ولولہ انگیز صدا ابھری تو ایک ساتھ ہزاروں نگاہیں دروازے کے اطلسی پردہ پر مرتکز ہو کے رہ گئیں۔

دوسرے ہی لمحہ پردہ کو حرکت ہوئی محافظ خاص نے اطلسی پردہ اُچک لیا ”اور سرنگوں نگاہ روبرو“ کی آواز کے ساتھ سلطان شاہانہ تمکنت اور رعب و وقار کے ساتھ ایوانِ عام

میں داخل ہوا۔

جب اہل دربار نے جھکی ہوئی گردنیں اوپر اٹھائیں، وہ تخت زریں پر متمکن ہو چکا تھا اور قاضی القضاۃ علامہ منہاج آئینِ دربار کے مطابق سلطان کی جلوہ آرائی کا مقصد بیان کر رہا تھا۔

قاضی منہاج کی آواز وسیع و بلند اور کشادہ ایوان میں سمندری موجوں کی طرح ڈوبتی اور اُبھرتی رہی۔ سب لوگ دم سادھے چپ چاپ کھڑے تھے اور سلطان کی نگاہیں طائرانہ انداز میں ان کے چہروں پر پرواز کر رہی تھیں۔

ایوانِ عام بیسیوں مدور ستونوں پر کھڑا تھا جن پر بہمنی فن تعمیر اور نقش و نگار سے منقوش محرابیں ہلالی کنگروں کی شکل میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ستونوں کے ساتھ مرمریں خوشبو دانوں میں عنبر و عود اور لوبان سلگ رہے تھے اور معطر دھوئیں کی لہریں پیچ و خم کھاتی ہوئی سوئے سقفِ بلند رواں تھیں۔

مسند شاہی سے چند قدم کے فاصلے پر ایوان کے بیرونی دروازوں تک کم و بیش پانچ ہزار انسان سینوں پر ہاتھ باندھے قطار در قطار مؤدب کھڑے تھے۔ امراء، وزراء، سردارانِ فوج، عمال ملک، مصاحبین دربار اور سلطنت بہمنی کے وفادار اپنے اپنے منصب اور اعزاز کے مطابق حاضر تھے۔

جب قاضی القضاۃ سلطان کی مسند آرائی کا مقصد بیان کر چکا تو سلطان نے امیروں اور مشیروں پر نگاہ دوڑائی۔ دربار عام میں قاضی القضاۃ شہزادوں، سپہ سالاروں وکیل سلطنت، صدر جہاں اور علماء کرام کے علاوہ چند خاص مشیروں کے سوا اور کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی، حکم تھا کہ سب لوگ جنہیں حاضری کا شرف حاصل ہے دربار میں ایستادہ رہیں اور چند خواص کو بھی محض اس لئے بیٹھنے کی اجازت تھی کہ انسانوں کے ہجوم میں تنہا بیٹھنا معیوب سمجھتا تھا۔

مسند کے دائیں بائیں ہوشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک جلوہ فرما تھے جو اپنی کمال وفاداری کی وجہ سے سلطان کے بے حد منظورِ نظر ہو گئے تھے اور امور سلطنت کی باگ ڈور انہی کے قبضہ میں تھی حتیٰ کہ سلطان سے ملاقات کے لئے ان کی منظوری حاصل کرنا ضروری تھی۔

تختِ سلطانی کے نیچے قاضی القضاۃ اور خاص علماء کی مسند تھی جس پر علامہ منہاج، مولانا لطف اللہ سبزواری، قاضی سراج، عالم فلکیات حکیم حسن گیلانی، سید محمد کازرونی وغیرہ بیٹھتے اور بوقت ضرورت سلطان کو مناسب مشورے دیتے تھے۔

دائیں جانب فرزندِ سلطان شہزادہ حسن خاں جسے ولی عہد کا شرف حاصل تھا اور جس کی کمان میں آٹھ ہزار سوار ہر وقت احکام کے منتظر رہتے تھے اپنے مخصوص لباس اور نشان کے ساتھ کرسی نشین تھا۔ وہ دریائے تنگ بھدرا کے اس پار اپنے فوجی پڑاؤ سے سلطان کی آمد کی خبر سن کر اپنے چند مشیروں کے ساتھ حاضر دربار ہوا تھا اور اُس کے بعد حاکم مدگل فولاد خاں سیستانی محاذ جنگ کا نگران تھا۔

اس کے ساتھ ہی وکیل سلطنت صدر جہاں امیر فضل اللہ انجو شیرازی کی کرسی تھی، جو امورِ سلطنت میں سلطان کا مشیرِ خاص ہونے کے علاوہ برار کی فوجوں کا سالار بھی تھا۔ 703ھ میں اُس نے کھیرلہ کے حاکم نرسنگھ رائے کے خلاف بڑی بہادری سے جنگ لڑی اور فتح پائی تھی۔ جس کے بعد وہ سلطان کا منظور نظر بن گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ سلطان کے ساتھ اُس کی رشتہ داری بھی قائم تھی۔ اس کی بیٹی فرزندِ سلطان شہزادہ حسن خاں کے نکاح میں تھی اور سلطان کی اپنی ایک بیٹی صدر جہاں کے بیٹے میر شمس الدین محمد انجو کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے سلطان کے ساتھ اُس کے تعلقات خاص نوعیت کے تھے۔ صدر جہاں کا عہدہ بہمنی سلطنت میں سب سے اعلیٰ تھا اور بادشاہ اس کی رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاتا تھا خود سلطان کو استاد فضل اللہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا اس لئے دربار میں اس کی عزت و تکریم کے متعلق کوئی شخص غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ تلنگا، گونڈوانہ، وارنگل اور بیجا نگر میں اس کی بہادری کی دھاک بیٹھی تھی اور اتنی سی بات ہر کوئی جانتا تھا۔ جس معرکہ میں صدر جہاں فضل اللہ شیرازی شریک ہوتا ہے اس میں کامیابی ہمیشہ سلطانی سپاہ کے قدم چومتی ہے۔

تخت کے بائیں جانب سلطان کا جنگجو، شجاع اور ہیبت افگن بھائی احمد خاں بہمنی جلوہ افروز تھا جو سلطانی افواج کا سپہ سالار، امیر الامراء اور خان خاناں کے معزز ترین لقب سے سرفراز تھا وہ سلطان کا وفادار اور خود کو بہمنی تخت و تاج کا محافظ سمجھتا تھا۔ اس نے ہر معرکہ میں شجاعت اور تیغ زنی کے جوہر دکھائے تھے اور دکن میں لوگ اس کی بہادری کی قسم

کھایا کرتے تھے، شہزادہ حسن خاں کی طرح اُسے بھی شاہی کلغی، شاہانہ پنکا، چتر سراپردہ، سپاہ خاص، ہاتھی اور تخت حاصل تھے۔

اس کے ساتھ ساغر کے قلعہ کا حاکم میاں سدھو جو سر توبتی کے منصب پر فائز تھا کرسی نشین تھا اور اس کی بائیں سمت حاکم کھترلہ نرسنگھ رائے کا جواں ہمت بیٹا کوسل رائے جو ہراول دستوں کا نگراں تھا۔ بصد تمکنت بیٹھا تھا۔ جس نے سلطان سے عزمِ وفا باندھا تھا۔

علمائے کرام کی مسند کے سامنے میر فضل اللہ آنجو شیرازی کے لڑکے میر شمس الدین (سلطان کا داماد) اور میر غیاث الدین فرزندِ خانخاناں، علاؤ الدین، شیر خاں (خانخاناں کا بھتیجا) میر تقی الدین محمد (صدر جہاں کا داماد) اور دوسرے جنگجو سورمے، ارگو خاں، مظفر قباچہ اور قطب الدین وغیرہ ایستادہ تھے۔

سلطان کی طرح یہ سب امیر اور بہادر لوہے کا لباس پہن کر آئے تھے کیونکہ وہ جنگی کونسل کے خاتمہ کے بعد عموماً محاذ جنگ کی طرف کوچ کے احکام صادر کرتا تھا اور روانگی میں ایک ساعت کی بھی تاخیر نہیں ہوتی تھی اس لئے ایسے موقع پر سپہ سالار اور فوجی افسر عموماً جنگی لباس پہن کر حاضر دربار ہوتے تھے۔ اہم جنگوں اور مہموں سے قبل سلطان ایوان عام میں جنگی کونسل کا اجلاس بلاتا اور سرداران فوج کو اپنے فیصلوں سے مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس موقع پر کوئی شخص جسے دربار میں کوئی منصب یا اعزاز حاصل تھا غیر حاضری کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

سب لوگ جانتے تھے سلطان بیجے نگر کے مہاراج دیورائے کے خلاف اہم فیصلہ صادر کرنے والا ہے۔ قاضی منہاج نے بھی اس کی جلوہ آرائی کا مقصد بیان کرتے وقت دیورائے کا تذکرہ کیا تھا۔ سلطان نے ایک ہاتھ سے تخت کے پایہ کو تھام لیا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے صبر و تحمل سے کام لے رہا ہے لیکن بتدریج اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ سب لوگ گوش بر آواز تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔

”تم جانتے ہو ہم نے بیجے نگر کو بزور شمشیر فتح کیا تھا۔ اگر چاہتے تو اس سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے اسے اپنی سلطنت کا صوبہ بنالیتے مگر ہم نے یہ پسند نہ کیا۔ دیورائے کی درخواست صلح منظور کی، اُس نے ہمیں نذرانے اور تاوان دے کر رخصت کیا اور یہ عہد کیا کہ وہ آئندہ بہمنی حدود کے اندر

تاخت و تاراج نہیں کرے گا۔ مابدولت کو ہر سال جزیہ ادا کرے گا اور جب ہم اسے بلائیں گے۔ وہ ہمارے حضور میں پیش ہو گا۔ لیکن مہاراج دیورائے نے ان تمام وعدوں کو فراموش کر دیا۔ جزیہ کی ادائیگی روک دی۔ ہماری حدود سلطنت پر حملہ آور ہوا اور امن و آشتی کے تمام عہد توڑ کر ہماری سرحدی رعایا کے جان و مال کا دشمن بن گیا۔

ہمیں بتایا گیا ہے اس نے مدگل کے علاقہ میں ایک ہندوستانی کی نوجوان اور حسین لڑکی پرتھال کو حاصل کرنے کے لئے اپنے راج گورو کے ساتھ ایک مہم روانہ کی تھی۔ جب پرتھال نے اس کا پیغام مسترد کر دیا اور بیجانگر جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو دیورائے کا پیمانہ ظلم و ستم لبریز ہو گیا اس نے اپنے سواروں کو ساتھ لیا اور رات کے اندھیروں میں دریائے تنگ بھدرا کو عبور کر کے اچانک مدگل کی بستیوں پر حملہ کر دیا۔ اُس نے گاؤں کے گاؤں پھونک ڈالے۔ ہماری وفادار رعایا کو قتل کیا۔ ان کے گھر لوٹے اور تباہی و بربادی کا دیوتا بن گیا۔

تباہی کی خبریں پہنچتے ہی ہم نے شہزادہ حسن خاں کو دیورائے کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی فولاد خاں سیستانی نے دیورائے کو دریا کے اُس پار بھگا دیا تھا لیکن اُس کے اچانک حملہ سے جان و مال کا جو نقصان ہوا ہے ابھی اُس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ دیورائے اس سے پہلے بھی عہد نامے کی خلاف ورزی کر چکا ہے لیکن ہم اس لئے خاموش رہے شاید ہماری خاموشی ہی اُسے راہ راست پر ڈال دے لیکن اُس نے ہماری مملکت کی ایک مجبور و بیکس لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈال کر ہماری غیرت کو للکارا ہے ہم اُس کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

سلطان کی آواز ایوان میں گونج رہی تھی اور سب لوگ ہیا کت و صامت اُسے جوشِ غضب میں شعلے اُگلتے دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں حیرت انگیز طور پر چمک رہی تھیں۔

اچانک اُس نے صدر دروازہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

پھر اُس نے بلند آواز سے حکم صادر کیا۔

"پرتھال کو حاضر کیا جائے۔"

صدر دروازے کے پاس ایک مصاحب نے گونگ پر ضرب لگائی ایک آواز یوں گونج گئی جیسے نوبت پر چوٹ پڑی ہو۔

سلطان کے حضور میں

شہزادہ حسن اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب لوگوں کی مضطرب نگاہیں صدر دروازہ کی طرف اٹھیں اور حسین و ماہ جمال پرتھال رونق بیگ کی معیت میں دربار میں داخل ہوئی۔ وہ شہزادیوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی اس کے پیچھے لکھپت سنار اور گاؤں کا مکھیا کاکا سکھ دیو بھی سر جھکائے چلے آ رہے تھے۔

اہل دربار نے پرتھال کو دیکھا تو سب اُس کے جمالِ جہاں آفریں پر دم بخود رہ گئے۔ اکثر لوگ اپنی آنکھیں جھپکانا بھول گئے۔ کئی دل دھڑکے اور نبضوں میں خون نہایت تیزی کے ساتھ سرسرانے لگا۔ خود سلطان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اس کی حیرت پاش نگاہیں پرتھال کے منور اور درخشاں چہرے پر جم کر رہ گئیں اور حیرت و اضطراب کے عالم میں اس نے تختِ شاہی پر پہلو بدلا۔

"کیا سچ مچ اس چاند کے ٹکڑے کا نام پرتھال ہے......"

سلطان حیرتوں میں ڈوبنے لگا اور پرتھال اپنی سحر انگیز رفتار کے ساتھ تخت شاہی سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر کورنش کی رسم ادا کرنے لگی۔ رونق بیگ لکھپت سنار اور سکھ دیو اس کے ساتھ ہی سرنگوں ہو گئے۔

"لڑکی!"

سلطان کی آواز گونجی اور پرتھال سروقد کھڑی ہو گئی۔ شہزادہ حسن کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں پرتھال سلطان کی باتوں کا جواب دیتے وقت کوئی لغزش نہ کر بیٹھے۔

"کیا تمہارا نام ہی پرتھال ہے؟"

سلطان نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"سلطان معظم! کنیز ہی کو پرتھال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

لوگوں کو اپنے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں اور سلطان بھی اس مترنم اور سحر آلود آواز پر چونک اٹھا۔ پھر اس نے رونق بیگ کو اس کے ہمراہ دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"رونق بیگ تمہاری موجودگی کا مطلب؟"

"ظلِ سبحانی! جب سے پرتھال کا گاؤں تباہ ہوا ہے یہ اپنے والدین کے ساتھ خانہ زاد ہی کے زیر سایہ رہتی ہے۔"

بیگ کا جواب اگرچہ مختصر تھا لیکن سلطان نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا وہ جانتا تھا اس کی تربیت میں رہنے والی لڑکیاں شاہی آداب سیکھنے میں دیر نہیں لگاتیں۔

"لیکن ہم نے تمہیں یہ اختیار نہیں دیا تھا۔"

"غلام جانِ عالم کے حکم پر پرتھال کی نگرانی کر رہا ہے۔"

"بارک اللہ!"

سلطان نے معنی خیز نگاہوں سے شہزادہ حسن کی طرف دیکھا۔ سلطان کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر شہزادہ بڑے باوقار انداز میں کھڑا ہوا اور بولا۔

"اعلیٰ حضرت! دیورائے کے حملہ کے بعد میں نے پرتھال کی نگرانی ضروری سمجھی مدگل اور فیروز آباد کا علاقہ میرے ماتحت ہے میں جانتا تھا سلطان حضور مجھ سے باز پرس کر سکتے ہیں۔"

شہزادہ کے جواب پر سلطان نے اپنی نگاہ سے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ پھر پرتھال کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ایک سحر زدہ پیکر کی طرح مؤدب کھڑی تھی سلطان کہنے لگا۔

"لڑکی! کیا تم کبھی بیجا نگر گئی ہو۔"

"نہیں عالم پناہ! کنیز کو ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے تم نے دیورائے کو نہیں دیکھا۔"

"دیکھا بے شک نہیں لیکن اس کے افسانے ضرور سنے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"عالی جاہ!" پرتھال اپنی موسیقی نواز آواز میں بولی۔

"مہاراج دیورائے کا راج رنو اس عورتوں کا ایک باڑہ ہے۔ جہاں اُن غریبوں کے ساتھ بھیڑ بکریوں کا سا سلوک ہوتا ہے جہاں اُن کی جوانی ٹوٹے ہوئے پھول کی مانند مرجھا جاتی ہے اور بھنورا نئی کلیوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" سلطان کے لہجے میں تعجب کی جھلک تھی۔

"کنیز سب کچھ جانتی ہے سلطان عالی!" ایک لمحہ اُس نے رک کر جواب دیا۔

"بیجے نگر کے راج گورو پنڈت گورکھ ناتھ میرے بھی گورو ہیں۔ میں نے راگ ودّیا انہی سے سیکھی تھی۔ دیورائے کے رنو اس کی حقیقت انہی کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ شاید عالم پناہ نے سماعت فرمایا ہو گا۔ وہی تو میرے لئے بیجے نگر سے سندیس لے کر آئے تھے۔"

"اور تم نے اس سندیس کا کیا جواب دیا؟"

"میرے آقا! کنیز نے اس سندیس کے جواب میں ایک خنجر روانہ کیا تھا۔"

"خوب!" سلطان تخت پر اچھل پڑا۔ "خدا کی قسم تم نے بالکل صحیح جواب دیا۔ دکن کی ہر بیٹی کو غیرت مند ہونا چاہیے۔ ہماری مملکت کی لڑکیاں عیاش حکمرانوں کے لئے تفریح کا کھلونا نہیں۔ پرتھال! مابدولت تمہاری بہادری پر خوش ہوئے۔"

"میرے آقا کی ذرہ نوازی ہے۔"

"اور اس واقعہ کے بعد دیورائے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تمہیں گرفتار کرنے آیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"آقا حضور کو بالکل صحیح خبر ملی ہے۔" پرتھال غمگین اور بھیگے ہوئے لہجہ میں بولی۔

"میرے انکار پر مدگل کی بستیوں پر ایک قیامت بیت گئی۔ دیورائے خون کے چھینٹے اڑاتا اور گاؤں کے گاؤں نذر آتش کرتا ہوا آگے بڑھا۔ موت کی دیوی اُس کی ہم رکاب تھی اس بھیانک سے زندگی کی تلاش میں ہم اپنے گھروں سے نکلے اور پہاڑی دروں میں روپوش ہو گئے۔ جہاں گھٹی گھٹی متعفن فضا میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ بعد میں ہمارے گھر پھونک دیئے گئے۔ ہماری چھوٹی سی سورگ [illegible] میں تبدیل ہو گئی اور دیورائے نے سینکڑوں ہونٹوں سے زندگی کی مسکراہٹیں چھین کر انہیں موت کی ہچکیاں بخش دیں اس کے

جیون کی پونجی لوٹ لی۔ اور میرے آقا نے ان اپنوں کی چیخیں اور ان کی ہچکیاں اور گریہ زاری سنی ہوتی۔ جنہیں بیجانگر کے سورماؤں نے نیزوں پر اُچھالا تو میرے آقا غم و اندوہ سے تڑپ اٹھتے۔ مدگل کی جلی ہوئی اُجاڑ بستیاں اور راکھ کی ڈھیریاں جہاں کبھی ہنستے بستے گھر دندے آباد تھے۔ سلطانِ معظم کے نام کی دہائی دے رہی ہیں...... عالی جاہ! موت کی پرچھائیاں ابھی تک زندگی کے ویرانوں میں سرگرداں ہیں۔ اور میں اپنے رحمدل آقا کے عدل و انصاف کا دامن تھام کر فریاد کرنے آئی ہوں۔ کیا بہمنی بہادروں کی تلواریں کند ہو چکی ہیں؟ کیا اُن کے نیزوں کے پھل مُڑ گئے ہیں؟ کیا اُن کے تیروں کی انیاں ٹوٹ چکی ہیں؟"

"لڑکی!"

اچانک سلطان کی رعد بردوش آواز کا کڑکا سنائی دیا اور جوشِ غضب میں کانپتا ہوا وہ مرمریں محراب کے ستون تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی شہزادے عمائدین سلطنت اور علمائے کرام نہایت عجلت سے حرکت میں آئے اور اپنی جگہیں چھوڑ کر مؤدب طریق سے کھڑے ہو گئے۔ جب سلطان بنفس نفیس کھڑا ہو تو دربار میں کوئی شخص بیٹھنے کی گستاخی نہیں کر سکتا تھا۔

ایوان پر ایک مہیب سناٹا طاری تھا۔ جیسے انسانوں کو سانپ سونگھ گیا ہو لوگوں کے چہروں پر ایک خوف، ایک اضطراب کروٹیں لینے لگا۔ شہزادہ کی بھنویں دوڑ کر آپس میں مل گئی تھیں۔ پرتھال نے ایسی بات کہہ دی تھی۔ جس نے سلطان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔ اس کی غیرت پر ایک چرکہ لگایا تھا اور یہی گستاخی اس کے اشتعال کا باعث بنی تھی۔ غم و غصہ کی شدت سے وہ ابھی تک کانپ رہا تھا اس کی گردن پر لٹکتی ہوئی فولادی جالی پر ایک لرزش طاری تھی اور لوہے کے لباس میں اُس کا بدن یوں کپکپا رہا تھا جیسے مضراب کی جنبش سے ستار کے تار تھرتھرا اُٹھتے ہیں ستار کی لڑکی نے بہمنی بہادروں کی کند تلواروں، مڑے ہوئے نیزوں اور ٹوٹے ہوئے تیروں کا طعنہ دے کر گویا ان بہادروں کے منہ پر سرِ دربار طمانچہ مار دیا تھا اور سلطان کو محسوس ہوا تھا۔ جیسے یہ طمانچہ اس کے اپنے رخسار پر پڑا ہے۔

اُف پرتھال نے کتنی بڑی جراُت کی تھی۔ رونق بیگ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ گردن خم کیے کورنش بجا لانے کے بعد کہہ رہی تھی۔ "آقا حضور! کنیز گستاخی کے لیے

معافی کی طلب گار ہے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ بہمنی بہادر اپنے فرض سے غافل ہو چکے ہیں۔"

"ہم تم سے ناراض نہیں لڑکی!" سلطان نے ذرا دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

صاف ظاہر تھا۔ وہ انتہائی ضبط و تحمل سے کام لے رہا ہے۔

"مابدولت اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ تم نے خوشامد نہیں کی اور دل کی بات کہہ دی ہم تمہاری اس جرأت کو پسند کرتے ہیں لیکن یہ مت بھولو۔ ہماری خاموشی کا مطلب محض دیوراۓ کو ڈھیل دینا تھا۔"

پرتھال چپ چاپ سر نہواڑے کھڑی تھی اور سلطان کہہ رہا تھا۔ "حکومت کی بعض مصلحتیں فوج کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور سپاہی احکام ملنے تک حرکت میں نہیں آتے۔"

بہمنی سلطان مرمریں محراب کے ستون تھامے جوش و غضب کی حالت میں کھڑا تھا۔ اگرچہ اس نے پرتھال کے حوصلہ کی تعریف کی تھی۔ جس نے سرِ دربار بہمنی بہادروں پر اتنی بڑی چوٹ کی تھی اور بڑے دھیمے لہجہ میں اس کی جرأت پر تحسین کا کلمہ پڑھا تھا۔ لیکن اہل دربار ابھی تک خوف سے لرزاں تھے اور شہزادہ حسن کا دل تو بید مجنوں کی بکی شاخ کی مانند یوں تھرتھرا رہا تھا۔ جیسے چاروں طرف سے آندھی کے تیز و تند جھکڑ امنڈ آئے ہوں۔

سلطان کی عادت تھی وہ عورتوں کو کبھی سخت لہجہ میں مخاطب نہیں کرتا تھا اور حتیٰ الامکان ان سے نرمی اور شفقت کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن ایک معمولی سنار کی لڑکی کو یہ اختیار کس نے دیا تھا وہ سلطان معظم کے حضور بہمنی بہادروں کی شجاعت کا نوحہ پڑھے اور اس بے باکی و گستاخی کے ساتھ گفتگو کرے کہ خود سلطان بہ نفس نفیس زخمی شیر کی طرح تڑپ کر کھڑا ہو جائے کیا آج تک دکن کی کسی شہزادی نے بھی سلطان کے سامنے اس انداز میں گفتگو کی تھی؟

نہیں...... پھر پرتھال کوئی شہزادی نہ تھی کسی سردار کی لڑکی نہ تھی، وہ مدگل کے غریب سنار کی بیٹی تھی۔ جسے ملکی سیاست میں دخل اندازی کا کوئی اختیار نہ تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا۔ پرتھال کا فقرہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند سلطان کے دل میں پیوست ہو چکا ہے اور وہ خود سینے میں اس کی چبھن محسوس کر رہا ہے نامعلوم اس چبھن اس خلش کا ردعمل کس

قیامت کی شکل میں ظاہر ہو؟

اپنی اپنی جگہ ہر کوئی قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا ممکن ہے سلطان معظم پرتھال کی گستاخی کی سزا روتق بیگ کو دے جو اُسے نہیں سکھا سکا کہ بادشاہ کے حضور گفتگو کے آداب کیا ہیں؟

دربار پر سناٹا طاری تھا۔ بلند ستون اور منقش محرابوں پر ایک پُراسرار خاموشی رینگ رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس خاموشی کی تہہ میں کوئی بھیانک خطرہ کروٹیں بدل رہا ہو۔

سلطان کی آنکھوں میں ابھی تک خشونت کے سائے لرزاں تھے لیکن اس کا چہرہ بتدریج پُرسکون ہوتا جا رہا تھا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اُس نے اپنے سر کو ایک معنی خیز جنبش دی پھر پرتھال سے مخاطب ہو کر بولا۔

"لڑکی! تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟"

"نہیں میرے آقا! میں جو کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کہہ چکی ہوں۔"

"لیکن ہم محسوس کرتے ہیں تمہارے پاس کہنے کے لئے ابھی کچھ باقی ہے۔"

"عالی جاہ!"

سلطان نے اپنا بازو پرتھال کی طرف لہرایا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"تمہارے ہونٹوں کی کپکپاہٹ، چہرے کا رنگ، دل کا اضطراب اور نگاہوں کی زبان ابھی کچھ اور کہنا چاہتی ہے اور ہماری طرف سے تمہیں اپنے دل کی بات زبان پر لانے کی اجازت ہے۔"

"سلطان عالی! کنیز صرف ایک سوال کی اجازت چاہتی ہے۔"

"جو کچھ بھی پوچھنا چاہو بے خوف ہو کر پوچھو ہم جواب کے پابند ہو چکے ہیں۔"

"شکریہ اَن داتا!" پرتھال گردن جھکا کر بولی۔ "کنیز اپنے آقا سے صرف یہ پوچھنے کی تمنا رکھتی ہے اگر کوئی لٹیرا کسی غریب لڑکی کی عزت لوٹنے پر تل جائے تو باپ کو کیا کرنا چاہیے؟"

"اس لٹیرے کا سر قلم کر کے بیٹی کے قدموں میں ڈال دینا چاہیے۔" سلطان نے فوراً جواب دیا۔

"میرے آقا! آپ سلطان ہیں، بادشاہ ہیں، عالم پناہ ہیں اور یہ کنیز آپ کی رعایا۔ بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے اس رشتہ سے میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بجے نگر کے مہاراج دیورائے نے آپ کی عزت لوٹنا چاہی ہے، اس نے بہمنیوں کے دامن پر ہاتھ ڈالا ہے اب باپ کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے میں دیورائے کا سر اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں لے کر واپس جانا چاہتی ہوں کیا میری یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے؟"

ایک لمحے کے لئے دربار پر پھر سناٹا چھا گیا سب لوگ پرتھال کی اس جرأت پر حیران وششدر رہ گئے۔ شہزادہ حسن کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا۔ اطمینان اضطراب پر غالب آ چکا ہے اس مرتبہ پرتھال نے جس انداز میں سلطان کی غیرت کو جھنجھوڑا اور جس حسین پیرایہ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے گفتگو کا سلیقہ اور جذبات کو مشتعل کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔

سلطان کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک بتا رہی تھی کہ پرتھال نے اس کے سینہ میں ایک ہلچل ڈال دی ہے اور اس وقت وہ کوئی اہم فیصلہ کر رہا ہے اچانک اس کی آواز کی گرج سنائی دی، وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"ہم اپنی بیٹی کی تمنا ضرور پوری کریں گے۔"

پھر سلطان اپنے بھائی احمد خاں خانخاناں سے مخاطب ہوا۔

"احمد خاں! لشکر کو آج ہی کوچ کرنا چاہیے۔ اپنی بیٹی کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے ہم بجے نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں تاکہ آنے والی تاریخ یہ نہ کہہ سکے۔ فیروز شاہ رعایا کا باپ ہو کر اپنا فرض پورا نہ کر سکا۔"

"سلطان معظم! فوج صرف آپ کے حکم کی منتظر ہے۔"

احمد خاں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "ہم آج ہی دریا عبور کر کے بجے نگر میں داخل ہو جائیں گے۔"

احمد خاں کو کوچ کا حکم دے کر سلطان پھر پرتھال سے مخاطب ہوا۔

"لڑکی! اگر تمہارے دل میں کوئی اور تمنا ہو تو اُسے بھی بیان کر سکتی ہو۔"

"عالی جاہ! ایک ادنیٰ کنیز کی خاطر جو کچھ آپ نے کیا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا

آج تک ایسی عزت نصیب نہ ہوئی ہو گی لیکن میرے دل کے گوشہ میں ایک اور تمنا بھی چھپی بیٹھی ہے جسے بیان کرنے سے پہلے مجھے اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے۔"

"اپنی تمنا بیان کرو۔ اگر ہمارے بس میں ہوا تو اسے بھی ضرور پورا کریں گے۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔"

"پرتھال نے شکر گزار نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھا پھر جھک کر بولی۔

"سلطانِ عالی! کنیز کو اگر اپنے آقا حضور کے ہاتھوں کا سایہ میسر آ جائے تو وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت ہستی سمجھے گی۔"

"تم جیسی بہادر لڑکی کو یقیناً ہمارے ہی زیرِ سایہ رہنا چاہیے۔"

اور سلطان کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی پرتھال نے جھک کر کورنش ادا کی۔ پھر سلطان بلند آواز سے پکارا۔

"رونق بیگ! آج سے پرتھال ہماری بیٹی بن کر محل سرا میں رہے گی اسے چچی حضور بیگم جہاں کے قصر تک پہنچا دیا جائے انہیں کہو، مابدولت نے اُن کے لئے ایک انمول ہیرا بھیجا ہے، بیجے نگر سے واپسی کے بعد ہم اپنی امانت واپس لے لیں گے۔"

رونق بیگ نے اطاعت میں سر جھکا دیا۔ فرطِ مسرت سے پرتھال کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، سلطان غریبوں پر اتنا مہربان بھی ہو سکتا ہے اور معمولی لڑکی کی خاطر وہ بیجے نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے پر تل جائے گا۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ واقعی آج اسے ایسی عزت نصیب ہوئی تھی کہ دکن کی کسی لڑکی نے اس کا تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ شکر گزاری کا احساس اس کی آنکھوں سے پانی بن کر بہنے لگا اور وہ گلوگیر آواز میں کہنے لگی۔

"آفتاب نے ذرے پر نوازش کی ہے میرے آقا! آپ نے غریبوں کی لاج رکھ لی ہے نہیں بلکہ انہیں ایسی عزت بخشی۔ جو آسمان کے ستاروں کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی میں آپ کی کامیابی کے لئے پرارتھنا کروں گی۔ آپ کے جانے کے بعد میری نگاہیں بیجے نگر کے راستوں پر منڈلایا کریں گی۔ میرے کان آپ کی آواز سننے کے منتظر رہیں گے۔ بھگوان لڑائی میں آپ کی رکھشا کرے جیت آپ کی ہو اور......"

"جیت ہمیشہ سچائی کی ہونی چاہیے۔"

سلطان نے پرتھال کی بات کاٹی۔

"مگر آپ کی تلوار بھی تو سچائی کی حمایت میں اٹھے گی۔ آپ غریبوں کی عزت کے رکھوالے ہیں میرے مالک! بھگوان آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔"

پھر سلطان نے ہاتھ سے اشارہ کیا جسے سمجھنے میں پرتھال نے غلطی نہیں کھائی۔ اس نے نہایت احترام کے ساتھ جھک کر کورنش ادا کی اور الٹے قدموں چلتی ہوئی دروازے تک آ گئی۔ رونق بیگ لکھپت سنار اور سکھ دیو کا کانے بھی اس کی پیروی کی۔ لکھپت اور سکھ دیو کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ آج انہیں دربار میں ایسی عزت ملی تھی جس کے متعلق وہ صرف سپنے دیکھ سکتے تھے مگر یہ کوئی سپنا نہ تھا۔ کوئی خواب نہ تھا۔ سورج کی مانند چمکتی ہوئی حقیقت تھی کہ سلطان نے پرتھال کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور اس کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے بہمنی فوجیں آج ہی بیجے نگر کی طرف کوچ کرنے والی تھیں، یہ عزت، یہ بڑائی، یہ شوبھا، آنسوؤں کی دھار میں منتقل ہو کر ان کے چہروں پر بہہ نکلی تھی اور لکھپت سنار کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔" اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر زبان سلطان کے احسان سے گنگ ہو گئی تھی۔

واقعی بھگوان کی لیلا نیاری تھی۔ دروازے پر پہنچ کر پرتھال نے دیکھا شہزادہ حسن کی مطمئن اور شوخ نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ولی عہد نے نگاہوں کی زبان سے اس کی کامیابی پر مبارکباد اور اپنے دل کی بے قراری کا اظہار کیا تھا۔

بے اختیار پرتھال کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی یہ گویا ولی عہد کی مبارکباد کا جواب تھا پھر وہ نہایت تیزی کے ساتھ مڑی اور دربار سے نکل گئی۔

کچھ دیر ولی عہد کی نگاہیں دروازے کے آس پاس منڈلاتی رہیں۔ پھر پلٹ گئیں۔ پرتھال رونق بیگ کے ساتھ بیگم جہاں کے قصر کی طرف جا رہی تھی۔

کوچ

فیروز آباد سے سلطانی لشکروں کی روانگی کا نظارہ کر کے تاریخ اپنے حافظہ سے کبھی محو

نہیں کر سکتی۔

سلطان ایک سفید کوتل گھوڑے پر سوار جس پر سرخ بنات کی چادر گھٹنوں تک لٹک رہی تھی۔ بہ نفس نفیس فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کا دستہ خاص جو سیاہ پرچم اٹھائے نقارہ بجاتا ہوا رواں تھا۔ اپنی خاص وردیوں اور لوہے کے چمکتے ہوئے ہتھیاروں کے ساتھ دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری کر رہا تھا۔

قلعہ اور کوشک ہائے سلطانی سے لے کر تھورہ ندی کے کنارے تک چار کوس کے رقبہ میں پوری سپاہ اپنے اپنے امیروں اور سالاروں کی رہنمائی میں حرکت کر رہی تھی۔ ان دستوں کے فوجی نشان الگ الگ اور مختلف النوع تھے لیکن اپنے امتیازی نشانات کے ساتھ سیاہ پرچم جو بہمنی سلطان کا نشان تھا۔ ہر جگہ لہراتا اور ہوا کے تیز جھونکوں میں پرندوں کی مانند پھڑ پھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سورج کی شعاعوں میں نیزوں کے پھل نگاہوں کو ذخیرہ کر رہے تھے۔ جیسے ان سے کرنیں پھوٹ رہی ہوں اور گھوڑوں کی ہلکی ہلکی مسلسل ہنہناہٹوں سے فضا میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ جیسے بہت دور کہیں شہنائیاں بج رہی ہوں۔

کلاہ و کلغی کے علاوہ امیرانِ فوج کی عام پہچان اُن کے گھوڑے تھے جن پر مختلف رنگوں کی منقش چادریں لٹک رہی تھیں۔ یا وہ امتیازی پھریرے جو ان کے آگے آگے لہراتے تھے۔

اگر قلعہ کی فصیل سے (جہاں محلسراؤں کے محافظ، خواجہ سرا، غلام اور کنیزیں قطار در قطار کھڑے سلطانی لشکر کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے) اس پُرشکوہ روانگی کا نظارہ کیا جائے تو تھورہ ندی کے میدان میں پھیلے ہوئے لشکروں کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی کچھ مشکل نہیں تھا جو اگرچہ پندرہ ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں پر مشتمل تھی لیکن اسے اس سلیقہ سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا کہ کم و بیش ایک لاکھ کا لشکر جرار معلوم ہوتا تھا۔ جو اپنے امتیازی پرچم اڑاتا ہولے ہولے تھورہ ندی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

قباچہ خان اور کوسل رائے (جو ایک چوہان سردار تھا) ہراول دستہ کو لے کر بہت پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے اور اُن کے گھوڑے آٹھ دس کوس آگے دھول اڑاتے چلے جا رہے تھے۔

ان کے بعد میر فضل اللہ انجو شیرازی کے بیٹے اور داماد اپنے دستوں کو لے کر آگے بڑھے۔

پھر لشکر ہائے سلطانی کا سپہ سالار امیر الامرا احمد خاں خانخاناں، چتر سراپردہ سپاہ خاص اور ہاتھیوں کے ایک دستہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ امیر الامراء کی شان دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے سر پر فوج کا علم خاص سایہ کناں تھا، جب اس نے گھوڑے کی باگ اٹھائی تو فیلبانوں کے اشارہ کے ساتھ ہی ہاتھوں نے چنگھاڑ کر اپنی سونڈیں بلند کر دیں اور سپہ سالار کو سلامی دی۔ پھر نوبت کی آواز پر یہ لشکر بھی چل دیا۔ خانخاناں کا فرزند میر غیاث الدین اور بھتیجا شیر خاں اس کے دائیں بائیں گھوڑے بڑھائے چل رہے تھے۔

امیر الامرا کے بعد ارگو خان کا دستہ آگے بڑھا جس کے سپاہی وحشت ناک جنگ لڑنے میں مشہور تھے۔ وہ دشمن کی سپاہ پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح حملہ کرتے تھے اور مدافعت کے وقت لوہے کی دیوار بن جاتے تھے ان کے نیزوں کے پھل سیدھے گردوں کو نشانہ بناتے تھے اور ان کا نشانہ شاذ و نادر ہی خطا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ ارگو خان کا یہ دستہ سلطان کے آس پاس ہی رہتا تھا۔

ارگو خان بھی نکل چکا تو لشکر کا قلب نمودار ہوا جو سلطانِ معظم کی کمان میں تھا۔ جو سراپردہ اور سلطانی علم کے سائے میں کمیت سلطان کوتل گھوڑے پر سوار ہیبت و دبدبہ طاری کرتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ان جانبازوں کے گھوڑے تھے۔ جنہوں نے میدان جنگ سے بھاگنا نہیں سیکھا تھا۔ ان کے کھردرے چہروں پر خشونت اور وحشت کے آثار تھے۔ صاف ظاہر تھا لڑائی کے ہنگام میں وہ موت سے کھیلنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ ورنہ انہیں سلطان کی ہمرکابی کا شرف حاصل نہ ہوتا ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک سلطان کے دائیں بائیں رواں تھے۔ سلطان کے دستۂ خاص میں بھی چنے ہوئے جنگی ہاتھی شامل تھے جنہیں فیلبان مناسب فاصلہ سے لئے جا رہے تھے، یہ سدھائے ہوئے ہاتھی جن کو سیاہ چٹانیں کہنا زیادہ مناسب ہوگا صرف ایک اشارہ پر غنیم پر یوں حملہ آور ہوتے تھے۔ جیسے موت سیاہ لبادے اوڑھ کر چنگھاڑتی ہوئی ٹوٹ پڑے۔

سلطان ہاتھیوں کو لڑانے پر بڑا ماہر تھا اور خود بھی کبھی کبھار سردار ہاتھی ''فخرا'' پر بیٹھ کر فوج کی کمان کرتا تھا۔

سلطانی دستہ کے گھوڑے اور سوار بھی بڑے چاق و چوبند اور موت سے کھیل جانے والے تھے اور بہادری کا یہی اعزاز انہیں سلطان کے دستہ خاص تک لے آیا تھا۔

یہ لشکر خاص جو دو سو ہاتھیوں اور پانچ ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ زمین کا سینہ دہلاتا اور زلزلہ سا طاری کرتا ہوا گزر گیا۔

سلطان کے عقب میں امیر فضل اللہ انجو شیرازی کے سوا کسی اور سردار کو چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ امیر کے ساتھ یہ تخصیص محض فوجی اعتبار ہی سے روا نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ سیاسی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سلطان کا عقب اس کے کسی معتمد ترین سردار کی سرکردگی میں رہے اور امیر فضل اللہ کے علاوہ یہ اعتماد کسی پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سلطان کا جنگجو بھائی امیر الامرا احمد خاں روانگی کے وقت ہمیشہ سلطان سے آگے چلتا تھا لیکن بہمنی فرمانروا نے احتیاط اور تدبر کا دامن یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے امیر الامرا اور اپنے درمیان ارگو خان کو حائل کر رکھا تھا۔ احمد خان بھی آخر داؤد خان ہی کا فرزند تھا اور حکومت کا ولولہ کسی وقت اُسے بغاوت پر آمادہ کر کے بھائی کی گردن کاٹنے پر بھی ابھار سکتا تھا لیکن فیروز شاہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ بھائی کی طرف سے غافل رہتا۔ اس نے احمد خان کو جہاں امیر الامراء اور خانخاناں کے خطاب دے کر سلطانی افواج کا سپہ سالار بنا دیا تھا وہاں ارگو خان ایسے بہادر کو اس پر مسلط کر رکھا تھا جس کے سامنے بڑے بڑے بہادروں اور جری انسانوں کی نبضیں چھوٹ جاتی تھیں یہی وجہ تھی ارگو خان کی موجودگی میں فیروز شاہ بھائی کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔

سلطان کا عقب صدر مملکت امیر فضل اللہ ایسے معتمد خاص اور جنگجو سردار کی وجہ سے محفوظ تھا۔ جس کی قیادت میں برار کے سپاہی، راجپوت سورمے، تلنگانہ کے کھشتری اور مرہٹے بھی تھے۔ ترک اور خطائی جانباز بھی تھے جن کی شجاعت اور وفاداری ایک بار نہیں کئی بار آزمائی جا چکی تھی۔

وکیل سلطنت صدر جہاں امیر فضل اللہ کے بعد قطب الدین جو پیادہ فوج کا سالار تھا۔ اپنا سرخ پھریرا اٹھائے ہوئے روانہ ہوا۔ وہ علما جو ثواب جہاد کی خاطر شریک جنگ ہوتے تھے۔ قطب الدین ہی کے پرچم تلے دادِ شجاعت دیتے تھے اور سلطان بھی انہیں سخت ترین معرکوں میں جھونکنے کو پسند نہیں کرتا تھا۔

قطب الدین کے پیچھے خیمہ و خرگاہ سامان رسد اور دوسری ضروری اشیاء تھیں ان کی حفاظت کا انتظام حاکم ساغر میاں سدھو کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جو ہنگامہ معرکہ سر نوبتی کے فرائض بھی ادا کرتا تھا میدان جنگ میں اسی کے اشارہ پر قرنا پھونکی جاتی اور نوبت پر چوٹ پڑتی تھی اور سپاہی لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے، حاکم ساغر کے ساتھ سلطان ہمیشہ مشفقانہ برتاؤ کرتا اور اسے فرزندوں کی طرح عزیز سمجھتا تھا اس نے بھی ایک معاہدہ کے تحت اپنے آپ کو سلطان کی سپرداری میں دے دیا تھا اور کمال وفاداری سے پیش آتا تھا۔

سلطان کسی بھی معرکہ کے لئے کوچ کرتا۔ فوج کی اس ترتیب میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا بلکہ حکم یہ تھا ہر سفر میں یہی ترتیب پیش نظر رہے۔

قلعہ کی فصیل سے لشکروں کی فوج در فوج روانگی کا نظارہ بڑا ہی روح پرور مگر ہیبت نواز تھا۔ بھوترہ ندی سے جنوب کی طرف حد نگاہ تک سواروں، ہاتھیوں، پیادوں لمبے لمبے نیزوں، برچھیوں اور مختلف رنگ کے اڑتے ہوئے پرچموں کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی، مڑے تڑے پیچ و خم کھاتے ہوئے راستوں پر کئی کوس تک انسانوں کا سمندر رواں دواں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکن نے اپنی تمام قوت، تمام سپاہ بیجا نگر کی طرف دھکیل دی ہے۔ جب بار بردار خچروں کا آخری قافلہ ندی کا پل پار کر کے اپنے راستوں پر ہو لیا تو فصیل کے کنگورے کے ساتھ ساکت و صامت، متحیر و ششدر کھڑے غلام، محل کے پہرے دار، کنیزیں، خواجہ سرا اور کوشک سراؤں کے محافظ ہیبت، اضطراب، تعجب اور مسرت کے ملے جلے تاثرات لے کر پلٹنے لگے مگر بعض کے دل پر اس روانگی کا کچھ ایسا اثر بیٹھ گیا تھا کہ وہ سحر زدہ پتلیوں کی طرح اس وقت تک وہاں جمے رہنا چاہتے تھے۔ جب تک لشکر کا آخری سپاہی بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

اہل دکن نے یوں تو سلطانی لشکروں کی روانگی کے بیسیوں نظارے کیے ہونگے مگر فیروز آباد کے باشندوں نے سپاہ کے کوچ کا جو منظر دیکھا تھا۔ وہ قطعی ناقابل فراموش اور تاریخ کا ایک قیامت انگیز باب تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ فیروز آباد کوئی شہر نہیں ایک جوالا مکھی ہے۔ جس کی بلندیوں نے گھوڑوں، ہاتھیوں، انسانوں اور پرچموں کی شکل میں کھولتا ہوا لاوا اگل دیا ہے اور وہ سنسناتا، سرسراتا بیجا نگر کی طرف بہہ نکلا ہے اور ہر اس چیز کو فنا

کرتا چلا جائے گا جو اس کی راہ میں حائل ہوگی۔

فصیل کے کنگورے کے ساتھ ساتھ ابھی تک بے شمار انسان گم سم کھڑے تھے اور دور جہاں زمین اور آسمان ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، سیاہ پرچموں کا کارواں مٹیالے غبار کے بادلوں میں گم ہوتا جا رہا تھا۔



8

محل سرا میں

سرخ لکیر

قصرِ سلطانی کی بیگمات محل سراؤں کی جوان اور ماہ رُخ شہزادیاں امیروں اور سرداروں کی طلعت افروز اور خوش جمال بیبیاں جن کی مسکراہٹیں ستاروں سے تابندہ تر اور جن کے شہابی رخسار گل ولالہ کی نکہت بدوش صباحتوں سے زیادہ حسین و رنگین تھے۔ اپنی خاص کنیزوں اور منہ چڑھے خواجہ سراؤں کے ساتھ محلات کے محرابی دروازوں، دریچوں، جالی دار کھڑکیوں اور جھروکوں سے لگی (جن کے چوبی پٹ پھولوں ندی کی طرف کھلتے تھے) چپ چاپ اور گم صم لشکروں کی روانگی کا نظارہ کر رہی تھیں۔

اُن کے دلوں میں جذبات کا ایک سمندر سا اُمنڈ آیا تھا۔ لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ احساسات کے ان گنت بھنور تھے جن میں ان کی تمناؤں کی کشتی ایک پھرکی کی مانند گھوم رہی تھی اور وہ نہیں جانتی تھیں۔ بھنور کی سرکش لہریں ان کی کشتی حیات کو نیچے گرداب میں لے اتریں گی یا کوئی موج اُسے موت کے اس چکر سے باہر بھی نکال لائے گی۔

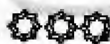
شاید یہی وہ الم انگیز احساس تھا جس نے ان کے یاقوت صفت لبوں پر خاموشی کا سحر پھونک دیا تھا۔ ورنہ عورتیں اور وہ بھی محلسراؤں کی بیگمات، شہزادیاں اور خانزادیاں کہاں خاموش بیٹھنے والی تھیں۔ ان کے بوڑھے اور جوان ہمت والے باپ بہادر شوہر، جوان بھائی اور جری بیٹے سلطان کے ساتھ ایک ایسی لڑائی پر جا رہے تھے، جس کے متعلق کوئی بھی شخص

میدانِ جنگ کا رخ کرتا ہے تو اُسے دشمن کے سوا دنیا کی ہر چیز بھول جاتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات وہ اپنے بوڑھے ماں باپ، جواں بیوی اور معصوم بچوں کو بھی فراموش کر دیتا ہے لیکن عورت اس وقت اپنے شوہر کے علاوہ کائنات کی کسی بھی شے کو یاد نہیں رکھتی۔ جب اُس کا محبوب زندگی اور موت کے درمیان مصروف پیکار ہو۔

اول تو یہی احساسات کچھ کم نہ تھے دوسرے لشکر کی روانگی کا منظر ہی ایسا ہوش ربا تھا کہ ان کی نگاہیں فوجی دستوں پر ٹک کے رہ گئی تھیں۔ البتہ جب کوئی امیرزادی اپنے شوہر یا بھائی کو دیکھ لیتی تو ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور اُسے لشکر میں ممتاز عہدے پر دیکھ کر اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔

کنیزیں بھی اپنی بیگمات کی طرح چپ چاپ تھیں البتہ خواجہ سرا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ضرور باتیں کرنے لگتے اور بعض سپاہیوں پر دلچسپ فقرے بھی چست کرتے جاتے تھے، اگر انہیں یہ احساس نہ ہوتا کہ اُن کی محترم بیگمات اپنے شوہروں سے جدا ہو رہی ہیں تو شاید ان کے قہقہے محل سرا میں شبرات کے پٹاخوں کی طرح گونجتے۔ وجہ دراصل یہ ہوئی تھی۔ آخری دستہ کے چند مسخرے سپاہی گھوڑوں کی بجائے بار برداری کے کچھ گدھے پکڑ لائے تھے اور ان پر کچھ ایسے انداز میں سوار ہوئے کہ دیکھنے والوں کو ہنسی روکنی دشوار ہو گئی تھی۔

انہوں نے گدھوں پر زین کسے انہیں لگامیں چڑھائیں، پھر دو دو مسخرے ایک ایک گدھے پر چڑھ بیٹھے، ایک کا منہ سر کی طرف تھا۔ دوسرے کا دم کی جانب، مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ پیچھے کی طرف منہ کر کے بیٹھنے والے سوار گدھوں کی دموں کو بطور لگام استعمال کر رہے تھے اور انہیں آگے کی بجائے پیچھے چلنے پر مجبور کر رہے تھے لیکن گدھے آخر گدھے تھے۔ وہ اپنے سواروں کی خوش طبعی کو کیا سمجھتے۔ تنگ آ کر انہوں نے دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیں اور سوار سر کے بل زمین پر آ رہے، یہ سارا کھیل کچھ ایسا اچانک غیر متوقع اور بے ساختہ تھا کہ تماشائیوں کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑنے لگے، حتیٰ کہ جھروکوں اور دریچوں کے ساتھ لگی شہزادیوں اور امراء کی بیٹیوں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ آئی۔ بلکہ بعض تو کھلکھلا کر ہنس دیں اور ان کی مترنم آوازیں محلسرا میں یوں کھنکنائیں۔ جیسے کسی نے طشتری میں اشرفیاں بھر کر انہیں سنگ مرمر کے فرش پر اچھال دیا ہو۔ ایک حسین نغمہ ابھرا بکھرا اور ٹوٹ گیا۔



سلطان فیروز شاہ کی چچی بیگم جہاں جسے سلطان کے مزاج میں بھی بڑا دخل تھا۔ محلسرا کی عورتوں کی حاکم اعلیٰ تصور ہوتی تھی اور کوئی بیگم یا شہزادی اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی حتیٰ کہ سلطانِ عالی کی بڑی بیگم جسے ملکہ ہونے کا شرف حاصل تھا اور محلات میں عالیہ کے نام سے یاد کی جاتی تھی، محل کی بوڑھی حاکمہ بیگم جہاں کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتی تھی ورنہ اس کے تعاون سے محروم ہو کر وہ چھوٹی بیگمات کی سازشوں کا شکار بھی ہو سکتی تھی جنہیں محل کے افسر خواجہ سرا "زریں" کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں اور قصرِ سلطانی میں کوئی بھی مرد یا عورت زریں کے اختیارات سے بے خبر نہیں تھا۔

بیگم جہاں کا محل جسے "گلِ لالہ" کہا جاتا تھا، بیگمات سلطانی کے محلات سے کافی فاصلہ پر تھا۔ بعض لوگ اسے "دریائی قصر" بھی کہتے تھے کیونکہ وہ چھورہ ندی کے عین سامنے واقع تھا اور اپنے جالی دار محرابی جھروکوں کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا جہاں سے ندی کا نظارہ بڑا دلکش اور کشش انگیز تھا۔

بیگم جہاں اور بیگم عالیہ دونوں ہی ایک محرابی جھروکے میں بیٹھیں فوج کی روانگی کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

اُن کے لئے یہ بات قطعی حیرت انگیز نہیں تھی کہ سلطان نے ایک معمولی لڑکی کی عزت کا انتقام لینے کے لئے بجے نگر پر چڑھائی کا فیصلہ کیا تھا۔ انجام جو کچھ بھی ہو اور وہ لڑکی بھی تو بیگم جہاں ہی کی تحویل میں دی گئی تھی۔

مگر عورت وہم بن کر عالیہ کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ آخر اُس نے اپنے شبہ کا اظہار کر ہی دیا۔

"چچی حضور! سلطان کہیں اس لڑکی کو اپنے حرم کی زینت تو نہیں بنانا چاہتے؟"

جس طرح آگ کے شعلہ سے بارود پھٹتا ہے اُسی طرح بیگم جہاں تڑپ کر پرے ہٹ گئی۔ بوڑھے جسم پر جیسے ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ اس نے غضب ناک نگاہوں سے عالیہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"بیگم! اگر تم نے یہ بات کسی اور جگہ کی ہوتی تو ضرور سلطان کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ خدا کا شکر کرو کہ تم اس وقت قصرِ لالہ میں ہو، اور وہ مردود زریں بھی موجود نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" بیگم عالیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''مطلب؟'' بوڑھی عورت نفرت سے بولی۔ ''کیا تم نے نہیں سنا۔ سلطان نے
پرتھال کو اپنی بیٹی کہا ہے۔''

''بیٹی؟'' عالیہ کے ہونٹ بس تھرتھرا کر رہ گئے۔

''للہ ذرا سوچو اگر تمہاری بات سلطان تک پہنچ جائے تو تمہارے متعلق کیا سوچیں
گے۔ انہوں نے بھرے دربار میں پرتھال کو اپنی بیٹی بنایا ہے۔ کیا جو باتیں دربار عام میں
ہوتی ہیں۔ تم اُن سے بھی غافل رہتی ہو؟ اتنی لاپرواہی یقیناً کسی روز تمہیں لے ڈوبے گی۔''

''مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوئی۔ خدا معاف کرے میں نے ایک نازیبا بات کہی
ہے۔''

''اور تم یہ ہر وقت عورتوں کی فکر میں کیوں کھوئی رہتی ہو۔''

بیگم جہاں نے ترشروئی کے ساتھ کہا۔ ''وہ سلطان ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ تمہیں
اعتراض کا حق نہیں۔''

''مجھے تو صرف ایک خدشہ ہے۔''

''کیسا خدشہ؟''

''یہی.....'' عالیہ کہنے لگی۔ ''اگر سلطان کوئی لڑکی حرم میں لے آئے تو شیرازی کی
طرح وہ بھی میری دشمن نہ بن جائے۔''

''لیکن جب تک میں زندہ ہوں۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارے لئے
یہ اعزاز کیا کم ہے کہ تم شہزادہ حسن کی ماں ہو۔ بہمنی سلطنت کے ولی عہد نے تمہاری کوکھ
سے جنم لیا ہے اور شیرازی تو ایک چوہیا کو بھی جنم نہیں دے سکی۔''

بیگم جہاں کے لہجہ میں حقارت ہی حقارت تھی۔

شہزادہ حسن کے ذکر پر جھروکہ کے عقبی پردہ کے پیچھے ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔
جیسے ہوا کی ایک لہر پردہ پہ شکن ڈال کے گزر جاتی ہے اور بیگم عالیہ نے اس کی سرسراہٹ پر
کوئی توجہ ہی نہ دی، وہ کہنے لگی۔

''میں ولی عہد کی ماں ضرور ہوں لیکن جوانی مجھ سے روٹھ چکی ہے اور آپ جانتی ہیں
مرد جب بوڑھا ہو جاتا ہے۔ جوان عورت شراب کا نشہ بن کر اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر
لیتی ہے۔''

"میں سمجھتی ہوں۔ سلطان تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا تم اس کے بیٹے کی ماں ہو۔ سلطنت کی سب سے بڑی طاقت تمہارے ہاتھوں میں ہے، شہزادہ حسن۔"

پردہ کے اس طرف پھر ایک سرسراہٹ ہوئی اور دوسرے ہی لمحے کسی کے ٹھوکر کھا کر گرنے کی آواز سنائی دی لیکن پھر جلد ہی کوئی سنبھل گیا۔ یہ بھی شاید واہمہ ہی تھا کہ کوئی اس طرف گیا ہے، ممکن ہے بیگم جہاں کی پالتو بلی کسی چڑیا پہ لپکی ہو لیکن عالیہ نے پردہ اٹھا کر جھروکہ کے اس طرف جھانکا تو اسے ایک سرخ لکیر کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آسکا جو کہ کمرہ کے دروازہ کے باہر بجلی کے ایک کوندے کی طرح لپکی۔ تھرتھرائی اور اچانک ہی غائب ہو گئی تھی۔ عالیہ کا ذہن اس لکیر کا تعاقب کرنے لگا۔

"یہ کیا شے تھی؟"

لیکن وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ شاید قوسِ قزح کی ایک لہر......نہیں......تو پھر ممکن ہے کسی دوپٹہ کا عکس ہو؟"

"ہائے اللہ!" عالیہ گھبرا سی گئی۔ "تو کیا بیگم شیرازی پردہ کے پیچھے چھپ کر ہماری باتیں سن رہی تھی؟" اُس نے دل ہی دل میں سوچا پھر گھبرا کر اٹھی۔

"کیا ہے؟" بیگم جہاں نے پوچھا۔ وہ اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ "تم اچانک پریشان کیوں ہو گئیں؟"

"سرخ لکیر......" عالیہ کے ہونٹ تھرتھرائے اور اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

پیاسی نگاہیں

پرتھال بیگم جہاں کی محلسرا کے ایک محرابی جھروکے میں کھڑی لشکروں کی روانگی کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے رونق بیگ کی معیت میں یہاں آئی تھی اور بیگم جہاں نے جس محبت اور شفقت کے ساتھ اُس کو "خوش آمدید" کہا...... اس سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ پہلے ہی اُسے جانتی ہو۔ اُس نے کہا تھا۔

"لڑکی! تمہارے متعلق میں جو کچھ سن چکی ہوں۔ تم اس کی مکمل تصویر ہو، دیوراے کے مقابلہ پر تم نے حیرت انگیز جرأت دکھائی ہے، میں دکن کی بہادر بیٹی کو خوش آمدید کہتی ہوں، قصرِ لالہ میں تم اپنے آپ کو اجنبی نہیں پاؤ گی۔ سلطان نے تمہیں اپنی بیٹی کہا ہے......

قصرِ لالہ کے خدام سلطان کی بیٹیوں کے آداب و مقام سے غافل نہیں۔"

تعجب کی بات تو یہ تھی۔ پرتھال دربار سے سیدھی یہیں آئی تھی اور بیگم جہاں تک وہ باتیں بھی پہنچ چکی تھیں۔ جو تھوڑی دیر پہلے وہاں ہوئی تھیں اس کا مطلب یہی ہوا تا بیگم جہاں کی معلومات ہی حیرت افزا نہیں تھیں۔ ان معلومات کا ذریعہ بھی قابل اعتماد تھا پھر اسے رونق بیگ کی یہ نصیحت یاد آ گئی "محلسرا میں آرام اور اطمینان کی زندگی کا راز دربار میں مضمر ہے۔ ہر وہ بات جو سلطان کی مجلس میں ہو تمہارے علم میں ہونی چاہیے لیکن اس کا اظہار ضروری نہیں۔"

بیگم جہاں کی باتوں سے بیگ کے خیال کی تائید ہو گئی تھی کیونکہ نہ صرف فیروز آباد بلکہ دارلسلطنت گلبرگہ کے محلوں میں بھی بیگم جہاں کی زندگی قابلِ رشک تھی۔ جب بیگ اُسے چھوڑ کر واپس چلا گیا تو اُس نے پرتھال کو ایک سرخ دوپٹہ نذر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر تم چاہو تو کسی جھروکہ میں بیٹھ کر چھورہ بندی کے نظارہ سے دل بہلاؤ تھوڑی دیر بعد لشکروں کی روانگی کا منظر بھی قابلِ دید ہو گا۔ مجھے یقین ہے۔ سلطان آج ہی کوچ کا حکم دیں گے میں تھوڑی دیر بعد تم سے آملوں گی۔ یہ محل بہت وسیع ہے جہاں چاہو جا سکتی ہو مگر مہندی کی اس باڑھ سے ہوشیار رہنا۔ وہ شیطان کی خالہ اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہے اگر تم نے مہندی کی ایک پتی بھی توڑ ڈالی، تو وہ کتیا کی طرح شور مچاتی ہوئی تمہارے سر پر پہنچ جائے گی۔ اس کی نگاہ دیواریں بھی چھید ڈالتی ہیں۔"

"کون ہے وہ شیطان کی خالہ؟"

"تم خواجہ سرا زریں کے کارنامے جلد ہی سن لو گی۔" بیگم جہاں نے جواب دیا تھا لیکن تمہیں اس کے متعلق ابھی زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں اگر اس نے تمہیں پریشان کیا تو میں اس کی چوٹی کٹوا دوں گی۔

اور پرتھال زیرِ لب مسکراتی ہوئی جھروکہ کی طرف چل آئی تھی جہاں سے چھورہ بندی کا نظارہ واقعی بڑا دلفریب تھا۔ محلسرا میں کسی عورت کے سر پر سرخ دوپٹہ کا مطلب یہ تھا۔ وہ سلطان کی بیٹی ہے تاکہ کسی شخص کو سلطان کی بیٹیوں کو پہچاننے میں دقت نہ ہو اور وہ ان کا احترام کر سکے۔ سلطان کی بیگمات اور بیٹیوں کے علاوہ اور کسی عورت کو سرخ دوپٹہ اوڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

فصیل کے نیچے وسیع و عریض میدان میں جو ندی کے ساتھ ساتھ کئی کوس تک پھیلا
ہوا تھا۔ سلطانی فوجوں کے پڑاؤ کا نقشہ بیجانگر کے سرکش مہاراج کے خط تقدیر پر خندہ زن
تھا۔ وہ سنگِ سُرخ کے ایک چھوٹے سے گول ستون کا سہارا لے کر جنوب کی طرف مدگل
ان اونچی نیچی پہاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ جن کے عقب میں اُس کا جلا ہوا گاؤں اُسے اب
بری طرح یاد آ رہا تھا۔ گاؤں سے نکل کر اُس نے انہی گونگی اور بہری پہاڑیوں کے درمیان
میں پناہ لی تھی۔ اور ایک لمحہ کے لئے فیروز آباد کے دربار، محلسرائوں اور کوشکوں کو ذہن سے
جھٹک کر وہ پھر کالی چمگادڑوں کی اس جنت کے دہانے پر کھڑی تھی، اچانک ایک ساتھ
متعدد توپوں کی لرزہ خیز دھمک نے اُسے چونکا دیا۔ پھر قرنا کی رعد آسا آواز سنائی دی
پتھورہ ندی کے میدان میں لشکروں کے پرچم بلند ہونے لگے۔ اُس نے سنبھل کر دیکھا
سلطان معظم کی سواری بڑے شاہانہ کروفر کے ساتھ آ رہی تھی اور اس کے آگے پیچھے عمائدِ
سلطنت، امراء، خواتین، لشکروں کے سالار اور کمانڈار مناسب فاصلہ پر چل رہے تھے۔
سیاہ پرچموں نے فضا کو ڈھانپ لیا تھا اور میدان کے وسط میں پہنچ کر جب سلطان
ایک لمحہ کے لئے رکا تو امرا اور سالار یوں تیزی کے ساتھ اپنے اپنے لشکروں کی طرف
مڑے جیسے ایک ہی کمان سے مختلف سمتوں کو بیک وقت کئی تیر چھوڑ دیئے گئے ہوں۔
سلطان نے دستۂ خاص کی سلامی لی اور ترتیب وار لشکروں کی روانگی شروع ہوئی۔
پرتھال سرخ ستون کا سہارا لئے بڑی بے تابی کے ساتھ روانگی کا نظارہ دیکھنے
اس کی نگاہیں بجلی کی سی تیزی سے مختلف اطراف میں دوڑ رہی تھیں ابھی یہاں، ابھی وہاں
اس لشکر سے اس لشکر تک، پھر قلب میں جہاں خاصا کے جنگجو ہاتھی کبھی کبھی اپنی سونڈ اٹھا کر
چنگھاڑتے تھے، جوں جوں لشکر ندی کا پل عبور کر کے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی بے قراری
اور پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ جب نصف فوج جا چکی اور امیر الامراء
ارگو خان کا دستہ روانہ ہوا تو پرتھال کے چہرے پر اضطراب اور پریشانی کے ساتھ اداسی و
فکر کی پرچھائیں بھی گہری ہوتی گئیں۔ اس کا مضطرب...... نگاہیں ایک مرتبہ پھر
سرعت کے ساتھ بقیہ لشکروں پر اڑتی ہوئی قلب پر آ جمیں۔ اب سلطان بہ نفس نفیس
کرنے والا تھا اور فیلبان آنکس سنبھالے اشارہ کے منتظر تھے۔ پھر اچانک پرتھال نے
دل میں ایک درد کی لہر ابھرتی محسوس کی، اس کی پلکوں کے سائے کچھ بوجھل سے ہو

اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی کراہ تڑپ اٹھی۔ اُدھر قرنا کی آواز نے سلطان کے لشکرِ خاص کی روانگی کا پُرشکوہ اعلان کیا۔ ادھر ایک بار پھر پرتھال کی پیاسی نظریں سلطان کے آس پاس تھرتھرائیں اور ناکام لوٹ آئیں۔ سلطان کے دائیں بائیں ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک کے گھوڑے اچھل اچھل کر چل رہے تھے جس سپاہی کو بس ایک نظر دیکھنے کی خاطر وہ اتنی دیر سے جھروکہ میں کھڑی تھی۔ وہی کہیں دکھائی نہ دے سکا تھا پرتھال نے مایوسی اور تشویش کے بوجھ سے دبی اور تھکی ہوئی نگاہیں وکیلِ سلطنت، صدر جہاں امیر فضل اللہ شیرازی کے لشکروں پر پھیلا دیں۔ مگر افسوس اُس کا محبوب سپاہی یہاں بھی نہیں تھا۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر جو ابھی تک سرخ بندیا سے محروم تھی غم کی ایک نئی لکیر ابھری...... غم فراق...... اور ہجر یار کی لکیر......

ہاں اس نے اپنے محبوب سپاہی..... اپنے دل کے راجہ، اپنے من مندر کے دیوتا شہزادہ حسن خاں ہی کو دیکھنے کے لئے اتنی دیر تک کھڑا رہنے کی مشقت برداشت کی تھی۔ جو دیوراے کا سر قلم کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں جا رہا تھا اور میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے ہر عورت اپنے محبوب کو جی بھر کے دیکھنا اور اُسے اپنی بھیگی پلکوں کے سائے میں روانہ کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا محبوب کہیں بے رحم سورج کی تمازت میں جھلستا نہ رہے۔ اس پر زلفوں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کا رہنا ضروری ہے پرتھال نے ایک ایک لشکر، ایک ایک دستہ کو دیکھ ڈالا۔ سب کلغی دار طرے اور عمامے اس کی نگاہوں کے دائرے میں تھرتھرائے، وہ تمام فولادی ٹوپیاں جن پر امتیازی نشان چمک رہے تھے، اس کی نظروں میں گھوم گھوم گئیں مگر جس کلاہ کی تلاش تھی۔ وہی نظر نہ آئی۔ چتر اور سراپردہ تو بس سلطان اور اُس کے شیر دل بھائی امیر الامراء احمد خاں خانخاناں کے سوا اور کسی بھی جگہ نظر نہ آئے۔ تو ولی عہد کہاں چلا گیا؟

پھر کھڑے کھڑے (حالانکہ اب کھڑے رہنا اس کے لئے دوبھر تھا) اس کے ذہن میں کئی اندیشوں نے سر ابھارا اور وہ سوچنے لگی۔

"ان کا لشکر تو یہاں سے میلوں دور دریائے تنگ بھدرا کے اُس پار بجے نگر کی دھرتی پہ خیمہ زن ہے پھر وہ آج سپاہ کے ہمراہ کس طرح کوچ کرتے۔ وہ میری خاطر تنہا آئے تھے..... تنہا ہی لوٹ گئے ہوں گے۔"

کبھی وہ سوچتی......

"سلطان عالی کی پیشوائی کے لئے انہیں پہلے ہی یہاں سے روانہ ہونا چاہیے تھا تا کہ جب سلطان دریائے تنگ بھدرا کو عبور کر کے بیجے نگر میں اتریں تو ولی عہد ان کا سواگت کر سکیں۔"

ولی عہد کی واپسی کی یہ وجہ کافی معقول تھی مگر پرتھال کو صدمہ اس بات کا تھا۔ شہزادہ جاتے ہوئے اسے مل کر کیوں نہیں گیا حالانکہ دربار میں اُس نے سن لیا تھا۔ سلطان نے اُسے اپنی چچی بیگم جہاں کا مہمان بنایا ہے وہ جانے سے قبل چند لمحوں کے لئے قصر لالہ تک تو آ ہی سکتا تھا۔

لیکن وہ نہیں آیا......

"وہ کیوں نہیں آئے...... کیوں نہیں آئے...... کیوں نہیں آئے؟"

پرتھال کو محسوس ہوا جیسے احساس کی شدت اور غم ہجر کی وحشت سے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ سرخ دوپٹہ جو ابھی تک کچھ دیر پہلے بیگم جہاں نے اُسے دیا تھا۔ اپنے شانوں پر لہراتی ہوئی وہ جھروکہ سے ہٹ آئی۔ اس وقت شاید صدر جہاں کا لشکر کوچ کر رہا تھا۔ لیکن اسے اب فوج کی روانگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی پردے کے پیچھے اسے دوسرے جھروکہ سے باتوں کی آواز سنائی دی پھر کسی عورت کی زبان سے اپنا ذکر سن کر وہ وہیں ٹھٹک گئی اور اس کے سینہ کے اندر دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بھلا وہ کسی گفتگو کا موضوع کیوں بن گئی؟ وہ بھی جاننا چاہتی تھی۔ اُسے جلدی معلوم ہو گیا۔ دوسرے جھروکہ میں بیگم جہاں ولی عہد کی ماں بیگم عالیہ سے مصروف گفتگو ہے۔

بیگم جہاں نے اس کی وکالت کی تھی اور یہ ایک نیک شگون ہی تھا کم از کم بیگم جہاں تو اس کی حامی ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا وہ بیگ کی زبانی محلسرا کی سازشوں کا حال سن چکی تھی۔

پھر نہ جانے وہ کس خیال کے تحت اچانک پردہ کے پاس سے ہٹ آئی اور سرخ دوپٹہ اپنی پشت پر لہراتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ بیگم عالیہ نے جب پردہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ تو یہی "سرخ لکیر" اس کی حیرت کی وجہ بن گئی تھی۔

رُخصت

کمرے سے نکل کر پرتھال ہولے ہولے مہندی کی باڑھ کی طرف چلنے لگی یہ باڑھ قصرِ لالہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور اس سے کچھ ہی فاصلہ پر سنگِ مرمر کی ایک بڑی ہی خوبصورت بارہ دری بنی ہوئی تھی جس کے ہشت پہلو ستون، ہلالی محرابیں اور جالی دار غرفے ہر دیکھنے والے کا دل کھینچ لیتے تھے اس بارہ دری میں کھڑے ہو کر فیروز آباد کا نظارہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ بارہ دری کافی بلندی پر واقع تھی۔ پرتھال کے قدم خود بخود اس طرف اٹھتے چلے گئے لیکن ابھی وہ دس بارہ قدم ہی چلی ہو گی کہ اس کے عقب میں ایک عجیب سی سرسراہٹ سنائی دی وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی پھر جب اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس کے پیچھے شہزادہ حسن کھڑا اُسے محبت آفریں نظروں سے گھور رہا تھا۔

"جانِ عالم......" پرتھال کے ہونٹ تھرتھرائے پھر وہ بازو کھول کر تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکی جیسے اس سے بغل گیر ہو جانا چاہتی ہو۔

شہزادہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور مسکرا کر بولا۔

"یہ خلوت نہیں ہے یہاں اس قسم کی غلطی سے اجتناب ہی بہتر ہے محل کی دیواریں صرف کان ہی نہیں آنکھیں بھی رکھتی ہیں۔"

پرتھال جہاں تھی۔ وہیں رُک گئی اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"میں سمجھی تھی آپ واپس بجے نگر چلے گئے ہیں۔"

"تم سے ملے بغیر؟"

شہزادہ نے یہ فقرہ کچھ اس تعجب خیز لہجہ میں ادا کیا جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اُس نے ایسا سوچا ہی کیوں کہ وہ اس سے ملے بغیر واپس چلا جائے گا۔ وہ حیران سی رہ گئی حسن نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میں تمہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔"

"کس بات کی...... کیا محل سرا میں آ گئی ہوں یا اس کے لیے کہ سلطان نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا ہے؟"

"اس خوشی پر تو تمہیں فخر کرنا اور اشرفیوں کے توڑے بانٹنا چاہئیں۔" شہزادہ کہنے لگا
"سلطان معظم کی بیٹی بن جانا کوئی کم اعزاز نہیں لیکن میں تو اس بات پر مبارکباد کہنے آیا
ہوں۔ تم نے دربار میں بڑے سلیقہ سے گفتگو کی تھی۔ بڑے بڑے امراء بھی تمہیں رشک
سے دیکھ رہے تھے شاید ان میں کوئی بھی سلطان کے ساتھ اس بے خوفی سے ہمکلام ہونے
کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ تو صرف خوشامد اور چاپلوسی کرنا جانتے ہیں سوائے امیر شیرازی کے۔"

"لیکن میں نے کوئی گستاخی تو نہیں کی تھی؟"

"صرف ایک مرتبہ!"

پرتھال سناٹے میں آ گئی۔ شہزادہ کہہ رہا تھا۔

"شاید رونق بیگ تمہیں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ بہتی بہادروں کو بزدلی کا طعنہ دینا گو
سلطان معظم کی ذات پر حملہ کرنا تھا وہ فوج کے خلاف اس قسم کی طعن آمیز باتیں سننے کے
عادی نہیں۔"

"بیگ نے مجھے یہ بات بھی بتا دی تھی۔"

"اور اس کے باوجود.....؟"

"ہاں میں دیکھنا چاہتی تھی۔ سلطان پر میری باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر میں ایسا
کرتی تو شاید مجھے یہ عزت اور قربت نصیب نہ ہوتی۔"

شہزادہ ایک ثانیہ اُسے حیرت سے گھورتا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ بارہ دری کی طرف
چلنے لگا۔ اس نے پرتھال کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ محل کے اس حصہ میں کوئی بھی کنیز، غلام یا خوا
سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ سب ابھی تک قلعہ کی فصیل ہی پر کھڑے فوج کی روانگی
تبصرہ کر رہے تھے ورنہ اس وقت کئی نگاہیں اِدھر اُدھر جھانک چکی ہوتیں۔ شہزادہ بارہ دری
سیڑھیوں پر رُک گیا تھا۔ اُس نے چبوترے کے پاس پہنچ کر ایک ہشت پہلو ستون کو تھام
اور پرتھال کی طرف پلٹ کر بولا۔

"سب لشکر روانہ ہو چکے ہیں۔ یہ شام سے پہلے ہی دریا پر پہنچ جائیں گے اور سلط
کی پیشوائی کے لئے مجھے بھی جلد سے جلد اپنے جنگی پڑاؤ پر پہنچنا ہے میرا گھوڑا کافی تیز
اور صرف پانچ سوار میرے ہمراہ ہیں یقیناً ہم شام سے پہلے ہی منزل کو جا لیں گے۔"

پرتھال حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے شہزادہ واقعی

اسی کی خاطر رُک گیا تھا حالانکہ اس وقت اُسے فیروز آباد سے کئی کوس دور ہونا چاہیے تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔

"میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے میرے گھوڑے کو کافی محنت کرنا پڑے گی، لیکن میں تمہیں دیکھے بغیر کیسے چلا جاتا۔"

"جانِ عالم! آپ کو میرا اتنا خیال ہے؟"

"چند باتیں بتانے کے لئے مجھے رکنا پڑا۔" اُس نے کہا۔ "اس بات کا خیال رہے کہ تم کوئی عام لڑکی نہیں جو چند روز کسی محلسرا میں مہمان بنائی جاتی ہے۔ سلطان معظم تمہیں اپنی بیٹی کا اعزاز دے چکے ہیں اب تمہاری حیثیت پہلے سے بہت مختلف ہے اور تمہیں اس حیثیت کے مطابق ہی محلسرا کی عورتوں سے گفتگو کرنا ہوگی۔"

"میں سمجھتی ہوں جانِ عالم!"

"بیگم جہاں پر تم ہر قسم کا اعتماد کر سکتی ہو۔ میری کوئی بات اُن سے چھپی نہیں رہتی رونق بیگ کی طرح وہ بھی جانتی ہیں کہ میرا تمہارا تعلق کیا ہے۔"

"جانِ عالم!" پرتھال تعجب سے چیخ اٹھی۔

"گھبراؤ نہیں، وہ تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گی پھر اب تو سلطان نے تمہیں بطور امانت بیگم جہاں کے سپرد کیا ہے۔"

پرتھال کی نگاہیں کہہ رہی تھیں "لیکن آپ کے بغیر تو میں پھر بھی تنہا رہوں گی۔"

"اور آخری بات......"

شہزادہ اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "میں نے تمہیں ایک انگشتری بھی دی تھی۔"

پرتھال نے مسکرا کر اپنی چولی میں ہاتھ ڈالا اور ہیرے کی انگشتری اس کی ہتھیلی پر جگمگا رہی تھی۔

"میں نے اسے بحفاظت چھپا رکھا ہے۔"

"نہیں، اب اسے چھپانے کی ضرورت نہیں۔" شہزادے نے کہا۔ "یہاں تم اسے ہاتھ میں بھی پہن سکتی ہو۔ یہ معمولی انگشتری نہیں۔ محلسرا کی کنیزیں اور خواجہ سرا اس کو دیکھ کر تمہاری ہر فرمائش پوری کر دیں گے۔"

"کیا یہ کوئی جادو کی انگشتری ہے؟" پرتھال کے لبوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"ہاں اس کے ہیرے میں ایک دیو بند ہے۔" وہ بھی ہنسنے لگا۔

"یہ دیو تمہیں ہر خطرے سے محفوظ رکھے گا۔ یہ شاہی انگشتری ہے جو سلطان معظم کے بعد صرف ولی عہد کے پاس رہ سکتی ہے۔ اب تو تم نے اس کی طاقت کا اندازہ کر لیا ہوگا۔"

پرتھال نے حیرت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ تو شہزادے کو مجھ پر اتنا اعتماد ہے اس نے اپنی شاہی انگشتری مجھے دے رکھی ہے اس احساس نے اس کے دل کو پگھلا ہی تو دیا۔

"یہ تم اچانک خاموش کیوں ہو گئیں۔ کیا ماں باپ کی یاد تو نہیں ستا رہی؟"

"نہیں جانِ عالم! میں اپنی خوش بختی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" پرتھال نے جواب دیا۔

"کل تک میں ایک غریب سنار کی لڑکی تھی اور ہماری زندگی دوسروں کے رحم و کرم پر تھی۔ مگر آج...... آج میں سلطان دکن کی بیٹی ہوں اور بے شمار زندگیاں صرف میرے رحم و کرم پر ہیں۔ میں کس قدر بھاگوان ہوں۔ کتنی خوش قسمت، میری تقدیر کے......"

پرتھال فقرہ بھی مکمل نہیں کر پائی تھی کہ شہزادہ نے اس کی بات کاٹی۔

"یہ مت بھولو! تقدیر کبھی کبھی بادشاہوں کو بھی دھوکہ دے جایا کرتی ہے۔"

"آپ...... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں میں نے ٹھیک کہا ہے۔ تقدیر کی ڈور سنبھالنے کے لیے تدبیر سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ ذرا سی غفلت زنجیر بن کر پاؤں سے لپٹ جاتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں جانِ عالم!"

"آج میں تمہیں ایک ایسی بات بتا رہا ہوں جو رونق بیگ بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ محلسراؤں کا وہ راز جو ان اونچی اونچی دیواروں سے باہر نہیں نکل سکتا اور تقدیر کے کھیل کی طرح پانسے بدلتا رہتا ہے۔"

پرتھال ہمہ تن گوش تھی۔ شہزادہ کہنے لگا۔

"بیگم شیرازی میرے خون کی پیاسی ہے اگر اس کے کانوں میں ہماری محبت کی بھنک پڑ گئی تو وہ تمہاری بھی جان کی دشمن بن جائے گی اور کیا معلوم میری عدم موجودگی میں تمہیں نقصان پہنچانے سے بھی باز نہ آئے لیکن وہ زریں کے بغیر ایک بے جان لاش کے سوا کچھ

نہیں۔ تمہیں اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔"

پرتھال نے حیرت پاش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی، یہ زریں آخر کیا قیامت ہے جس سے ولی عہد بھی خوفزدہ ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بیگم جہاں نے بھی اُسے زریں کی طرف سے خبردار رہنے کی تلقین کی تھی۔ آخر وہ ایک خواجہ سرا ہی تو ہے لیکن محل میں ہر کوئی اس کے خوف سے لرزہ براندام تھا وہ بیگم عالیہ اور بیگم جہاں کی گفتگو میں بھی اُس کا ذکر سن چکی تھی اور اب...... اب سلطان کے بعد دکن کا سب سے باعزت، سب سے بااختیار شہزادہ حسن بھی اُسے زریں کے خطرہ سے آگاہ کر رہا تھا اس کا مطلب ہوا کہ اس کے اختیارات ناقابل یقین حد تک وسیع ہیں۔ جس کے خوف سے بیگمات بھی کانپتی ہیں جس کی دہشت در و دیوار پر طاری ہے جس کے ذکر پہ ولی عہد کی آنکھوں میں بھی خطرے کی ایک لکیر سی چمکنے لگتی تھی۔ تو کیا بھنی محلسراؤں میں خواجہ سرا حکومت کرتے ہیں؟ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ تعجب سے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ایک لمحہ خاموش رہ کر ولی عہد نے پوچھا۔

"تم کیا سوچنے لگیں؟"

"کچھ نہیں جانِ عالم! میں زریں کی تعریف پہلے بھی سن چکی ہوں۔"

"سن چکی ہو تو پھر اُسے منہ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"میں تو سوچتی ہوں یہاں رہ کر میں کچھ آرام کر سکوں گی۔ ماضی کے ان بھیانک سایوں کو بھولنے کی کوشش کروں گی۔ جو موت کی طرح میرا تعاقب کرتے رہے لیکن یہاں تو میں قدم قدم پر خطرے کی بو سونگھ رہی ہوں۔ یہ کیسی زندگی ہے یہ کیسا جینا ہے۔ اب تو مجھے ان اونچی اونچی دیواروں سے خوف آنے لگا ہے یہ گونگے اور بہرے ستون موت کے دیوتاؤں کی طرح سرد اور خاموش ہیں۔ یہاں پردوں کی اوٹ میں بھیانک سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ جیسے موت بھنبھنا رہی ہو۔ یہاں کی فضا میں میرا دم گھٹ جائے گا جانِ عالم مجھے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے چلیے میں ان محلوں میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

پھر وہ ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح سہم کر جیسے اُس نے موت کی جھلک دیکھ لی ہو، ولی عہد کے ساتھ لگ گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "پیار محلوں میں نہیں...... ویرانوں میں پلتا ہے جانِ عالم! مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے یہ اونچی اونچی بے رحم دیواریں میری محبت کا

گلا گھونٹ دیں گی میں یہاں نہیں رہوں گی۔ نہیں رہوں گی۔"

"ہوش میں آؤ پرتھال۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جان عالم! تقدیر بادشاہوں کو بھی دھوکہ دے جایا کرتی ہے شاید قسمت مجھے بھی فریب دے کر یہاں لے آئی ہے لیکن اب میں ان محلوں میں نہیں رہنا چاہتی جہاں بیگمات اور شہزادے ایک خواجہ سرا سے خوفزدہ ہیں۔ جہاں وجود اپنے سائے سے ڈرتے ہیں جہاں زریں......"

اچانک ولی عہد کے ایک بھیانک اور خوفناک قہقہہ نے پرتھال کی بات کاٹ دی اور وہ متحیر اور ششدر شہزادہ کو دیکھنے لگی جو ہنس رہا تھا لیکن اس کی بھیانک ہنسی میں موت کے گھنگھرو چھنچھنا رہے تھے۔ پھر اس نے حقارت سے کہا۔

"یعنی شہزادے ایک خواجہ سرا سے ڈریں گے؟ اوں ہوں...... وہ موت سے بھی نہیں ڈرتے۔ کل تم دیکھ لوگی۔ اس مردود زریں کی لاش کتے نوچ رہے ہوں گے۔"

پرتھال نے دیکھا۔ ولی عہد کے چہرے اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں وہ سخت برافروختہ نظر آرہا تھا۔ جیسے زریں اگر مل جائے تو ابھی اس کا سر قلم کر دے گا۔

اچانک وہ جانے کے لیے مڑا تو چند قدم کے فاصلہ پر کسی کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا۔

وہ ایک خواجہ سرا تھا جس نے شہزادیوں کی سی پوشاک پہن رکھی تھی۔ سر پر ایک خاص نشان اُسے عام خواجہ سراؤں سے ممتاز کرتا تھا کمر میں سونے کی تاروں سے کشیدہ ایک سنہری پٹی تھی جس میں ایک ہاتھ لمبا خنجر لٹک رہا تھا۔ پٹی کا پھندنا کمر پر جھول رہا تھا اس کے چہرہ کے نقش و نگار اس کے حسین ہونے کی شہادت دے رہے تھے مگر اس وقت وہ چہرہ خوف کی وجہ سے زرد ہو گیا تھا جیسے کسی نے اس کا خون چوس لیا ہو اس کے بدن پر ایک لرزش تھی۔ سر سے پاؤں تک ایک عجیب سی کپکپاہٹ، جس میں موت کا خوف نمایاں تھا۔

پرتھال اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اچانک اس نے ولی عہد کی گرجتی ہوئی آواز سنی۔

"زریں......"

جیسے اچانک پاؤں پر بچھو کاٹ لیتا ہے زریں کا نام سنتے ہی پرتھال اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی پھر اس کی نگاہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

خوف و دہشت سے کھجور کی شاخ کی مانند کانپتا اور تھرتھراتا ہوا ایک جسم شہزادہ حسن کے

قدموں پر ڈھیر ہو چکا تھا اور ایک لرزتی ہوئی آواز رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔
"رحم...... جانِ عالم...... مجھ پر رحم کیجیے...... میں بے قصور ہوں...... میری جان بخشی فرمایئے شہزادہ عالی! میری موت کا حکم واپس لے لیجیے۔ میری جان آپ پر فدا ہو میں بالکل بے گناہ ہوں...... مجھ پر رحم فرمایئے۔"
پرتھال نے دیکھا زریں نے دونوں ہاتھوں سے ولی عہد کے پاؤں تھام رکھے تھے اور اس کا سر پاؤں کو چھو رہا تھا۔ اس کی گلوگیر آواز بدستور گونج رہی تھی۔
"پرتھال کے صدقے مجھے بخش دیجیے جانِ عالم! مجھے بخش دیجیے۔ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔"
"کھڑی ہو جاؤ۔" شہزادہ نے رعب دار آواز میں حکم دیا اور زریں پاؤں چھوڑ کر کانپتی اور تھرتھراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کے آنسوؤں کی دھار رخساروں پر بہہ رہی تھی اور آنکھوں میں ابھی تک موت کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔
"کیا جانِ عالم نے میری موت کا حکم واپس لے لیا؟"
"تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو؟"
اور زریں کا چہرہ پھر ایک مرتبہ زرد ہو گیا۔
"لیکن...... ہم تمہیں مہلت دیں گے۔"
حسن کی زبان سے یہ الفاظ سن کر زریں کی جان میں جان آئی۔ وہ منمنانے لگی۔
"آپ جو چاہیں گے وہی ہوگا۔ آپ آئندہ مجھے وفادار پائیں گے۔"
"خوشامد کرنے میں تمہاری زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔" شہزادہ کہنے لگا۔ "لیکن یہ زبان کاٹی بھی جا سکتی ہے۔ تمہیں فیروز کا انجام یاد رکھنا چاہیے۔"
نجانے کیا بات تھی۔ فیروز کے انجام کا ذکر سنتے ہی زریں کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ حسن نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اچانک بولا۔
"پرتھال...... بیگم جہاں کے محل میں رہے گی۔"
"میں سن چکی ہوں جانِ عالم۔"
"اس بات کا دھیان رہے پرتھال ہماری امانت ہے۔"
زریں نے سر جھکا دیا۔ "آپ مطمئن رہیے گرم ہوا بھی ان کے بدن کو نہیں چھو سکے گی۔"

"اب تم جا سکتی ہو۔"

زریں اُلٹے قدموں چلتی ہوئی کچھ دور چل کر پلٹی اور آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی پھر وہ ایک عمارت کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔

حسن نے پلٹ کر پرتھال کی طرف دیکھا جو حیران و ششدر کھڑی تھی۔ زریں کا سحر اس کی آنکھوں کے سامنے ٹوٹ چکا تھا اور یہ اچھا ہی تھا ورنہ نجانے وہ اُسے کیا سمجھتی رہتی۔

"تم نے دیکھا وہ ایک کتیا کی طرح میرے پاؤں پر سر رکھے روتی رہی ہے اور مجھے امید ہے اب وہ تم سے الجھنے کی کوشش نہیں کرے گی، پھر بھی تمہیں محتاط ہی رہنا چاہیے وہ سلطانِ معظم کی مقرب ہے بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا صلہ ساری عمر بھگتنا پڑتا ہے۔ زریں نے ایک مرتبہ ظلِ سبحانی کی جان بچائی تھی۔ خیر تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ بہر حال وہ ایک خواجہ سرا ہے اور تم......"

"اور اسی لئے آپ نے اسے آگ دکھا کر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وہ جلتی اور سلگتی رہے۔"

"لیکن وہ پاگل نہیں۔ ایک ولی عہد کے اختیارات کو خوب سمجھتی ہے۔"

یہ کہہ کر حسن نے سورج کی طرف دیکھا جو فیروز آباد کے مغربی درختوں پر چمک رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"سورج ڈھل چکا اور مجھے شام سے پہلے دریائے تک بھدرا کو عبور کرنا ہے اچھا تو اب رخصت! دیورائے سے نپٹ کر میں جلد لوٹ آؤں گا۔"

"لیکن مجھے آپ کی خیریت کی خبر تو ملتی رہے گی نا؟"

پرتھال نے تشویش انگیز لہجے میں پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میری آنکھیں اسی محل کا طواف کرتی رہیں گی۔ خدا حافظ!"

"خدا حافظ! بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔"

"پھر پرتھال نے اُسے ایک دیوار کی اوٹ میں غائب ہوتے دیکھا اور وہ دل پکڑ کر آہستہ آہستہ قصر کی طرف چلنے لگی۔

حسین ناگن

جونہی پرتھال کمرے میں داخل ہوئی۔ بیگم جہاں کی آواز اس کے کانوں میں گونجی

لگی۔ ''اے لڑکی! تم کہاں چلی گئی تھیں، میں تو فکر مند ہو گئی۔ دیکھو! یہ کنیزیں تمہیں سب کمروں میں ڈھونڈ آئی ہیں۔''

پرتھال نے باہر برآمدے میں نظر ڈالی تو آٹھ کنیزیں سینوں پہ ہاتھ باندھے خاموش کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں کے اثرات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی مالکہ کی طبیعت کو خوب سمجھتی ہیں اور اس کے معمولی سے دکھ کے لئے کافی پریشان ہو جانے والی ہیں۔ شاید مشرق کا یہی وہ جذبہ وفاداری تھا۔ جس نے عورت کو تقدس کا درجہ دے دیا تھا۔

بیگم یہاں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی تو پرتھال نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیا اس محل میں کہیں کھو جانے کا اندیشہ بھی ہے؟''

بیگم جہاں نے تعجب انگیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ خوب سمجھتی تھی۔ پرتھال نے یہ سوال کیوں کیا ہے آخر یہ محل تھا۔ جنگل تو نہیں۔ جہاں کسی کے کھو جانے کا خطرہ ہوتا اور اس کے لئے یوں پریشانی کا اظہار کیا جاتا مگر پرتھال کو کیا معلوم بیگم اس کے لئے کیوں پریشان نظر آتی تھی۔

''بیگم جہاں کے محل میں پرندے بھی اس کی اجازت کے بغیر پر نہیں مار سکتے۔ سمجھیں؟ مگر جب تک تمہیں محل کی کنیزوں اور خادماؤں سے واقفیت نہ ہو جائے تمہارا زیادہ دور تک جانا مناسب نہیں۔''

''مگر میں زیادہ دور تو نہیں گئی بس بارہ دری پہ تھی۔''

''اوہو...... ابھی کچھ دیر پہلے میں نے زریں کو بھی اُدھر جاتے دیکھا تھا۔ کہیں اس نے کوئی گستاخی تو نہیں کی؟ وہ نری آفت کی پرکالہ ہے۔''

''نہیں بیگم حضور! بھلا اُسے مجھ سے کیا بیر ہو سکتا ہے۔''

''تم نہیں سمجھتیں بانو! اس کی رگ رگ میں شطینت کروٹیں لیتی ہے مگر اس مردود کے ذکر پر لعنت بھیجو۔ آؤ ان کنیزوں سے مل لو یہ تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گی۔''

پھر بیگم جہاں اُس کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں لے آئی۔ انہیں دیکھتے ہی کنیزیں جھک گئیں۔

''میرے ہاں کوئی خواجہ سرا نہیں۔ میں اُن کتوں سے نفرت کرتی ہوں انہیں لگائی بجھائی کے سوا کوئی کام نہیں۔ یہ کنیزیں میری وفادار ہیں۔ میں بھی ان پر اعتبار کرتی ہوں۔''

پھر اس نے کنیزوں کی طرف انگلی اٹھا کر باری باری ہر ایک کا نام پکارا۔

"گل رخ، سوسن، مشتری، زہرہ، نورانی، زرینہ، گلنار اور اس کا نام ہے انار بالا۔"

بیگم جہاں آٹھویں کنیز کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

"انار بالا؟" پرتھال کے لہجے میں تعجب تھا۔

"ہاں...... یہ تلنگانہ سے آئی ہے۔ ہندو ہے اور بہترین رقص جانتی ہے۔ سلطان جب بھی کبھار میرے یہاں تشریف لاتے ہیں تو انار بالا کا ناچ بھی دیکھتے ہیں۔"

پھر وہ یکلخت پرتھال کی طرف پلٹی اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"انار بالا! آج سے میں نے تمہیں بخش دی۔ یہ تمہارا دل بہلائے گی۔"

"شکریہ بیگم حضور! آپ مجھ پر بڑی کرم فرمائی کر رہی ہیں۔"

انار بالا کے ہونٹوں پر بھی ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ مالکہ کا فیصلہ سن کر اسے خوشی ہوئی ہے۔

محلات میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ سلطان معظم نے پرتھال کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے اور بیگمات سے لے کر کنیزوں تک ہر عورت کے دل میں رشک و حسد کے جذبات ابھر آئے تھے، وہ پرتھال کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھیں۔ یقیناً وہ لڑکی...... عجیب الہیئت ہوگی، جو خنجر کی زبان سے گفتگو کرتی ہے۔

محلات میں دعوتوں کا عام رواج تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی امیر یا خان کی طرف سے دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں بیگمات اور شہزادیوں کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ ان دعوتوں کا مقصد قربِ سلطانی حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا اور اگر تھا تو صرف اتنا کہ اونچی اونچی فصیلوں اور دیواروں میں گھری ہوئی زندگی کی یکسانی اور تنہائی کا سناٹا توڑ دیا جائے اور معزز خواتین اس بہانے میل ملاپ کی لذت اٹھا سکیں۔ شاہی خاندان کے افراد ان دعوتوں میں شریک ہوتے، تو ان کی بہار دیدنی ہوتی تھی۔ نہ صرف شاہی بیگمات، امراء اور وزراء کی بیویاں اور خانزادیاں ہی زرق برق لباس پہن کر نکلتی تھیں بلکہ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی پوشاکیں بھی فانوسوں اور قندیلوں کی روشنی میں جگمگ جگمگ کرنے لگتی تھیں جیسے آسمان پر ننھے منے ستارے یا کسی جھیل کے کنارے ان گنت جگنو جھلملا رہے ہوں۔ ہر بیگم اور امیر زادی کی یہی کوشش ہوتی تھی۔ لباس کے اعتبار سے نہ صرف وہ خود سب خواتین

میں ممتاز و منفرد نظر آئے بلکہ اس کی کنیزیں اور خادمائیں بھی دوسری خدمت گزار عورتوں پر سبقت لے جائیں تا کہ وہ سلطانِ عالی سے اپنی نفاست پسندی اور خوش ذوقی کی داد لے سکے اور بیگمات کے جھرمٹ میں اس کا وقار بلند رہے۔

بعض اوقات شاہی مہمانوں کے اعزاز و احترام میں بھی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ لیکن یہ تمام دلچسپیاں، رونقیں اور بہار آفرینیاں دارالسلطنت گلبرگہ کے لئے مخصوص تھیں جہاں اگر ہر شب نہیں تو ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا رہتا تھا۔

فیروز آباد سلطان کا سرحدی دارالحکومت تھا اُس نے وجیانگر پر حملہ کے لئے اسی شہر کو اپنا فوجی مستقر قرار دیا تھا۔ جنگ نہ جانے کب تک جاری رہے اس لئے بیگمات اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد بھی فیروز آباد ہی میں نقل مکانی کر آئے تھے جو گلبرگہ کی بہ نسبت وجیانگر کی سرحدوں سے زیادہ قریب تھا ان کے ساتھ بعض امیروں اور خواتین کے گھرانے بھی جو ہر حال میں شاہی خاندان کے ساتھ رہنا باعثِ شرف و عزت سمجھتے تھے۔ فیروز آباد منتقل ہو گئے تھے۔

دیورائے نے سرحدی لوٹ مار کو ایک مشغلہ بنا لیا تھا اور خود احسن کے کھلیان میں جنگ کی چنگاریاں پھینکی تھیں لیکن سلطان اب تک خاموش تھا، پر تھال اچانک ہی تاریخ کے صفحہ پر اُبھری تھی اور سلطان نے وجیانگر پر فوج کشی کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے اپنے فوجی مستقر سے جس شان و شوکت اور دبدبہ کے ساتھ کوچ کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ کسی چھوٹی موٹی سرحدی جھڑپ پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ ایک فیصلہ کن جنگ کا ارادہ رکھتا ہے اور فیصلہ کن جنگیں ہمیشہ موت کے ساحلوں پر لڑی جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی، سلطانی لشکروں کی روانگی کے بعد فیروز آباد کے شاہی محلات، کوشک سراؤں اور خواتین کی حویلیوں پر الم انگیز اور پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔

گلبرگہ میں آئے دن کسی نہ کسی دعوت کے سامان ہوتے رہتے تھے لیکن یہاں پہنچ کر ایک عجیب سی افسردگی طاری تھی۔ کسی کو تفریح کا خیال ہی نہیں آیا تھا صبح و شام، وقت کا ہر لمحہ جنگی تیاریوں، لڑائی کے نقشوں اور مشوروں کی گفتگو میں گزر گیا تھا اور اب شاید عورتیں اپنے شوہروں اور بھائیوں کے لئے اداس ہو گئی تھیں جو سلطان کے ہمراہ گئے تھے اگرچہ بہتی عورتیں لڑائی کے نام سے غمزدہ تو نہیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن فوج کی روانگی کے بعد

فیروز آباد پُراسرار خاموشی میں ڈوب گیا تھا۔

دو روز اسی اداسی اور خاموشی میں گزر گئے۔ پرتھال ان دو دنوں میں قصر لالہ سے باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ تو بس سوتے جاگتے سپنے دیکھتی تھی۔ اس کا دھیان ہر وقت وجیانگر کی طرف لگا رہتا تھا۔ سرحد کے اس پار سے اس کے سوا اور کوئی خبر نہیں آئی تھی کہ سلطان کے لشکر دریا عبور کر کے بیجاپور کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں اور ابھی تک دیورائے کی فوجوں سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔

وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھی انار بالا سے گلبرگہ کے محلات کی دلچسپ کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ اگر طبیعت بے چین ہو جاتی تو جھروکہ میں آ بیٹھتی اور اس کی نگاہیں بھورہ ندی کے اس پار مدگل کی لٹی پٹی بستیوں اور بے آب و گیاہ خشک پہاڑیوں پر پھیلتی ہوئی جنوبی افق پر جم کے رہ جاتیں جہاں دکن اور وجیانگر کی سرحدیں ملتی تھیں جہاں زمین اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے تھے اور ان کے درمیان خون کی ایک لکیر سی کانپتی تھی۔

جھروکہ سے اٹھ کر وہ کبھی کبھی بارہ دری کی طرف نکل جاتی اس کے ہشت پہلو ستونوں کے ساتھ لگ کر کچھ سوچتی پھر مہندی کی باڑھ پھلانگ کر پائیں باغ میں چلی جاتی اور ناشپاتیوں اور سنگتروں کے پودوں کے سایوں میں گھوم پھر کر واپس آ جاتی۔

اس دن کے بعد زریں اُسے پھر نظر نہیں آئی تھی حالانکہ انار بالا کی زبانی وہ سن چکی تھی کہ وہ شیطان کی خالہ دن میں ایک نہ ایک مرتبہ قصر لالہ کا چکر ضرور لگاتی تھی لیکن اس کی اچانک غیر حاضری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ انار بالا کا خیال تھا وہ یقیناً بیمار ہو گی پرتھال نے زریں کی بے عزتی کے واقعہ کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس لئے دوسری کنیزیں بھی اس کی غیر حاضری کو بیماری پر ہی محمول کر رہی تھیں۔

تیسرے روز جب قندیلیں روشن ہو چکی تھیں زریں اچانک قصر لالہ میں دکھائی دی وہ بیگم جہاں کے نام اپنی چہیتی مالکہ شیرازی کا کوئی پیغام لے کر آئی تھی لیکن خلاف معمول بڑی افسردہ اور بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھی اور متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے پرتھال کی تلاش تھی۔

بیگم جہاں، زریں سے پیغام سنتے ہی برافروختہ ہو گئی اس نے غصہ میں تھرتھراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی کہ ان اضطراب گیر ایام میں کوئی بیگم تفریح کا تصور بھی کر سکے۔ ہرگز نہیں۔ شیرازی سے کہو وہ کچھ چین سے بیٹھ جائے بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ ابھی وجیا نگر سے کوئی خبر نہیں آئی اور ہم قبل از وقت ہی عیش و مسرت کی محفلیں منعقد کرنے لگیں ہرگز نہیں۔ کیا معلوم کس کا لہو زمین کو سیراب کرتا ہے لیکن خون بہے گا ضرور۔ وجے نگر کی زمین میری آنکھوں کے سامنے انسانوں کا خون چاٹ رہی ہے اور بیگم شیرازی کو دعوتوں کا خیال پریشان کر رہا ہے، استغفر اللہ خدا معاف کرے۔ جاؤ زریں! اپنی مالکہ سے کہو جب تک بدبخت دیورائے اپنے گناہ کی سزا نہیں بھگت لیتا۔ اس وقت تک فیروز آباد کے محلوں میں بھی خوشی کی کوئی تقریب منعقد نہیں ہو سکتی۔

بیگم جہاں مسلسل بولتی رہی اور اس دوران میں اُس نے کئی مرتبہ زریں کی طرف قہر آلود نگاہوں سے گھورا لیکن زریں چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔

"نہیں بیگم حضور! آپ نہیں سمجھیں۔" وہ کہنے لگی۔ "بیگم شیرازی یہ دعوت پرتھال کے اعزاز میں دینا چاہتی ہیں۔"

"پرتھال؟"

بیگم جہاں بھڑک اٹھی۔ "وہ پرتھال کی کیا لگتی ہے؟ اسے کہہ دو...... اس پھول کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے کانٹوں سے الجھنا پڑے گا۔ کیا میں شیرازی کو نہیں جانتی۔"

"آپ کی نگاہ دور تک پہنچنے والی ہے۔"

"تو پھر اسے میرے فیصلہ سے آگاہ کر دو اور یہ بھی یاد دلاؤ۔ پرتھال میری حفاظت میں ہے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہے بیگم حضور!"

زریں نے قدرے جھک کر جواب دیا۔ "وہ صرف یہ چاہتی ہیں جو لڑکی ایک بہت بڑی جنگ کا باعث بنی ہے اسے روپوش نہیں روبرو رہنا چاہیے۔ محلسراؤں کی سب بیگمات اور خواتین سلطانِ معظم کی بیٹی سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں لہٰذا اس دعوت کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

"تو پرتھال سے ملاقات کرنے کے لئے بیگمات نے شیرازی کا سہارا لیا ہے؟"

"میں کیا عرض کر سکتی ہوں۔"

"اچھا" بیگم جہاں کچھ سوچنے لگی۔ "میں خود ہی دعوت کا اہتمام کر کے ان کی یہ خواہش پوری کر دوں گی۔"

"بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن میری ناچیز رائے میں بیگم شیرازی کی دعوت رد نہ کی جائے۔"

"زریں! تو بہت گستاخ ہوتی جا رہی ہے کیا تو مجھے بھی سبق پڑھانے آئی ہے؟"

"میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ میں بیگم حضور کی شان میں گستاخی کروں۔" زریں کے لہجہ میں فرمانبرداری اور اطاعت کی جھلک تھی۔ "لیکن سلطانِ معظم کی بیٹی کی عزت افزائی کرنا بیگم شیرازی کا حق ہے اس لئے......"

"تجھے باتیں بنانا خوب آتی ہیں زریں۔" بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "تو کیا میں سمجھوں میری درخواست قبول کر لی گئی ہے۔"

"جاؤ...... میں شیرازی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی لیکن کان کھول کر سن لو۔ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو آدابِ سلطانی کے خلاف ہو۔"

بیگم کی نگاہوں میں ایک خوفناک چمک تھی جس نے زریں کے جسم پر کپکپی سی طاری کر دی۔ اُس نے نہایت احترام کے ساتھ اپنا سر جھکا کر بیگم کو تعظیم دی اور بولی۔

"کوئی بد بخت ہی ایسا تصور کر سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر زریں پلٹی اور تیز تیز چل دی۔ پشت پر اس کی قبا دائرے سے بن رہی تھی۔

ایک نیم تاریک غلام گردش سے گزر کر جب وہ پرتھال کے کمرے کے پاس پہنچی تو یکلخت اُس کی رفتار مدھم پڑ گئی اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا پھر ایک جالی دار غرفہ سے اندر جھانکنے لگی۔

پرتھال ایک مسہری پر غرفہ کی طرف پشت کیئے لیٹی تھی۔ اس کے علاوہ کمرہ میں کوئی نہ تھا۔ انار بالا شاید اپنے حجرے میں آرام کر رہی تھی۔ پرتھال کے لیٹنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ سو گئی ہے۔ کمرے میں ایک قندیل کی مدھم سی روشنی تھرتھرا رہی تھی۔

زریں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک مرتبہ پھر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں پھر اُس نے اپنی قبا سے چھوٹا سا بکس نکالا اور دوسرے ہی لمحے دو بالشت کا ایک سیاہ سانپ غرفہ کے اندر رینگتا جا رہا تھا۔

زریں نے بجلی ایسی سرعت کے ساتھ بکس کو قبا میں لپیٹا اور نہایت تیزی سے تاریک راہداری کو پار کر گئی۔ بس بجلی کا ایک کوندا تھا کہ لپک کر غائب ہو گیا۔

رینگتی ہوئی موت

قصرِ لالہ آہستہ آہستہ نیند کی طلسم زا خاموشیوں میں گم ہوتا جا رہا تھا اچانک خاموشیوں کا سینہ زخمی کرتی ہوئی ایک بھیانک چیخ کی آواز ابھری۔

وحشت آلود...... لرزہ خیز...... اور جگر خراش نسوانی چیخ

شدت خوف سے کانپتی اور کسی آسیبی روح کی مانند وحشیانہ انداز میں چلاتی ہوئی ایک وحشت ناک اور درد ناک آواز جو ہولے ہولے بتدریج موت کی خونیں خرخراہٹوں میں ڈوبتی چلی گئی اور دوسرے ہی لحہ محل کی کپکپاتی فضا پر پھر مرگ آسا سناٹا طاری ہونے لگا۔

اس روح فرسا چیخ کی آواز اتنی تیزی کے ساتھ ابھری کہ غلام گردشوں جھروکوں اور سنگ خشت کی دیواروں کے جگر چیرتی ہوئی قلعہ کی فصیل سے جا ٹکرائی اور عین اسی وقت قصرِ شیرازی کی روشن خواب گاہ میں ایک نسوانی قہقہہ کانچ کی چھوٹی چھوٹی کرچیوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر گیا۔

"ہی ہی ہی ہی...... اری مردود! تو کامیاب رہی...... ناگن نے ڈنگ چلا دیا۔"

"آفریں ہے آپ کے دماغ پر بیگم حضور...... ! کیا تدبیر نکالی۔ واللہ! میرے فرشتوں کو بھی ایسی نہ سوجھتی۔"

فرطِ مسرت سے کپکپاتی ہوئی یہ آواز زریں کی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جگر خراش چیخ کی آواز سن کر اُس کی روح مسرت سے جھوم اٹھی ہے۔ وہ اپنی مالکن بیگم شیرازی کے حضور کھڑی تھی۔

"اس ناگن کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔"

بیگم شیرازی اچانک سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "یقیناً وہ اس وقت اپنی سورگ میں پہنچ چکی ہو گی۔ پھر بھی تو ٹھہر کے پتہ کر آنا۔"

"مم...... مم...... میں......؟" زریں ہکلائی۔

"تو کیا اس غریب کی لاش پر دو آنسو بھی نہیں بہائے گی؟"

"لیکن میرا جانا مناسب نہیں ہوگا۔ بجلی کو بھیج دوں گی۔ وہ دیکھ آئے گی۔"

"تیرا جانا کیوں مناسب نہیں ہوگا۔ پر ہاں تو ٹھیک کہتی ہے، بجلی ہی کو بھیج دینا۔"

پھر فوراً ہی جیسے شیرازی کو کوئی بات یاد آ گئی۔ آہستہ سے بولی۔

"لیکن دیکھ! کمبخت بجلی کو کہیں شبہ نہ ہونے پائے کہ ہمیں اس کی موت سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"توبہ کیجئے، بیگم حضور! آپ زریں کو کیا سمجھتی ہیں؟"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ جا بجلی کو ابھی بھیج دے۔ میں اُس کی موت کا حال سننے کے لئے مری جا رہی ہوں۔ میں یہیں انتظار کروں گی۔ اُسے کہنا ذرا لپک کے جائے۔ افوہ بے چاری نے دو روز بھی محلوں کا آرام نہ دیکھا۔ خیر حسن کا ایک حساب تو بیباق ہوا۔ باقی پھر سہی۔"

یہ کہہ کر شیرازی زہر آلود ہنسی کے ساتھ مسہری کی طرف پلٹی اور زریں نے دروازے کا رُخ کیا پھر وہ ایک نیم تاریک سی راہداری میں لپکتی چلی گئی۔



بھیانک چیخ نے قصرِ لالہ پہ زلزلہ سا طاری کر دیا تھا۔ صدر دروازے کا محافظ نیزہ سنبھالے تیز قدموں کے ساتھ غلام گردش میں بھاگنے لگا۔

آواز شاید موت کی منجمد خاموشی میں تحلیل ہو چکی تھی کیونکہ پھر کوئی سسکی بھی سنائی نہ دے سکی۔

بیگم جہاں کے ماتھے پر فکر کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ مشعل کی لرزاں روشنی میں اُس کی بوڑھی آنکھوں سے خطرے کی سیاہیاں جھانک رہی تھیں قصر کی سب کنیزیں جاگ اٹھی تھیں اور مشعل کی زرد روشنی میں اپنی مالکہ کے ہمراہ پرتھال کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ چیخ کی آواز اسی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔

صدر دروازے کا محافظ دوڑتے دوڑتے اچانک اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ غلام گردش کے نیم تاریک فرش پر دو بالشت کا ایک سیاہ ناگ اس سے صرف ڈیڑھ قدم کے فاصلہ پر رینگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ وہ سنگِ سرخ کے مدور ستون کے ساتھ ٹکرا گیا پھر نہایت تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ میں نیزہ لہرایا اور دوسرے ہی لمحے کالا ناگ فرش پر لوٹنے لگا۔

بیگم جہاں کنیزوں کے جلو میں چلتی پرتھال کے کمرے کے پاس پہنچ کے رُک گئی دروازے پر ایک بڑا سا سیاہ دھبہ نظر آیا پھر مشعل کی کانپتی ہوئی زرد روشنی کا ہالہ مشتری کے چہرے پر تھرتھرانے لگا جس پر موت کی زردیاں کھنڈ رہی تھیں۔

''مش......تری......'' کئی ہونٹوں سے ایک ساتھ سسکی کی آواز نکلی۔

''اسے کیا ہو گیا ہے؟''

''میں نہیں جانتی......''

کئی نگاہیں اچھل کر پرتھال کے چہرے پر بکھر گئیں۔ جو مسندلیس دہلیز کے ساتھ یوں گم صم کھڑی تھی۔ جیسے کوئی پتھر کی مورتی نصب کر دی گئی ہو پھر اُس نے سہمی سی آواز میں بتایا۔

''آج میں جلدی مسہری پر لیٹی تھی کیونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں سمجھی شاید انار بالا میرا حال پوچھنے آئی ہے پھر فوراً ہی ایک لرزہ خیز چیخ نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ میں گھبراہٹ میں اچھل کر فرش پر آ رہی مگر جب تب سنبھلی مشتری دھم سے دہلیز پر گر چکی تھی اور اس کے گلے میں خرخراہٹ کی آواز بھی ڈوبتی جا رہی تھی پھر اچانک یہ خاموش ہو گئی۔ مَیں خوف سے کانپ اٹھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں میں سفید پتلیاں مجھے بڑی خوفناک نظر آنے لگیں۔ بیگم حضور! اگر آپ نہ آ جاتیں تو نہ جانے میری کیا حالت ہوتی۔''

مشتری کا چہرہ اور جسم نہایت تیزی کے ساتھ نیلا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں پر ایک سیاہی مائل نیلگوں چھالا اُبھر آیا تھا اور یہ پاؤں بھی اچانک ہی سوج کر پھول گیا تھا۔

''سانپ کا زہر......''

اچانک جہاں دیدہ بیگم کا چہرہ خوف سے پھیل گیا اور دوسرے ہی لمحہ دروازے کا محافظ اپنے نیزے پر دو بالشت کا سیاہ ناگ لٹکائے ان کے سامنے کھڑا تھا اس نے بتایا۔ یہ ناگ اسے غلام گردش میں رینگتا نظر آیا تھا اور اس کا رُخ صدر دروازہ کی طرف تھا۔

''قصر لالہ میں کالا ناگ کہاں سے آیا؟''

بوڑھی بیگم زیر لب بڑبڑائی۔ ''اور وہ بھی پرتھال کے کمرے میں...... ہوں؟''

''کیا مشتری مر گئی......''

اس سوال کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ لاش کی ٹھنڈی کلائی پر پڑا۔ شاید وہ نبض ٹٹول رہا تھا۔ ایک لمحہ اضطراب انگیز سناٹے میں گزر گیا۔ ابھی تک کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس کی نبض دیکھے شاید وہ زندہ ہی ہو اور زہر نے اسے بے ہوش کر دیا ہو۔

اچانک محافظ اچھل پڑا۔ اس نے بیگم جہاں کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے شاہ گل......''

''بیگم حضور! میں ابھی آیا۔ یہ...... زندہ ہے......''

یہ کہہ کر وہ نیم تاریک غلام گردشوں کی طرف تیزی سے بھاگا۔ بس ایک تیر تھا۔ جو کمان سے نکلا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

مشتری کے زندہ ہونے کی خبر نے سب کے چہروں پر امید کی کرن اور روشنی پھیلا دی تھی۔ بیگم جہاں عجیب سی نظروں سے پرتھال کو گھور رہی تھی۔ جو ابھی تک گم صم دہلیز کے ساتھ لگی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے ابھی ہونٹوں کو جنبش ہی دی تھی کہ شاہ گل ایک پوٹلی سی اٹھائے واپس آیا۔ وہ اس گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا جو کئی کوس تک سرپٹ بھاگتا آیا ہو۔

اس نے کمر سے پتلی دھار والا ایک باریک سا خنجر نکالا اور مشتری کے پاؤں سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ جس پر سیاہ نیلگوں چھالا اُبھرتا جا رہا تھا۔ مشتری کے جسم پر کوئی خفیف سی لرزش بھی نہ ہوئی۔ پھر شاہ گل نے پوٹلی سے ایک سفید سفوف نکالا اور زخم پر چھڑکنے لگا۔ اس نے مشتری کے نتھنوں پر بھی سفوف چھڑکا پھر پانی طلب کیا۔

گل رُخ لپک کر ایک کٹوری میں پانی لے آئی تو شاہ گل نے وہ سفوف پانی میں گھولا اور مشتری کا منہ کھول کر قطرہ قطرہ حلق میں ٹپکانے لگا۔

مشعل کی روشنی میں شاہ گل کے چہرے پر ...... کے سائے لرزاں تھے۔

کٹوری کا سارا پانی قطرہ قطرہ مشتری کے حلق میں جا چکا تھا پھر اُس نے کلائی پکڑی اور نبض تلاش کرنے لگا۔ اس دوران میں کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا جیسے سانس تک روک لیے گئے ہوں۔ اچانک بیگم جہاں کی آواز گونجی۔

''شاہ گل......''

اس آواز میں ایک استفسار تھا۔ ایک خوف تھا۔ شاہ گل کلائی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''زہر اگر جگر تک نہیں پہنچا تو بچنے کی اُمید ہے۔''

شاہ گل کے لہجے میں امید کی روشنی بھی تھی اور مایوسی کا اندھیرا بھی پھر بیگم کے اشارے پر کنیزوں نے مل کر مشتری کو اٹھایا اور مسہری پر ڈال دیا۔

''یہ انتہائی زہریلا ناگ پہاڑوں میں رہتا ہے۔ میرا ایک بھائی اسی کے زہر کا لقمہ بن گیا تھا اور تب سے یہ سفوف......''

لیکن میں حیران ہوں۔

بیگم جہاں نے شاہ گل کی بات کاٹ دی۔ ''یہ ناگ قصر لالہ میں کہاں سے آ گیا؟''

''آیا نہیں لایا گیا ہے بیگم حضور! یہ ناگ میدانی علاقے میں نہیں اُترتا۔''

''پرتھال......'' بیگم کے ہونٹ کپکپا گئے وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ ''آج سے تم میرے پاس سویا کرو گی بانو......''

کنیزوں کی نگاہیں پرتھال کے چہرے پر رینگنے لگیں۔

''شاہ گل! مہر زریں کے بعد محل میں کون آیا تھا؟''

''کوئی نہیں......کوئی بھی نہیں۔''

''اور وہ بیگم شیرازی کی طرف سے پرتھال کی دعوت کا اجازت نامہ لینے آئی تھی۔''

کمرے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ اسی لمحہ بجلی دروازے پر کھڑی کورنش کی رسم ادا کر رہی تھی۔

''علیہ خانم! بیگم شیرازی نے پوچھا ہے۔ ابھی ابھی قصرِ لالہ سے ایک خوفناک چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ کوئی غیر معمولی حادثہ تو پیش نہیں آیا؟''

بیگم جہاں اس اچانک استفسار پر چونک اٹھی پھر غرا کر بولی۔

''بیگم شیرازی سے کہو۔ حادثہ ہو چکا لیکن ان کا بھیجا ہوا ناگ ہلاک کر دیا گیا ہے اب وہ دوبارہ کسی کو نہیں ڈسے گا۔''

بجلی پر جیسے سچ مچ بجلی گر پڑی۔ وہ چپ چاپ پلٹی اور تیزی کے ساتھ چلتی ہوئی کچھ دور جا کر اندھیرے میں گھل مل گئی۔

پھر ایک ساتھ سب کی نگاہیں مسہری پر جم گئیں۔ مشتری کی لاش میں ذرا سی حرکت

پیدا ہوئی تھی۔ گل رُخ نے آگے بڑھ کر اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"مشتری...... مشتری......"

شاہ گل نے اس کے چہرے پر پانی کا چھینٹا دیا۔ مشتری نے کروٹ بدلی۔ اُس کے خشک پھٹے پھٹے سے ہونٹ ہلے۔ پھر ایک ہلکی سی کراہ کی آواز سنائی دی۔ پھر پلکیں تھرتھرائیں اور مشتری نے ہولے ہولے آنکھیں کھول دیں۔ جیسے وہ کسی گہری ناقابلِ یقین نیند سے جاگی ہو۔ موت کے دروازے سے پلٹ آئی ہو۔

اس نے حیرت پاش نگاہوں سے اپنے آس پاس مسکراتے چہروں کو دیکھا گویا انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر اُس کی نگاہ بیگم جہاں پہ جم کے رہ گئی اور اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔

"بے...... گم...... حا...... ضور......"

"گھبراؤ نہیں مشتری! تم بچ گئی ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو۔"

"خدا کا شکر ہے۔" بے اختیار اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔

اپنی مالکہ کو کھڑے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے مارے کراہ کر رہ گئی۔

"نہیں...... نہیں اٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" تریاق اپنا کام کر رہا تھا۔ شاہ گل نے بتایا وہ آٹھ پہر سے پہلے اٹھنے کی ہمت نہیں کر سکتی کیونکہ زہر اس کے اعصاب پر اثر انداز ہوا ہے۔

واقعی مشتری کئی سال کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ اس کے بدن سے زہر کی نیلاہٹیں زائل ہو گئی تھیں اور اب چہرہ کپاس کے پھول کی طرح زرد تھا۔ شاہ گل نے پوٹلی سے تھوڑا سا سفوف نکال کر کٹوری میں ڈال دیا۔ پھر گل رخ سے مخاطب ہوا۔

"ایک پہر کے بعد یہ تریاق اسے پلا دینا۔ میرا خیال ہے مشتری کل تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔"

مشتری نے مدھم آواز میں کراہتے ہوئے بتایا "وہ انار بالا کی باتیں سننے کے لئے بانو کے کمرے میں آئی تھی مگر خلافِ معمول بانو مسہری پر دراز تھیں اور انار بالا آج حاضر نہ تھی۔ میں پلٹنے ہی والی تھی کہ قدموں کے قریب سرسراہٹ محسوس ہوئی پھر ایک شعلہ سا چمکا اور

چھوٹا سا سیاہ ناگ میرے پاؤں کو ڈس کر دروازے سے باہر رینگ رہا تھا۔ بے اختیار میری چیخ نکل گئی پھر یوں لگا جیسے کوئی تیز دھار خنجر میرے کلیجے کو کاٹ رہا تھا پھر میں کب گری؟ اس کا مجھے ہوش نہیں۔"

"پھر شاہ گل تمہارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر نمودار ہوا۔"

بیگم جہاں نے شاہ گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے گل رخ اور انار بالا کو مشتری کی تیمارداری کے لئے اسی کے کمرے میں چھوڑا اور پرتھال کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ زرینہ مشعل اٹھائے اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر علیہ خانم بیگم جہاں کسی گہری فکر میں ڈوب گئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر تھا وہ کسی خطرناک فیصلہ پر غور کر رہی ہے۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے ناگ میرے لئے چھوڑا گیا تھا؟"

پرتھال نے مدھم لہجے میں پوچھا۔ جس میں موت کا سا ابدی سکون تھا۔

"خیال؟" بیگم کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "یہ خیال کی بات نہیں بانو! حقیقت ہے، میرے علاوہ اور بھی کئی آنکھوں نے دیکھا ہے۔"

"اور آپ نے بیگم شیرازی کو اس الزام سے آگاہ بھی کر دیا؟"

"ایسا کرنا ضروری تھا۔"

اس نے زرینہ کو قریب بلایا۔ جو پرتھال کے لئے بستر بچھا رہی تھی۔ "زری! صبح میں تجھے قصرِ لالہ سے دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔ تجھ پہ الزام یہ ہے تو بیگم شیرازی کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے۔"

"نہیں...... نہیں...... علیہ خانم حضور! کنیز اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

زرینہ یہ عجیب و غریب الزام سن کر کانپ اٹھی تھی۔ اس کے بدن پر لرزہ سا طاری تھا۔ پرتھال بھی حیرت زدہ نگاہوں سے بیگم کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک بیگم جہاں کا ہلکا سا قہقہہ بکھر گیا۔

"پھر شیرازی تیری دلجوئی کی خاطر یقیناً تجھے اپنے قصر میں ملازم رکھ لے گی۔ تو میرے خلاف...... اپنی باتوں کا زہر ٹپکا کر شیرازی کا اعتماد حاصل کر لے گی پھر تیرے لئے یہ راز معلوم کرنا کچھ مشکل نہ ہو گا کہ پرتھال کے کمرے میں کالا ناگ کس سپیرن نے چھوڑا

تھا؟ سمجھ گئی ہے میں کیا چاہتی ہوں؟"

زرینہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "آپ نے تو میری جان ہی ہوا کر دی تھی۔ بیگم حضور!"

"تجھے یہ کام بس دو تین دن کے اندر ہی نپٹا لینا ہوگا پھر اس حسین ناگن کی گردن میری مٹھی میں ہوگی اور شیرازی کا قضیہ شاید ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ میں سلطان کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی۔"

شیرازی کے خلاف یہ فیصلہ سناتے وقت بیگم جہاں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی جگمگا رہی تھی۔ اس نے زرینہ کو نکل جانے کا اشارہ کیا اور مسہری پر گرتی ہوئی بولی۔

"بہت ہو چکی ہے اب اس کتیا کا انجام قریب نظر آتا ہے میں کئی خنجروں کو اُس کے سینے میں پیوست ہوتے دیکھ رہی ہوں۔"

پرتھال نے حیرت پاش نگاہوں سے بیگم جہاں کی طرف دیکھا اور چپ چاپ مسہری پہ جا لیٹی۔ دوسرے لمحے جب اس نے نظر اٹھائی تو اس کی بوڑھی محافظ نیند کے زینے طے کر رہی تھی۔



9

تاریخی ورق

ہما کنٹھ

دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی ساحل سے چند کوس پرے چٹیل میدان میں گولکنڈہ کے تاریخی کھنڈر کئی صدیوں سے لوگوں کے لئے ایک کہانی بنے ہوئے تھے کہتے ہیں اڑھائی ہزار سال پہلے شہر سگریو کی راجدھانی کی حیثیت سے مشہور تھا۔

1336ء میں جب راجہ ہری ہر نے جنوبی ہند میں اقتدار حاصل کیا تو ان ہی تاریخی کھنڈروں پر اپنی سلطنت بیجاپور کی رادھانی وجے نگر کی بنیاد ڈالی جنگی اعتبار سے یہ جگہ اس لئے اہم تھی کہ اس کے تین اطراف میں اونچے اونچے پہاڑ تھے اور چوتھی سمت شمال میں دریائے تنگ بھدرا گویا ایک قدرتی خندق کا کام دے رہا تھا، وجے نگر کے اردگرد ایک مضبوط اور چوڑی فصیل بنائی گئی تھی جو اپنی بلندی اور مضبوطی کی وجہ سے ہما کنٹھ کہلاتی تھی۔

ہری ہر نے کئی راجاؤں کو اپنا باجگزار بنایا تھا وہ اپنے خاندانی دیوتا ''ویرو پکشا'' کی پوجا کرتا تھا۔ اس کے جھنڈے پر جنگلی سؤر کی تصویر نقش تھی کیونکہ سؤر کا نشان حکومت تھا۔ ''رائے رایاں'' کا خاندان اگرچہ دولت وحشمت میں سارے ہندوستان میں شہرت رکھتا تھا لیکن ایک صدی کے اندر ہی اندر وجیانگر کی سیاسی اور فوجی عظمت کا آفتاب گہنا چکا تھا اور جب سے دیورائے راج سنگھاسن پر بیٹھا تھا اس کی بدتدبیری حُسن پرستی اور عیاشی کی وجہ سے سلطنت کی بنیادیں آہستہ آہستہ کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں۔

وجے نگر کے شمال کی طرف دکن میں سلطنتِ خداداد بھمنیہ کے نام سے ایک طاقتور اسلامی مملکت قائم تھی، جس کا حکمران سلطان فیروز شاہ بہمنی "سکندر ثانی" کے نام سے سارے ہندوستان میں شہرت رکھتا تھا۔ اُن دنوں دہلی کی مرکزی تغلق حکومت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا ہندوستان چھوٹی چھوٹی آزاد اور خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر راجہ دیورائے کی سیاسی وحشت نے سر ابھارا اور اس نے دکن پر حملہ کر کے اپنے پہلو سے اس اسلامی سلطنت کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکال دینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ تو لاکھ بہادر اُس کی پیادہ فوج میں تھے، پھر تیں ہزار منتخب سوار، بے انداز کماندار اور برق انداز ہمراہ لے کر 801ھ مطابق 1449 میں وہ دکن کے سرحدی اضلاع مدگل اور رائے چور پر حملہ آور ہوا۔

سلطان فیروز شاہ حسن آباد گلبرگہ میں تھا۔ جب خبر پہنچی کہ دیورائے آگ اور خون کی ہولی کھیلتا ہوا دکن کی طرف بڑھا آتا ہے، سلطان نے فوراً لشکرِ سلطانی کے سپہ سالار احمد خاں خانخاناں کو قاضی منہاج کے ساتھ مقابلہ پر روانہ کیا کہ وہ بڑھتے ہوئے طوفان کو روکیں پھر ساغر برار اور دولت آباد کے لشکر اکٹھے کر کے خود بھی دیورائے سے نپٹنے نکلا۔ خاں خانخاناں نے جاتے ہی دیورائے کے لشکر کا صفایا کرنا شروع کر دیا جب راجہ نے سلطان کے سیاہ پرچموں کو لہراتے دیکھا تو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس کے بے شمار قیدی سلطانی لشکر کے ہاتھ لگے۔ جن کی رہائی کے لئے دیورائے نے پہلے دس لاکھ ہون پھر چھ لاکھ ہون سلطان کی نذر کئے۔ قیدیوں کی رہائی کی بات چیت امیر فضل اللہ کی معرفت ہوئی تھی اس لئے دیورائے نے پانچ لاکھ ہون امیر فضل اللہ کو الگ بھجوائے تھے۔ سلطان نے فولاد خاں بن صفدر خاں سیستانی کو سرحدی اضلاع کا نگران مقرر کیا اور فتح کے پرچم اڑاتا گلبرگہ واپس آ گیا حالانکہ اس کی اصل منزل وجے نگر تھی لیکن اس نے معاہدۂ صلح کو توڑنا پسند نہیں کیا۔

دیورائے نے ناکامی کا بدلہ لینے اور اپنی خفت مٹانے کے لئے نرسنگھ رائے والئے کھترلہ کو اکسایا کہ وہ برار پر تاخت کرے، بیوقوف نرسنگھ رائے دیورائے کی چال میں آ گیا۔ اس نے سندور اور آسیر کے حاکموں کی حمایت حاصل کی اور برار پر چڑھ دوڑا ادھر دیورائے خود بھی دکن پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ سلطان نے یہ صورتحال دیکھی...... تو

دیورائے کو اس کی بدعہدی کا مزہ چکھانے کے لئے گلبرگہ سے نکلا۔ اس نے امیر فضل اللہ شیرازی کو نرسنگھ رائے کی گوشمالی کے لئے بھیجا اور خود بارہ ہزار سوار لے کر موسم برسات میں جب دریا طغیانی پر تھا دریا چیرتا ہوا وجے نگر پہنچا۔

امیر فضل اللہ نے کھترلہ سے دو منزل آگے نرسنگھ رائے سے جنگ کا آغاز کیا۔ شجاعت خان، دلاور خان، رستم خان اور بہادر خان ایسے امیر اور بہادر شہید ہوئے لیکن امیر نے فتح پائی، نرسنگھ رائے بھاگ کر کھترلہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ اس کا لڑکا کوسل رائے گرفتار ہوا۔ آخر نرسنگھ رائے نے چالیس ہاتھی، پانچ من سونا، پچاس من چاندی اور دیگر تحفے تحائف دے کر صلح کر لی اور سلطان کا مطیع و باجگزار رہنا قبول کیا۔

ادھر دیورائے بھی قلعہ بند ہو کر لڑنے لگا آخر قاضی سراج نے ایک ڈرامائی کارنامہ سرانجام دے کر دیورائے کے لڑکے کو قتل کر دیا۔ جس کے مرتے ہی راجہ کی ہمت ٹوٹ گئی اور اس نے ایک مرتبہ پھر صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ سلطان نے اس شرط پر صلح قبول کی کہ دیورائے ہر سال خراج دینا منظور کرے اور جب ہم بلائیں بلاحیل و حجت ہمارے پاس چلا آئے۔ مہاراج دیورائے نے یہ شرط قبول کر لی اور باجگزار بن کر اپنی جان چھڑالی۔

804ھ میں سلطان نے امیر تقی الدین محمد اور مولانا لطف اللہ سبزواری کو امیر تیمور صاحبقراں کی بارگاہ میں بھیجا اور اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ امیر تیمور نے سلطان کی اس روش کو پسند کیا اور یہ نامہ لکھ بھیجا۔

"ہم نے دکن، گجرات اور مالوہ کی بادشاہی سعادت نشان فیروز شاہ کو عنایت کر کے تخت و چتر و جمیع لوازم سلطنت کی اجازت بخشی اور اسے اپنا فرزند خیر خواہ قرار دیا۔"

اس نامہ کے ساتھ امیر تیمور نے ایک شاہی پٹکا، شمشیر اور مرصع اور چار گھوڑے بھی سلطان کو بھیجے تھے فرمان تیموری کے بعد جنوبی ہند پر سلطان شاہ کی حکومت و فرمانروائی کا سکہ رواں ہو گیا تھا اور کسی حکمران کو اس سے مجال انکار نہیں تھی۔

تیمور اعظم آندھی کی طرح ہندوستان میں آیا اور بگولے کی مانند چلا گیا۔ اس کے گھوڑوں کے سامنے ایشیا کے وسیع میدان پڑے تھے۔ جنوبی ہند کا میدان وہ سلطان فیروز شاہ کے لئے چھوڑ گیا تھا۔

دیورائے جانتا تھا۔ سلطان سے سرتابی کا مطلب تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں

وجیانگر کے علاوہ اس نے تلنگانہ اور گونڈوانہ کی ریاستیں بھی باج کے رکھ دی تھیں اس کے سیاہ پرچم پورے جنوبی ہند پر لہرا رہے تھے اس کے باوجود راجہ چار سال سے خاموش نہیں بیٹھا تھا بلکہ چپکے ہی چپکے اپنی طاقت میں اضافہ کرتا رہا۔ اس نے ایک لشکرِ جرار تیار کیا۔ دکن کی اطاعت کا جوا اتار پھینکا، چوتھے سال خراج کی رقم روک لی پھر اس کے چھوٹے چھوٹے لٹیرے دستے دکن کی سرحدوں پر لوٹ مار کرنے لگے۔ ہوا کا رخ بدلنے لگا، سلطان نے فیروز آباد کا صوبہ شہزادہ حسن خان کو جاگیر میں دے دیا اور مطمئن ہو گیا وہ جانتا تھا۔ نوجوان شہزادہ دیورائے سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن دیورائے تمام معاہدے توڑ کر مدگل پر حملہ آور ہوا۔ پرتھال کے حسن کا شعلہ خرمنِ دل کے ساتھ اس کی متاعِ فکر و شعور کو بھی پھونکتا ہوا چلا گیا اور اس نے ایک مرتبہ پھر سلطنت بہمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

ایک مرتبہ پھر دونوں ریاستوں پر قہر و بلا کی بجلیاں چمکنے..... کڑکنے لگیں۔

ایک مرتبہ پھر سور کے نشانوں والے زرد جھنڈے اور سیاہ پرچم حرکت میں آ گئے......

دیورائے نے کئی مرتبہ وعدہ خلافیاں کی تھیں۔ کئی بار معاہدے توڑے تھے لیکن اس مرتبہ اس نے مملکت دکن کی ایک نوجوان لڑکی کی عزت بھی لوٹنا چاہی تھی۔ اس کی وحشیانہ حرکت اس کے لئے موت کا پیغام بن گئی تھی، سلطان اس مرتبہ صلح کرنے نہیں، وجے نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی، وہ دیورائے کو گستاخی کی ایسی عبرت ناک سزا دے گا جسے مستقبل کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے۔

ویرو پکشا کی دھرتی

806ھ مطابق 1453ء کے موسم زمستان کا جاڑا شروع ہو چکا تھا جب سلطان نے فیروز آباد سے پڑاؤ اٹھایا اور بیجانگر کی طرف کوچ کیا۔

دریائے تنگ بھدرا برسات کے پانیوں کو اپنے کناروں میں سمیٹے دیوانہ وار بہہ رہا تھا لیکن سلطانی لشکروں کو دریا عبور کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا اور جنوبی گھاٹ پر ولی عہد کے سوار پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے پھر پیدل فوج کے لئے کشتیوں کا بیڑہ بھی کنارے آ لگا تھا۔ قباچہ خان اور کوسل رائے کشتیاں ساتھ لے کر آئے تھے، کوسل رائے دریائی مہموں میں ماہر تھا۔ اور یہ تربیت اس نے اپنے باپ نرسنگھ رائے ہی سے حاصل کی تھی جو کھرلہ کی

لڑائی کے بعد سلطان کا مطیع و فرمانبردار بن گیا تھا۔

غروب آفتاب سے پہلے خانخاناں اور ارگو خان کے لشکر بھی دریا پر آ پہنچے، لشکر پار اتار دیئے گئے لیکن خانخاناں اور ارگو خان چند سواروں کے ہمراہ سلطان کے استقبال کے لئے شمالی کنارے ہی پر ٹھہر گئے تھے۔

نیالے اندھیروں میں دور...... فیروز آباد کے راستے پر لشکر سلطانی کے خاص نشانات لہراتے نظر آ رہے تھے مگر ابھی تک شہزادہ حسن کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جسے بہر طور پر سلطان کی پیشوائی کے لئے اس کنارے پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ ارگو خان کا خیال تھا۔ ''ممکن ہے، شہزادہ فیروز آباد کے محلوں ہی میں الجھ کر رہ گیا ہو۔ میں نے اس کے چہرے پر دیوانگی کے آثار دیکھے تھے جو یقیناً اس کی نئی محبت کی غمازی کرتے ہیں۔''

''کیا بکتے ہو۔ وہ امیر شیرازی کا داماد ہے۔'' خانخان نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو وہ دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتا؟'' ارگو خان کے لہجے میں طنز تھی۔

''اچھا تم یہاں تک سوچ رہے ہو؟''

''میرے اندازے بہت کم غلط ثابت ہوتے ہیں۔''

''لیکن وہ کون ہو سکتی ہے۔''

''میرا خیال ہے...... پرتھال بھی یہ قیامت ڈھا سکتی ہے۔ اگر رونق بیگ اس کے ہمراہ نہ ہوتا تو میں سمجھتا یہ خطرہ ٹل بھی سکتا ہے لیکن اب نہیں......'' پھر ارگو خان کا قہقہہ بلند ہوا۔

''احمد خان! یقین رکھو، سنار کی لڑکی شہزادے کے دل پر ہتھوڑی کی ضرب لگا چکی ہے ورنہ وہ دربار میں اس بیباکی سے گفتگو نہ کرتی۔ کیا کبھی شہزادیوں نے بھی اس طرح سلطان سے باتیں کی ہیں؟''

''پھر تو مجھے امیر شیرازی کے ساتھ پوری ہمدردی ہے، حسن خان لاابالی تو ہے، ضرور نگاہ کا تیر کھا بیٹھا ہوگا۔''

ابھی خانخاناں نے اپنا فقرہ بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ ان کی نگاہیں مشرقی ٹیلوں کی طرف اٹھیں۔ چند سوار غبار کا دامن چیرتے ہوئے گھاٹ کی طرف بڑھے۔ ان میں شہزادہ حسن سب سے آگے تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے محافظ سواروں کے ہمراہ ان کے سامنے

کھڑا تھا۔ اس نے خانخاناں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"چچا حضور! مجھے افسوس ہے میں آپ کا استقبال نہ کر سکا دراصل مجھے ایک ضروری کام کے لئے فیروز آباد میں رُک جانا پڑا مگر شکر ہے سلطانِ معظم کی تشریف آوری سے پہلے پہنچ گیا ہوں۔"

ارگو خان اور خانخاناں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"جانِ عالم! مجھے آپ کی قسمت پر رشک آتا ہے۔"

ارگو خان کے بھدے لبوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"رشک؟ آخر کیوں؟"

"قدرت نے آپ کو ایک حسین مہمان کی خدمت کا شرف بخشا ہے۔ کیا یہ واقعہ قابل رشک نہیں۔ دیورائے کا انتخاب غلط نہیں تھا۔"

"بہر حال میں ایک فرض ادا کر رہا ہوں۔"

لیکن صاف ظاہر تھا۔ "فرض کی ادائیگی" کا ذکر کرتے ہوئے اس کی گردن شرم سے جھک گئی تھی۔ اگر اس کا چچا قریب نہ ہوتا تو ممکن ہے اس نے ارگو خان کی بات کا جواب کسی دوسرے طریق سے دیا ہوتا لیکن وہ اپنے باپ ہی کی طرح اپنے چچا کی عزت کرتا تھا، غالباً احمد خان بھی اپنے سامنے اسے شرمسار ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بات کا رخ بدل کر اُڑتی ہوئی دھول کی طرف اشارہ کیا۔

"سلطانِ معظم کی سواری آ پہنچی ہے۔ رستم! تم مشعلوں کو آگ دکھا دو، پھر شہزادہ کی طرف مخاطب ہوا۔" جانِ عالم! سلطانِ معظم کی پیشوائی کا فرض آپ ہی ادا کریں گے، آپ کا لشکر سب سے پہلے گھاٹ پر پہنچا تھا پھر یہ علاقہ آپ ہی کی جاگیر ہے۔"

"لیکن آپ کی موجودگی میں......"

"میری موجودگی حق تلفی نہیں چاہتی۔"

رستم نے مشعلیں روشن کر دی تھیں جن کی روشنی میں دریا کا گھاٹ چمک اٹھا تھا ان مشعلوں کو دیکھ کر آنے والے لشکر نے اپنا رخ متعین کر لیا۔

جب لشکر ایک فرسخ کے فاصلہ پر رہ گیا تو دستور کے مطابق شہزادہ حسن گھوڑے سے اترا پھر خانخاناں اور ارگو خان کی معیت میں سلطان کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھا جو اپنے

کوتل گھوڑے پر سوار تھا۔

سلطان کے رکتے ہی لشکر رک گیا۔ سب سے پہلے ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک گھوڑوں سے کود کر نیچے اُترے اور سلطان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

شام کے مٹیالے اندھیروں میں ہاتھی سیاہ چٹانوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے مشعلوں کو دیکھ کر سردار ہاتھی "فخرا" زور سے چنگھاڑا اور گھاٹ کی خاموش فضا تھرتھرا اٹھی۔

سلطان گھوڑے سے اُتر آیا تھا۔ خانخاناں اور ارگو خان کو دیکھ کر مسکرا دیا، شہزادہ حسن نے پوچھا۔

"کیا سلطانِ عالی! اسی وقت دریا عبور کرنا چاہتے ہیں؟"

"خیریت باشد جانِ عالم! کہیں دریا میں طغیانی تو نہیں آ گئی؟"

"نہیں تو...... پانی حسب معمول بہہ رہا ہے۔"

"پھر......"

"میرا خیال تھا۔ دریا صبح بھی عبور کیا جا سکتا ہے۔"

"نہیں جانِ پدر! ہم آرام کرنے نہیں نکلے۔ ابھی دریا عبور کریں گے اور سفر رات بھر جاری رہے گا۔ صبح شوالے کے پہلے گجر کے وقت ہم وجے نگر کے دروازے پر دستک دینا چاہتے ہیں۔"

سلطان کی زبان سے یہ فقرے سن کر ارگو خان اور خانخاناں بھی حیران رہ گئے وہ جانتے تھے۔ سلطان مہم پسند ہے اور جب دشمن پر چڑھائی کرتا ہے تو اسے سوچنے اور سمجھنے کی مہلت بھی نہیں دیتا لیکن ساری رات کا سفر کیا سپاہیوں کو نڈھال نہیں کر دے گا؟ حملہ سے قبل آرام ضروری تھا لیکن سلطان کی لغت میں شاید آرام کا لفظ ہی نہیں تھا۔ اس نے بتایا۔

"ایک رات کی کوفت سپاہی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی پھر شہزادہ حسن کی سپاہ تازہ دم ہو چکی ہے۔ قباچہ خان اور کوسل رائے کے دستوں نے آرام کر لیا ہو گا۔ حملہ کا آغاز حسن ہی کرے گا۔"

سلطان کا فیصلہ اٹل تھا۔ اسی وقت لشکر کو دریا پار کرنے کا حکم مل گیا۔ ہاتھی اور گھوڑے پایاب حصہ کی طرف ہانک دیئے گئے۔ خود سلطان شہزادہ حسن، خانخاناں، ارگو خاں، ہشیار اور بیدار کے ساتھ کشتی کے ذریعے جنوبی گھاٹ پر اُتر گیا۔ فولاد خان سیستانی، قباچہ خان، کوسل رائے اور امیر فضل اللہ کے بیٹے اور داماد پیشوائی کے لئے موجود تھے دوسرے کنارے

پر بھی لاتعداد مشعلیں جگمگا رہی تھیں۔ جن کے لرزتے ہوئے عکس لہروں پر تھرتھرا رہے تھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تنگ بھدرا کے کنارے چراغاں کا میلہ لگ رہا ہو۔

ابھی لشکرِ سلطانی کے آخری سواروں نے اپنے گھوڑے دریا میں نہیں ڈالے تھے کہ امیر فضل اللہ شیرازی کا لشکر بھی پہنچ گیا۔ دوسرے کنارے پر اترتے ہی سلطان نے گھوڑا طلب کیا اور لشکروں کو روانگی کا حکم سنایا۔ کوچ کی ترتیب دی تھی۔ کوسل رائے اور قباچہ خان کے آگے شہزادہ حسن اور فولاد خان کے سوار گھوڑے دوڑاتے بڑھے جا رہے تھے۔

رات اپنے آشیانہ فلک سے اتر آئی تھی اور آغاز سرما کا جاڑا اپنے سرد پر پھیلا رہا تھا۔ مشعلیں گل کر دی گئی تھیں اور رات کے خنک اندھیروں میں "موت کے لشکر" وجے نگر کی طرف رواں تھے۔ دشمن کی سرزمین اُن کے گھوڑوں کے سموں تلے دھڑک رہی تھی۔ راجہ ہری ہر کا دیس "ویرو پکشا" کی پوتر دھرتی جسے دیورائے کی سرمستیوں نے آلودہ کر دیا تھا۔ وہ ملک جس پر کبھی مہادشنو کے ہاتھ کا سایہ تھا آج اپرادھ کی بھیانک تاریکیوں میں ملفوف راون اور کنس کا دیس بن گیا تھا۔ جس کے راج رنواس میں مقدس آشرم کی دیوداسیاں اور دیس کی سندر کیناؤں کی عزت لٹتی تھی۔ جہاں اونچی ذات کا خاندان "رائے رایاں" خود کو عام ہندوؤں سے بلند و بالا سمجھ کر ہر ظلم اور ہر پاپ کو جائز سمجھتا تھا۔ دیورائے مہاراجہ تھا۔ کرناٹک کا ان داتا اور اسے یہ ادھیکار تھا کہ وہ عام ہندوؤں سے نفرت بھی کرے اور اُن پر حکومت بھی...... حالانکہ ہری ہر نے اپنی پرجا کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا تھا لیکن ہری ہر کو سورگباش ہوئے زمانہ بیت چکا تھا اور اب کرناٹک کے سر پر دیورائے کی تلوار چمک رہی تھی۔ سلطان اس سرزمین میں داخل ہوتے ہی آرام کا نام بھول گیا تھا وہ صبح شوالے کے پہلے گجر کے ساتھ وجے نگر کا دروازہ اپنی تلوار کے دستہ سے کھٹکھٹانا چاہتا تھا جس کے کواڑوں کے پیچھے دیورائے دارو کے نشہ میں مدہوش پڑا تھا۔

رات کے تاریک اور پُرہول سناٹے میں پتھریلی زمین پر گھوڑوں کے قدموں کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی لیکن دیورائے کے بہرے کان شاید ان آوازوں کو نہیں سن سکتے تھے۔

دو کردار

تقدیر...... اگر کوئی طاقت ہے تو وہ یقیناً دیورائے کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکی تھی

کیونکہ جب بیجانگر کے مہاشوالہ میں صبح کا پہلا گجر بجا اور پروہت پجاری نے مہادشنو کے نام کا سنکھ پھونکا۔ ٹھیک اس وقت قلعہ کی فصیل سے صرف نصف کوس پرے بہمنی لشکر صف آرا ہو چکے تھے جن کی قیادت بہ نفس نفیس سلطان فیروز شاہ بہمنی سکندر ثانی کر رہا تھا۔

سلطان نے رات بھر سفر جاری رکھا تھا اور صبح کاذب کے نمودار ہونے سے پہلے ہی منزل مقصود پر پہنچ کر لشکروں کو فصیل کے اردگرد پھیلا دیا تھا اگرچہ وہ سامنے ہی سے حملہ کرنا اور فصیل کا دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتا تھا پھر بھی اُس نے قباچہ خان اور کوشل رائے کے دستوں کو اونچے نیچے پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ رہنے کا حکم دیا۔ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر بہمنی لشکروں کو بیجانگر میں داخل ہونے کے بعد پسپائی اختیار کرنا پڑے تو یہ دستے تعاقب کرنے والوں کو آتشیں تیروں کی باڑھ پر رکھ لیں۔

حملہ کرتے وقت سلطان جنگ کے دونوں پہلو سامنے رکھتا تھا اور فوجوں کو ہمیشہ اس طرح ترتیب دیتا تھا کہ پسپائی کی صورت میں بھی بہت کم نقصان ہو اور تباہی کا سارا خمیازہ دشمن کو بھگتنا پڑے۔

دیورائے جب رات مہامنتری اور رانجگو رو کو رخصت کر کے اپنے کمرۂ خواب میں داخل ہوا تھا تو بیجانگر کے خبر رسانوں سے یہ اطلاع سن کر حیران رہ گیا تھا کہ سلطان دکن نے خود جنگ کا جھنڈا باندھا ہے اور فیروز آباد سے اپنے لشکروں سمیت دریائے تنگ بھدرا کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جاسوسوں کے قیاس کے مطابق بہمنی لشکر رات کے اندھیرے میں دریا عبور کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ دریا میں ابھی تک طغیانی تھی اور لہریں مگرمچھوں کی طرح منہ کھولے بڑھ رہی تھیں۔ ایسی حالت میں دریا عبور کرنا سواروں اور پیادوں کی غرقابی کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن وہ بھول گئے تھے کھترلہ کے حکمران نرسنگھ رائے کا بیٹا کشتیوں کا بیڑا تیار کرنے میں حیرت انگیز مہارت رکھتا اور اُسے حریف کی عقابی نگاہوں سے چھپانے کا فن جانتا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ بیجانگر کے جاسوس کشتیوں کے اس بیڑہ کو دیکھ ہی نہیں سکے تھے جسے کوشل رائے نے دریا کے کنارے کنارے جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ تو سلطانی لشکروں کے ہراول دستوں ہی کو دیکھ کر اطلاع دینے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

دیورائے نے اتنی عقلمندی ضرور کی تھی کہ آس پاس پڑے ہوئے دستوں کو بیجانگر کے

قلعہ میں اکٹھا کرلیا تھا جس کا حصار ناقابلِ شکست تسلیم کیا جاتا تھا۔ دیورائے کی آدھی قوت بھی حصار تھا جس کے اردگرد پہاڑی ٹیلوں کی قدرتی دیوار نے اُسے اور بھی مضبوط و مستحکم کردیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا جب تک یہ قدرتی فصیل قائم ہے۔ تیر اندازوں کی موجودگی میں خندق کی طرف بڑھنے والا ہر لشکر اپنی موت کو آواز دے گا اور وجے نگر کے تیر انداز نشانہ باندھنے میں دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔

دیورائے کو یہ بھی یقین تھا سلطان شہر میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اول تو کوہستانی حصار کو کاٹنا بڑا مشکل مرحلہ ہے کیونکہ اس کے آس پاس دس ہزار بہترین تیر انداز چھپے بیٹھے تھے۔ دوسرے اگر وہ پہاڑی ٹیلوں سے بچ کر نکل بھی آئے تو فصیل کے اردگرد گہری اور چوڑی خندق بہمنی سپاہیوں کے لئے موت کی کھائی بن جائے گی۔ تیسرے قلعہ کی فصیل سے ٹکرانا سنگ و آہن سے سر پھوڑنے والی بات تھی۔ پھر ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری فصیل دشمن کو روکنے کے لئے کافی تھی۔ وجے نگر فصیلوں کا شہر تھا۔ اس لئے وہ کافی مطمئن تھا اور یہ اطمینان کچھ بے وجہ بھی نہیں تھا۔

سلطان نے چہار شنبہ کو کوچ کیا تھا اور ایک عام اندازے کے مطابق وہ پنجشنبہ کی شام سے پہلے بیجانگر میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

دیورائے کے چہرے کا زخم جو اُسے شمشیر خاں کے خونی برچھے کی یاد دلاتا رہتا تھا اب مندمل ہو چکا تھا اور نئی جنگ کی تیاریوں میں وہ گھاٹ کی لڑائی کا صدمہ بھی بھولتا جارہا تھا۔ اُس کے کمرۂ خاص میں دو حسین و جمیل نرتکیاں اور شراب سے بھری ہوئی صراحیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ مستقبل کے خوف و خطر سے بے نیاز اور بے پروا ہو چکا ہے اور جنگ کو بہادروں کا ایک کھیل سمجھتا ہے۔

دیورائے میں اگر تکبر، حد سے بڑھی ہوئی نخوت اور اپنے ہی دیس کے باشندوں سے نفرت کرنے کے عیب نہ ہوتے اور حسن و شراب نے اس کی ذہنی قوتوں کو مسخ نہ کردیا ہوتا تو بلاشبہ وہ ایک بہادر اور جنگجو سپاہی تھا لیکن مصیبت تو یہ تھی وہ اپنے آپ کو اُن ہندوؤں سے فائق و برتر سمجھتا تھا جن کی وفاداریاں تخت کے پایوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں جو معاشی اعتبار سے حقیر و کمتر ہونے کے باوجود راجپوتی جوہر رکھتے تھے اور میدانِ جنگ میں کٹ مرنا باعثِ عزت سمجھتے تھے لیکن اُن کی تمام ہمدردیاں صرف وجے نگر کے لئے تھیں۔

دیورائے کی ذات کا معاملہ ہوتا تو ان کی تلواریں کبھی نیام سے باہر نہ آتیں۔ وہ دیورائے سے صرف اسی حد تک تعلق رکھتے تھے کہ وہ اُن کا مہاراج ہے۔ بس..... مگر اس وقت مہاراجہ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ایک ذاتی مقدمے کو قومی اور ملکی رنگ دے کر کرناٹکی سورماؤں کو سلطان فیروز شاہ کے خلاف آمادۂ جنگ کر لیا تھا جسے وہ مخالفت کے باوجود پسند کرتے تھے۔ سلطان کا کردار دیورائے کے مقابلہ میں کسی دیوتا کا روپ ہی معلوم ہوتا تھا جو کاشی کی یاترا کو جانے والے بیجانگر کے ہندوؤں کے لئے بھی آسانیاں فراہم کرتا اور ان کے قیام و طعام پر نظر رکھتا تھا۔ دیورائے کے نفرت انگیز ویاکھیان کے باوجود جو اُس نے راج دربار میں دیا تھا کئی لوگ ایسے تھے جو اپنے دلوں سے فیروز شاہ کی خوبیِ کردار کو محو نہ کر سکے۔ وہ دبے دبے الفاظ میں کہا کرتے تھے۔ ”کاش دیورائے بھی فیروز شاہ کی طرح بلند اخلاق ہوتا۔“

یقیناً وہ حکمران احمق ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اُن کے اخلاق و کردار کے سائے رعایا پر نہیں پڑتے۔

جب سے لوگوں نے یہ سنا تھا۔ سلطان نے اپنی مملکت کی ایک ہندو لڑکی پرتھال کی بے عزتی کا بدلہ چکانے کے لئے بیجانگر کا رُخ کیا ہے۔ وہ عجیب سے جذبات میں بہہ نکلے تھے۔ اسی ایک واقعہ سے دونوں حکمرانوں کے کردار آئینے کی مانند روشن ہو جاتے تھے۔

ایک محسن کا ڈاکو تھا جو اپنے ہی دیس اور اپنے ہی دھرم کی کنیا کی عزت لوٹتا تھا۔ دوسرا عزت کا محافظ جو ایک غیر مسلم لڑکی کی خاطر تلوار کھینچ کر میدان میں آیا تھا۔

اے بھگوان...... اب بیجانگر کی دھرتی پر کیا ہونے والا ہے؟ کیا فیروز شاہ کی تلوار دیورائے کا خون چاٹے بغیر نیام میں جانے والی ہے؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔

آدھی رات تک دیورائے دارو پیتا اور رقاصاؤں کے سندر مکھڑوں سے کھیلتا رہا۔ ان میں سے ایک رقاصہ وہی تھی جو دیورائے کے ساتھ مدگل میں جنگ کا نظارہ دیکھ چکی تھی اور پانسہ الٹتے دیکھ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب رہی تھی اس نے شراب کا آخری پیالہ بھرا اور دیورائے کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

”مہاراج! میں نے سنا ہے دکن کا سلطان جنگ کے لئے آ رہا ہے کیا یہ خبر......“

"سلطان...... سلطان......" وہ نفرت و حقارت کی چنگاریاں اڑاتے ہوئے ذرا سا اچھل گیا۔ "تم سب لوگ اس سے ڈرتے ہو۔"

زنگی سہم کر پرے ہٹ گئی۔ وہ جانتی تھی جوش غضب میں وہ شراب کا پیالہ اسی کے منہ پر دے مارے گا۔

"فیروز شاہ...... ہم جیسا ایک راجہ ہے...... جس کی...... موت...... اُسے بیجانگر کی طرف ہانک لائی ہے۔"

دیورائے نے یہ فقرہ رُک رُک کر ادا کیا۔ شراب اُس کے حواس پر غالب آتی جا رہی تھی اور وہ بیہوش ہونے سے پہلے کسی بزدلی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غصہ کی وجہ سے وہ ایک طرف لڑھک گیا اور دوسرے ہی لمحے زنگی نے محسوس کیا وہ بیہوش ہو چکا ہے۔ زنگی اپنا کان اُس کے منہ کے قریب لے گئی وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"پر...... تھال...... تو...... کہاں ہے؟"

دونوں زنگیوں نے نہایت آہستگی کے ساتھ اُسے مسہری پر ڈال دیا پھر دبے پاؤں باہر نکل گئیں راج رنواس پر گہری پراسرار خاموشیاں طاری تھیں۔

بیجانگر پر حملہ

دیورائے بے سدھ پڑا تھا۔

بیجانگر کے شوالوں اور مندروں میں زور زور سے سنکھ پھونکے جا رہے تھے جن کی آواز صبح کے اُجالوں میں خطروں کا اعلان کر رہی تھی۔ مشرق کے اندھیرے غاروں کے حاشیوں پر سرخ روشنی تھرتھرا رہی تھی اور کئی لوگ بستروں ہی میں دبکے پڑے تھے کہ سنکھوں کی ہیبت ناک آواز اُن کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

راج رنواس میں ایک قیامت سی مچی ہوئی تھی۔ دیوداسیاں، زنگیاں اور رانیاں راج محل کی کھڑکیوں اور جھروکوں سے وحشت زدہ نظروں کے ساتھ فصیل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جہاں ہزاروں تیر انداز اندھا دھند تیر برسا رہے تھے۔

سلطانی لشکروں نے قلعہ پر دھاوا بول دیا تھا لیکن بیجانگر کا محافظ دارو کے نشے میں مدہوش پڑا تھا۔

راجکماری چندر کلا بھاگی بھاگی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ خود مہاراج کو خطرے سے آگاہ کرنے آئی تھی۔ کوئی داسی اتنی صبح مالک کو جگانے کی گستاخی نہیں کر سکتی تھی ورنہ اس کا سر تن سے جدا کر دیا جاتا۔

چندر کلا نے آتے ہی مدہوش باپ کو کندھوں سے جھنجھوڑ دیا۔

"مہاراج! اٹھیے دشمن نے حملہ کر دیا ہے لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ اٹھیے مہاراج ہوش میں آیئے۔"

دیورائے نے ایک لمبی "اوں......" کے ساتھ کروٹ بدل لی۔

"پتا جی! اٹھیے بھگوان کے لئے ہوش کیجئے۔ سلطان نے حملہ کر دیا۔ سلطان نے حملہ کر دیا۔"

"سلطان نے حملہ کر دیا۔"

راج محل کے ہر گوشہ میں یہی متوحش آواز گونج رہی تھی، چندر کلا نے ایک مرتبہ پھر باپ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"پتا جی! سلطان نے حملہ کر دیا۔ لڑائی شروع ہو گئی۔"

رات دیورائے نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پی لی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے آنکھیں کھول دیں اور قہر آلود نگاہوں سے جگانے والے کو دیکھا ساتھ ہی اس کا ہاتھ تلوار کے قبضے کی طرف بڑھا جو دیوار پر آویزاں تھی۔

رات بھر پینے کے بعد جب ابھی خمار بھی نہیں ٹوٹا تھا اتنی صبح بیدار کرنے والی بدنصیب داسی کو ضرور اس کی موت ہی یہاں گھیر لائی ہے۔

"مہاراج! میں چندر کلا ہوں۔ اٹھیے! سلطان نے حملہ کر دیا۔"

"چندر کلا...... سلطان...... حملہ......"

دیورائے کے ہونٹوں کو ہولے ہولے جنبش ہوئی۔

مندروں اور شوالوں میں ابھی تک سنکھ چلائے جا رہے تھے، جن کی روح فرسا بھیانک آوازیں راج محل کے اس کمرۂ خاص میں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دیورائے نے یہ آوازیں سنیں۔ آنکھیں پھاڑ کر چندر کلا کی طرف دیکھا جو مسہری کے پاس کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی۔

"چندر کلا تم......"

"ہاں چاچا جی! آپ دارو پی کر سو رہے ہیں اور دشمن فصیل کا دروازہ توڑ کر شہر میں گھس آیا ہے۔"

"کیا کہا تم نے......"

دیورائے زخمی شیر کی طرح دھاڑا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"مہاراج! جنگ اس وقت شہر کی فصیل کے اندر ہو رہی ہے سلطان کی فوجیں ہماری توقع کے خلاف جلدی پہنچ گئیں اور آتے ہی حملہ کر دیا۔ راجگورو پنڈت گورکھ ناتھ اور سیناپتی وردھن آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

دیورائے نے یہ باتیں اس طرح سنیں جیسے وہ سپنے کی حالت میں کھڑا ہو۔ سلطان نے بیجانگر پہنچتے ہی لشکروں کو ترتیب سے پھیلا دیا تھا۔ جنگ کے خطوط کیا ہوں گے اور لشکر کس ترتیب سے حملہ کریں گے؟

یہ سب کچھ اُس نے رستہ ہی میں سوچ لیا تھا۔ وہ پہلے بھی بیجانگر آ چکا تھا اور اس قدرتی حصار سے غافل نہیں تھا۔ جس نے جنوبی ہند کے اس قلعہ کو ناقابل تسخیر، ناقابل شکست بنا دیا تھا۔ مخبروں نے یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ دس ہزار تیر انداز قلعہ کے باہر پہاڑی گھاٹیوں میں موت کے دام بچھائے بیٹھے ہیں۔ سلطان اس خاموشی کے ساتھ ان کے سروں پر پہنچ گیا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ سب سے پہلے حسن خان کے لشکر نے حملہ کیا۔ فولاد خان اور شمشیر خان موت کے فرشتوں کی طرح پہاڑی گھاٹیوں میں مورچہ بند سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں نیزوں پر رکھ لیا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ کرناٹکی سوار بہمنی لشکروں کو بڑھتے دیکھ کر قلعہ کا دروازہ کھول کر گھوڑے دوڑاتے اور حریف کی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر میدان میں نکل آئے۔ سیناپتی وردھن کا خیال تھا۔ سلطانی لشکروں نے تو ابھی دریا بھی پار نہیں کیا ہوگا۔ حملہ آور شہزادہ حسن کی وہی فوج ہوگی۔ جس کے ساتھ گھاٹ پر معرکہ ہو چکا تھا۔ سلطان نے بھی دشمن کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے جان بوجھ کر شہزادہ حسن ہی کی فوج کو آگے بڑھایا تھا۔ دراصل سورج نکلتے ہی جب سلطان کے خاص پرچم اور لشکر پہچان لئے جاتے وہ فصیل کا دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کی یہ چال کامیاب رہی صبح کے ملگجے اندھیروں میں اپنے تیر اندازوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر

سیناپتی یہ سمجھا کہ تیر انداز بہمنی فوج کو اس میدان میں گھیر کر مارنا چاہتے ہیں۔ جو پہاڑی ٹیلوں اور قلعہ کی فصیل کے درمیان واقع تھا۔ اس لئے اس نے قلعہ کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور کرناٹکی سوار بھالے لہراتے باہر نکلے۔

لیکن سیناپتی کو تھوڑی دیر میں اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ بہمنی سپاہیوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ لڑنے کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔

شہزادہ حسن کی فوج کرناٹکی تیر اندازوں کو کاٹتی اور دھکیلتی ہوئی کھلے میدان میں لے آئی۔ ادھر سے ارگو خان اور خانخاناں کے لشکر آگے بڑھے میدان میں خون ریز معرکہ چھڑ گیا اور دونوں طرف کے بہادر داد شجاعت دینے لگے۔

جونہی صبح کی روشنی میں کرناٹکی سپاہیوں نے سلطان کے سیاہ پرچموں کو لہراتے اور بہمنی لشکروں کو تین اطراف سے فصیل کی طرف بڑھتے دیکھا ان کے حوصلے پست ہو گئے کھلے میدان میں لڑنے کی بجائے وردھن نے قلعہ بند ہو جانے کو ترجیح دی اور ادھر بہمنی سواروں نے "یا نصیرؑ" اور "یا علیؑ" کے نعرے لگا کر اس شدت کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ قلعہ کی طرف بھاگا۔

اب بہمنی سواروں کو روکنے والا کون تھا؟ وجیانگر کے سپاہی کچھ ایسے بدحواس ہو کر بھاگے کہ فصیل کا دروازہ بند کرنا بھول گئے ویسے بھی پٹ بھیڑنے کا وقت گزر چکا تھا بہمنی سوار کرناٹکی بہادروں کو مارتے کاٹتے دروازہ تک پہنچ چکے تھے۔

شہزادہ حسن، فولاد خان، شمشیر خان اور ارگو خان اپنے سواروں کے ہمراہ اندر گھس گئے تھے، سلطان نے ولی عہد کو شہر میں داخل ہوتے دیکھا۔ تو اس نے خانخاناں کو فصیل سے تیر برسانے والے دشمنوں سے نپٹنے کا حکم دے کر میر فضل اللہ شیرازی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا۔

دروازہ پر گھمسان کا رن پڑا تھا۔ کرناٹکیوں نے دشمن کو روکنے کے لئے سر کٹا دیئے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شہزادہ حسن ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملے کر رہا تھا۔ بہمنی سواروں کے ساتھ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جب سلطان اور امیر فضل اللہ اپنے جانبازوں کے ہمراہ قلعہ کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت شہزادہ حسن بیجانگر کے بازار میں لڑ رہا تھا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بہمنی سوار بیجانگر میں داخل ہو گئے تھے اور کرناٹک کا ناقابل تسخیر، ناقابل شکست شہر دکنی گھوڑوں کے پاؤں تلے کانپ رہا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ وجیانگر کی سپاہ ہار گئی تھی یا کرناٹکی بہادروں کے حوصلے پست ہو گئے تھے بیجانگر کے قلعہ میں اس وقت بھی پچاس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادہ سپاہی لڑنے یا کٹ مرنے کے لئے تیار تھے۔ بازاروں اور قلعہ کی فصیل کے آس پاس جنگ جاری تھی۔ کرناٹکی سورماؤں نے سلطان فیروز شاہ کو جنگی لباس پہنے فصیل کے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور موت کی ایک ٹھنڈی لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتے ہوئے محسوس کی تھی۔

وہ حیران تھے۔ دیورائے کہاں ہے؟ اس وقت جب اسے میدان جنگ میں اپنی فوج کے درمیان ہونا چاہیے تھا۔ وجے نگر کا وہ زرنگار چتر کہیں بھی نظر نہ آتا تھا جس کے نیچے دیورائے جلوہ آرا ہوا کرتا تھا۔

”کہیں مہاراج راج محل کے کسی جھروکے سے لڑائی کا نظارہ نہ دیکھ رہے ہوں؟“

سپاہیوں کی نظریں راج محل کے جھروکے پہ بکھر گئیں لیکن چند عورتوں کے خوفزدہ چہروں کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہ آیا۔

”مہاراج کہاں چلے گئے؟“

ایک سپاہی نے دوسرے سے پوچھا، دوسرے نے تیسرے سے، تیسرے نے چوتھے سے اور اس طرح یہ تشویش انگیز سوال ساری فوج میں گشت کرنے لگا۔

سیناپتی اور راجگورو نہایت تیزی کے ساتھ راج محل کی طرف بھاگے، سنکھ ابھی تک پھونکے جا رہے تھے۔

سپاہیوں کے شور و غل، زخمیوں کی چیخوں، گھوڑوں کی ہنہناہٹوں، نعروں اور جے کاروں سے بیجانگر کے در و دیوار لرز رہے تھے لیکن مہاراج دیورائے دارو پئے نیند کے اتھاہ ساگر میں ڈوبا ہوا تھا۔



اب جب چندر کلا نے اُسے جھنجھوڑ کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا تو بیجانگر کو بہمنی سواروں کی زد... دیکھ کر تڑپ اٹھا اور لپک کر اس کمرے میں آیا جہاں راجگورو اور سیناپتی

بڑی بے تابی، بے قراری کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"مہاراج کی جے ہو۔"

وردھن دیورائے کو دیکھتے ہی جھک گیا۔"مہابلی! میدان کو پدھاریئے ہمارے سپاہی لڑنے مرنے کی سوگند کھا چکے ہیں آپ کو نہ دیکھ کر ان کی چِتا بڑھ رہی ہے اس سے مہاراج کو سینا کے درمیان ہونا چاہیے۔"

"مگر وردھن! یہ سلطان صبح ہی صبح کہاں سے آ ٹپکا؟ ہم نے تو سنا تھا اس نے ابھی دریا بھی پار نہیں کیا۔"

"وہ خبر غلط تھی مہابلی! سلطان نے رات ہی دریا عبور کیا۔ ایک پل رُکے بنا آج گجر دم یہاں آ پہنچا اور آتے ہی نقارے پر چوٹ لگائی لیکن مہاراج! یہ باتیں کرنے کا سمے نہیں آپ کو......"

"تم چلو وردھن! ہم ابھی آتے ہیں لیکن سینا میں ہمارے پہنچنے کا اعلان کر دو جب ہم فصیل تک آئیں تو سواگت کے سنکھ پھونکے جائیں۔ جیکارے بلند ہوں اور ہمارا زرد جھنڈا فضا میں لہرایا جائے۔ اس کارروائی سے سینا کے اندر نیا جوش پیدا ہوگا۔ تم سمجھ گئے نا......"

"سمجھ گیا مہاراج۔"

وردھن نے گردن جھکائی اور الٹے قدموں باہر نکل آیا۔ دیورائے نے ابھی تک راجگورو کو دیکھا ہی نہ تھا۔ جب وہ پلٹا تو سامنے پنڈت گورکھ ناتھ کھڑا تھا۔

"راجگورو!"

راجگورو کی آنکھوں میں ویرانیاں رقص کر رہی تھیں۔

"مدگل پر چڑھائی سے پہلے ہی میں نے مہاراج کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"تو اس کے لیے ہم نے تمھیں کب دوش دیا ہے۔" دیورائے بوڑھے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔"ابھی سلطان ہمارے سپاہیوں سے لڑا ہے ہم سے نہیں لڑا۔ آج ہم اُسے ایک سبق دیں گے۔"

آبنوس کے درخت کے پاس کھڑی چندر کلا کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی، جیسے وہ اپنے باپ کے الفاظ سن کر مطمئن ہو گئی تھی۔

"نہ جانے کیوں میرے من کی چنتا بڑھتی جا رہی ہے۔" پنڈت گورکھ ناتھ نے تشویش انگیز لہجے میں کہا اور نگاہیں فرش پر گاڑھ لیں۔

"راجگورو!"

دیورائے غصہ سے چیخ اٹھا "اس سے تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں تم جانتے ہو ہم تمہاری چنتا پر دھیان دے سکیں گے۔ سنو! اگر ہم جیت نہ سکے تو ہاریں گے بھی نہیں۔"

"مہاراج میرا مطلب نہیں سمجھے، میں جنگ سے پریشان نہیں ہوں لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا......"

"بس ہم کچھ نہیں سننا چاہتے، اس سے تمہیں صرف ہماری جے پکارنی ہوگی۔"

"مہاراج کی جے ہو، حملہ ہو گیا۔"

دیورائے کی پشت سے باریک سی آواز سنائی دی، یہ راج محل کا وہی طوطا تھا جس نے "مہاراج کی جے ہو" کا سبق رٹ رکھا تھا۔ پھر وہ "ٹیں ٹیں......" کی آواز میں بولنے لگا۔ "حملہ ہو گیا" یہ لفظ اس نے چندر کلا سے اڑائے تھے۔

دیورائے نے گردن موڑی اور مسکرا کر طوطے کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کا پنجرہ برآمدے کی محراب میں لٹک رہا تھا۔

"کلنٹھ مہاراج! یاد رکھو اگر ہماری جے نہ ہوئی تو ہم تمہاری گردن مروڑ دیں گے۔"

اتنے میں چندر کلا کے اشارہ پر دو دیوداسیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور مہاراج دیورائے کو جنگی لباس پہنانے لگیں، سنکھوں کی آواز بند ہو چکی تھی البتہ فصیل کے اندر زخمیوں کی چیخ و پکار میں ملی جلی آہنی ہتھیاروں کے کھنکھنانے کی آوازیں ضرور سنائی دے رہی تھیں۔



10

راجکماری چندر کلا

دریچے کی حسینہ

دیورائے کی سواگت نے واقعی بھڑکتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔

جونہی سنکھوں کی مترنم آواز میں زرد پھریرا بلند ہوا۔ بیجانگر کی فضائیں "جے بجرنگ بلی" کے جیکاروں سے گونج اٹھیں پھر "مہاراج دیورائے کی جے" کا شور بلند ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا دیورائے نہیں آیا۔ اس نے کوئی قلعہ فتح کرلیا ہے یا کرناٹکی فوج کو کہیں سے کمک آپہنچی ہے۔

بہمنی سپاہیوں نے حیرت و تعجب کے ساتھ یہ نعرے سنے وہ سمجھنے سے قاصر تھے یہ نعرے کس ناگہانی خوشی میں بلند کیے گئے ہیں۔ ادھر فولاد خان نے بھی جو سب سے آگے دستہ کی کمان کر رہا تھا۔ سنبھل کر "اللہ اکبر" اور "یا نصیر" کے نعرے بلند کیے۔

سورج تین چار نیزے بلند ہو چکا تھا اور موسم سرما کے آفتاب کی شعاعوں میں تمازت پیدا ہو گئی تھی۔ لڑائی کا زور اب شہر کی دوسری فصیل پر تھا۔ جس کا دروازہ شیشم کے موٹے موٹے تختوں پر فولاد کی پتریں جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ چوبی تختوں میں موٹے بھاری کیل پیوست تھے، جن کی ٹوپیاں باہر کو ابھری ہوئی تھیں، شہر کی دوسری فصیل پر بھی تیر انداز فصیل کے کنگوروں کے عقب میں بیٹھے تیر برسا رہے تھے جن سے بہمنی سواروں کے گھوڑے زخمی ہو رہے تھے۔ فصیل کے نیچے دست بدست لڑائی ہو رہی تھی اور کرناٹکی سوار بہمنی بہادروں کا راستہ روکے گویا موت سے جنگ لڑ رہے تھے۔

دکنی فوج کے دو مہابت اپنے ہاتھی لے کر فصیل کے اندر گھس آئے تھے اور اب ان ہاتھیوں کو دوسری فصیل کا دروازہ توڑنے پر لگا دیا گیا تھا۔

راج محل کے جھروکوں سے کئی نسوانی آنکھیں دوسری فصیل کے دروازہ پر کشت و خون کا نظارہ کر رہی تھیں۔ یہاں سے راج محل کے دو منزلہ جھرو کے اور غرفے صاف دکھائی دے رہے تھے، بہمنی لشکروں کا حملہ کچھ ایسا اچانک اور حیرت انگیز تھا کہ بیجانگر کے راج رتواس کی رانیاں، راجکماریاں اور دیوداسیاں بے اختیار کھڑکیوں، دریچوں اور جھروکوں میں آ کھڑی ہوئی تھیں، ان کی نگاہیں لڑتے مرتے گرتے اور زخمی ہوتے ہوئے سپاہیوں پر تھیں اور دل خوف و اضطراب سے دھڑک رہے تھے، سلطان فیروز شاہ کی شخصیت بیجانگر کے مردوں ہی میں نہیں عورتوں میں بھی شہرت رکھتی تھی۔ ممکن ہے راج محل کی کھڑکیوں سے وہ صرف سلطان دکن ہی کو دیکھنے آئی ہوں۔

سلطان لوہے کا لباس پہنے سفید کوتل گھوڑے پر سوار تھا۔ میدان جنگ میں وہ دیوانے کی طرح چہرے لے کر تیں چلتا تھا لیکن بہمنی سواروں میں وہ دور ہی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

دیوانے کے آتے ہی گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔

دونوں فصیلوں کے درمیان ایک فرلانگ کا فاصلہ ہو گا جو حریف سپاہیوں سے اٹا ہوا تھا۔ بہمنی لشکر کو پیچھے سے خطرہ نہیں رہا تھا۔ سلطان نے آتے ہی سپاہیوں کو سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھنے کا حکم دیا اور اب پہلی فصیل کے دروازے پر بہمنی پرچم لہرا رہے تھے مگر دوسری فصیل پر لڑائی ابھی تک جاری تھی۔ اسی دوران چند سپاہیوں نے کمانوں کے چلے چڑھائے اور راج محل کی کھڑکیوں کا نشانہ باندھا۔ اچانک سلطان کی نگاہ پڑ گئی اس نے غضب آلود نگاہوں سے تیر اندازوں کی طرف دیکھا اور غصہ میں پکارا۔

"خبردار! اگر تم نے عورتوں پر تیر چلائے تو اچھا نہ ہو گا۔ ہم تمہیں سزا بھی دے سکتے ہیں۔"

تیر انداز فوراً سنبھل گئے اور انہوں نے شرمسار ہو کر گردنیں جھکا لیں۔

"یاد رکھو! مرد صرف مردوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔"

اس کے فوراً بعد سلطان نے اعلان کرا دیا۔ "بیجانگر کے راج محل کی کھڑکیاں، دریچے

اور جھروکے کھلے ہیں۔ کوئی شخص نہ ادھر دیکھے نہ تیر چلائے۔ ہم دیورائے کی عورتوں کی عزت کریں گے۔"

اچانک "یا نصیر" کا غلغلہ بلند ہوا۔ دونوں ہاتھیوں نے مل کر دوسری فصیل کا دروازہ توڑ گرایا تھا۔ وجیانگر کے سپاہی بھوکے بھیڑیوں کی طرح لپکے اور ایک آن کے اندر بیسیوں تلواریں خون میں ڈوب گئیں۔ سلطان نے سواروں کو آگے بڑھایا وہ اپنے گھوڑے کداتے کرناٹکی سپاہیوں کو روندتے ہوئے نکل گئے۔

دوسرے دروازہ کی شکست کا مطلب بیجانگر کی شکست تھی دیورائے نے دور بلند فصیل سے بہمنی سواروں کو دروازہ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ تو بڑے غصے سے ہاتھ لہرایا اس کے ساتھ ہی کرناٹکی سورماؤں کا ایک دستہ آگے بڑھا اور اس نے دیوار کی طرح جم کر راستہ روک لیا۔

شہزادہ حسن، فولاد خان، شمشیر خان اور امیر فضل اللہ شہر میں گھس گئے تھے جب سلطان شہر کے اندر نمودار ہوا۔ امیر فضل اللہ کے بیٹے نے "سلطان معظم زندہ باد" کا نعرہ بلند کیا۔

کرناٹکی سپاہیوں نے گھبرا کر سلطان کو دیکھا جو نیزہ ہاتھ میں لئے بڑھا آ رہا تھا مگر بھاگنے کی بجائے انہوں نے موت کو ترجیح دی۔ پھر یہاں سے بھاگ کر وہ جا بھی کہاں سکتے تھے؟

راج محل کے سامنے دیورائے اپنے دستۂ خاص کے بہادروں کے ساتھ موجود تھا سلطانی لشکر نے آگے بڑھ کر اس لشکر پر حملہ کیا پھر سلطان نے اپنا بازو لہرایا اور سپاہ کو خاص اشارہ کرنے ہی والا تھا جس کے بعد دیورائے اور اس کی فوج کا موت کے دائرے سے بچ نکلنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا کہ ناگاہ راج محل کی دوسری منزل کے دریچے سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور سلطان کے بائیں شانے میں پیوست ہو کے رہ گیا۔

اس کا بازو اوپر ہی اٹھا رہا۔

راج محل کی دوسری منزل کے دریچے میں ایک حسین و جمیل لڑکی کمان سنبھالے کھڑی تھی۔ جس کے کندھوں پر ترکش لٹک رہا تھا۔ سلطان پر تیر اُسی نے چلایا تھا وہ راجکماری چندر کلا کے سوا دوسری کوئی نہ تھی۔

سلطان نے راج محل کے دریچے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

پھر اس نے دائیں ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکالا اور اپنی پیٹی میں اڑس لیا۔ بائیں شانے سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ سلطان کا زرہ بکتر رنگین ہونے لگا۔

امیر فضل اللہ سلطان کے زخمی ہونے پر تڑپ اٹھا۔ اس نے تیر چلانے والی کو بھی دیکھ لیا اور پھر جلدی جلدی کمان کا چلہ چڑھانے لگا۔ اس کا رخ راج محل کے اسی دریچہ کی طرف تھا جہاں سے تیر آیا تھا۔

سلطان دور ہی سے چلایا۔

"امیر! تمہیں خدا کی قسم ہے اگر تم نے تیر چلایا۔"

مجبوراً امیر فضل اللہ نے اپنا بازو جھٹک دیا اور دریچے پر قہر آلود نگاہیں پھینکتا ہوا سلطان کی طرف بڑھا لیکن جب تک وہ پہنچا ہشیار عین الملک اس کے شانے پر پٹی باندھ چکا تھا۔

چندر کلا نے راج محل کے دریچے سے سارا منظر دیکھ لیا تھا نجانے اس کے جی میں کیا آئی۔ اس نے دوسرا تیر نہیں چلایا بس ایک لحہ ساکت خاموش کھڑی سلطان کو دیکھتی رہی پھر تیزی کے ساتھ پلٹی اور بیجانگر کے راج محل کی دوسری منزل پر دریچے کے پٹ بند ہو گئے۔

یہ راجکماری چندر کلا کا کمرہ تھا۔

سلطان کی زرہ بکتر اور قبا پر لہو کے سرخ دھبے گہرے ہو گئے۔ اچانک اس نے گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔ کرناٹکی سواروں کا ایک تازہ دم دستہ ہے بجرنگ بلی کے جیکارے لگاتا بہمنی سواروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور ایک ساتھ کئی خارا شگاف تلواریں سلطان کے اردگرد بجلی کی طرح کوند گئیں۔

اچانک راج محل کے دریچے کے پٹ پھر کھلے اور چندر کلا کا حسین، سندر اور درخشاں چہرہ پھر نظر آیا۔ جس پر ایک لطیف اور دلنواز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی لیکن فوراً ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ دریچے کے پٹ بھیڑ لئے۔

شاید اُس کی نگاہیں اس بھیانک جگر خراش اور لرزہ خیز نظارے کی تاب نہ لا سکیں جس کی ہلکی سی جھلک اس نے دریچے سے دیکھی تھی۔

سلطان کا نیزہ بیک وقت دو کرناٹکی سپاہیوں کے پیٹ پھاڑتا ہوا نکل گیا تھا اور وہ

اس میں یوں پروئے جا چکے تھے۔ جیسے سیخ پر دو پرندے پروئے جاتے ہیں۔

امانت لوٹا دی

یک لخت شہر میں گھسے ہوئے بہمنی سپاہیوں کو بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا۔

شہزادہ حسن کے لشکر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیلنے لگی تھی کہ سلطان معظم تیر لگنے سے زخمی ہو گئے اور ابھی اچھی طرح سنبھلنے نہ پائے تھے کہ مہاراجہ دیورائے کے اشارے پر وردھن خونخوار ترین سواروں کا دستہ لے کر سلطان پر جھپٹا۔ اس قیامت خیز حملہ میں سلطان اپنے لشکر سے کٹ گئے۔ جس کے بعد ان کی کوئی خبر معلوم نہ ہو سکی، کوئی بھی نہیں جانتا سلطان زندہ ہیں یا شہید ہو گئے؟

یہ خبر فوج میں سراسیمگی پھیلا دینے کے لئے کافی تھی۔ شہزادہ حسن سنتے ہی تڑپ اٹھا۔ فوراً ہی وہ سوار شہزادہ کے سامنے پیش کر دیا گیا جو یہ روح فرسا اطلاع لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے سلطان کو زخمی ہوتے دیکھا۔ تیر راج کے ایک دریچہ سے آیا تھا۔ جو شانے میں کھب گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے امیر فضل اللہ اپنا گھوڑا لئے سلطان کی طرف بڑھے پھر اسی لمحے کرناٹکی سوار بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور انہوں نے بہمنی سپاہ کو کاٹ کر عالی جاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ہاں تھوڑی ہی دیر کے بعد کرناٹکی سواروں کا ایک اور دستہ وحشیانہ آوازوں کے ساتھ شور مچاتا اسی طرف لپکا تھا۔"

"اور بہمنی سواروں نے سلطان کے پاس پہنچنے کی کوشش نہیں کی؟"

"جان عالم! سوار اپنی جانوں پر کھیلنے لگے تھے لیکن دشمن نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔"

حسن کے ماتھے پر فکر کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ اس وقت وہ سب میدان جنگ میں تھے اور جنگ میں ایسی کوئی بات غیر ممکن نہیں تھی۔ اب آگے بڑھنا فضول تھا کیونکہ عقب پر ایک لرزہ خیز واقعہ ہو گزرا تھا۔ اس نے فولاد خان کو حکم دیا وہ فصیل کی طرف پیچھے ہٹتا چلا آئے کیونکہ سب سے پہلے سلطان کی خیریت معلوم کرنا ضروری ہے اس حکم کے

ساتھ ہی اس نے کچھ اس طرح گھوڑے کی باگ موڑی جیسے سپاہیوں کو ہدایت دے رہا ہو۔

سلطان کے زخمی ہونے کی خبر غلط نہیں تھی۔ یہ بھی درست تھا اس کے زخمی ہونے کے فوراً بعد وردھن کی قیادت میں کرناٹک کے سورمے چڑھ آئے تھے ان کا حملہ ایسا سخت اتنا منظم اور اس قدر ہوشربا تھا کہ چند جانثاروں کے علاوہ دستہ خاص کے بہادر بھی سلطان سے کٹ کے رہ گئے تھے اور اب بہمنی سپاہ کو اپنے سلطان کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔

دراصل دیورائے نے آتے ہی بھانپ لیا تھا کہ حریف شہر میں داخل ہو کر نصف فتح حاصل کر چکا ہے اور اس وقت پوری طاقت کو مقابلہ پر جھونک دینے کی ضرورت ہے، قلعہ کی برجی سے اُس نے بھی سلطان کو زخمی ہوتے دیکھ لیا تھا بس اُسی وقت اس نے وردھن کو آٹھ ہزار سواروں کے ہمراہ صرف سلطان کے دستہ پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد مہاراجہ نے ایک اور دستہ کو حملہ کا حکم دیا۔ اس کی ساری توجہ سلطان کو گھائل کر کے مارنے یا گرفتار کر لینے پر مبذول تھی۔ پھر قلعہ کے سب دروازے کھول دیئے گئے اور کرناٹکی لشکر مورو ملخ کی طرح مقابلہ پر نکلے۔

پچاس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادہ سپاہی موت کی بازی لڑنے کے لئے میدان میں اترے، ان کے درمیان ''رائے رایاں'' کے زرد پھریرے زخمی نیل کنٹھوں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے جن پر جنگلی سور کے نشان نقش تھے۔

دیورائے کے سامنے بس دو ہی پہلو تھے۔

تخت یا تختہ، زندگی یا موت

سلطان اور امیر فضل اللہ نے یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کھائی کہ دیورائے نے بازی جیتنے کے لئے اپنی پوری طاقت جنگ میں جھونک دی ہے سلطان جانتا تھا۔ اب کرناٹک کے دیوانے سورماؤں کو رستہ سے ہٹا دینا آسان کام نہیں۔ وردھن کے سواروں نے جس شدت کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا۔ وہ موت یا جیت کے سوا کسی امر کے قائل نہیں۔

سلطان کے گرد موت کا حصار ہولے ہولے تنگ ہونے لگا۔ امیر فضل اللہ نے گھوڑا دوڑا کر اس کو اپنی پشت پر لے لیا مگر دوسرے ہی لمحے سلطان خود اس کی آڑ سے نکل آیا اس کے ہاتھ میں ایک لمبا نیزہ تھا جو حملہ آوروں کے سینے چھید رہا تھا، آنکھوں میں چھپے

سی چمک تھی اور ذہن پوری بیداری کے ساتھ جنگی نقشے کے خطوط پر گھوم رہا تھا۔ اُس نے ایک ثانیہ کے لئے پلٹ کر دیکھا پھر کسی بھیانک خطرے کے احساس سے لرز اُٹھا۔

وجیانگر کے ہزاروں سپاہی فصیل سے کود کر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے اور انہوں نے بہمنی سپاہ کو پتھر کی بلند دیوار سے پرے ہی روک دیا تھا۔ اُف دیورائے کتنی خطرناک چال کھیل رہا تھا۔ فصیل کا دروازہ بند کر کے وہ بہمنی سپاہیوں کو قلعہ میں گھیر کر ہلاک کر دینا چاہتا تھا۔ دکنی لشکر تین حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے ایک حصہ فصیل سے باہر تھا۔ دوسرا شہر کی دوسری فصیل کے اندر لڑ رہا تھا۔ جس کا دروازہ بند ہونے والا تھا، اور تیسرا شہزادہ حسن کی کمان میں شہر کے اندر مصروف جنگ تھا۔ دوسرے لفظوں میں دکن کے صرف پندرہ ہزار سوار بیجانگر کے ساڑھے پانچ لاکھ سپاہیوں سے نبرد آزما تھے اور اس وقت دیورائے انہیں نہایت ہوشیاری سے شہر کے اندر ہی گھیر لینا چاہتا تھا۔

سلطان نے صورتحال بھانپ لی تھی پھر اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی شہر پر قبضہ کرنے کا خیال ترک کر کے اس نے فصیلوں سے باہر نکل جانے ہی میں بہتری سمجھی۔ اس نے امیر فضل اللہ کو اشارے سے اپنا فیصلہ بتایا لیکن موت کے اس گھیرے کو توڑ کر نکل جانا آسان کام نہیں تھا جو ہر لحظہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

شہر کے بازاروں سے ہاتھیوں کی چنگھاڑ سن کر امیر فضل اللہ بھی حیران و ششدر رہ گیا۔ دیورائے نے ایک سو جنگی ہاتھی دکنی سپاہ کو کچلنے کے لئے قلعہ سے باہر ہانک دیئے۔ لڑائی کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔

جنگی ہاتھیوں کی چنگھاڑ سن کر وردھمن کے چہرے پر مسرت کی روشنی رقص کرنے لگی۔ اب ایک بھی بہمنی سپاہی زندہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔ دوسری فصیل کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور وجیانگر کے سپاہی گیدڑوں کی طرح ہوا کتے فصیل کے اندر گھرے ہوئے بہمنی سواروں پر عقب سے تیر برسا رہے تھے۔

وردھمن نے راج محل کی دوسری منزل کی طرف دیکھا۔ راجکماری چندر کلا کے قصر کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن صرف اُسی دریچہ کے پٹ پھر کھل گئے تھے جہاں سے کچھ دیر قبل سلطان پر تیر چلایا گیا تھا۔ چندر کلا دریچے کی آبنوسی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کھڑی سلطان کی بے بسی کا نظارہ کر رہی تھی جو اپنے چند جانثاروں کے ہمراہ کرناٹکی سواروں کے نرغے میں

گھر گیا تھا۔

راجکماری کو دیکھتے ہی وردھن کی آنکھوں میں بھیڑیئے کی سی سفاکی پیدا ہوئی اس نے تلوار لہرائی اور اپنے سواروں کو للکارتا ہوا جھپٹ پڑا۔ وہ جانتا تھا دکن کے تاجدار کی موت کے ساتھ ہی جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا پھر اس کی بے مثال بہادری کرناٹک کی تاریخ کا ایک ایسا ورق بن جائے گی۔ جس پر بڑے بڑے سورما مہابیر ہمیشہ رشک کریں گے وردھن کے نیزے پر دکن کے بہادر سلطان فیروز شاہ بہمنی کا کٹا ہوا سر اسے بیجانگر کے راج دربار ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں لازوال شہرت بخش دے گا اور راجکماری چندر کلا اپنے سندر ہاتھوں سے اس کے گلے میں موتیوں کی مالا پہنائے گی سر پر سونے کا مکٹ رکھے گی اور راجکماری کا حُسن اس کے دل کے نہاں خانوں کو روشن کر دے گا۔

وردھن نے مستقبل کے تابناک اور سندر تصور میں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی بپھرے ہوئے سوار اس کے جلو میں تھے۔ قلعہ کی برجی سے خود دیورائے بھی وردھن کے سفاکانہ حملہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ شاید تصور کی آنکھ سے وہ بہمنی سلطان کا سر اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں لڑھکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

امیر فضل اللہ وردھن کے وحشیانہ ارادے کو بھانپ کر تڑپ اٹھا۔ سیناپتی کو اس جوش و خروش کے ساتھ بڑھتے دیکھ کر کرناٹکی سورما اور زیادہ دلیر ہو گئے تھے، ان کی آنکھوں میں بھی بلا کی سفاکی پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے غراتے ہوئے بھیڑیوں کی طرح جیکارہ بلند کیا۔ جیسے موت کے ہزاروں دیو کھلکھلا کر ہنس دیے ہوں یا بیجانگر کے شوالوں میں کانسی کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

بہمنی سوار نیزے تان کر کھڑے ہو گئے۔ امیر فضل اللہ ایک مرتبہ پھر سلطان کی ڈھال بن جانے کے لیے اپنا گھوڑا کداتا ہوا آگے بڑھا پھر اس نے سلطان کی غراہٹ سنی۔

"امیر! میرا راستہ چھوڑ دو۔"

پھر دوسرے ہی لمحے فضا میں ایک بھیانک چیخ گونجتی چلی گئی۔ سلطان کا نیزہ بڑھتے ہوئے وردھن کا پیٹ پھاڑ کر دوسری طرف نکل گیا تھا اور کرناٹک کا سیناپتی لوہے کے پھل میں پرو دیا جا چکا تھا۔

خوف و دہشت سے کرناٹکی سواروں نے پوری قوت کے ساتھ گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں اور تیزی سے پیچھے ہٹے۔ سلطانی جانثاروں کے نیزے بھی بیسیوں دشمنوں کے جسموں میں ترازو ہو چکے تھے اور ایک ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں لیکن وردھن کی چیخ ان سب سے زیادہ بھیانک اور روح فرسا تھی جو قلعہ کی پتھریلی دیواروں میں شگاف ڈالتی ہوئی نکل گئی۔

راج محل کی دوسری منزل کے دریچے سے ایک دہشت ناک سسکی نکل کر چیخوں میں گھل مل گئی اور دریچے کے پٹ ایک مرتبہ پھر نہایت تیزی کے ساتھ بند ہو گئے......

راجکماری چندر کلا وردھن کا یہ بھیانک انجام دیکھ کر کانپ اٹھی اور اب اسے میدان جنگ کے نظارہ کی مزید تاب نہیں رہی تھی لیکن ادھر دریچہ کے پٹ بند ہوئے ادھر ایک سنسناتا اور اڑتا ہوا تیر بند دروازہ میں آ کر کھٹاک سے پیوست ہو گیا۔

ایک ثانیہ بعد دریچے کا صرف ایک پٹ کھلا اور چندر کلا یہ دیکھ کر مبہوت و ششدر رہ گئی کہ اس کا اپنا ہی تیر جو چند لمحے پیشتر اُس کی کمان سے نکلا تھا دروازہ میں کھبا ہوا تھا۔

اُس نے بوکھلا کر نیچے نظر دوڑائی تو بہمنی سلطان اپنی کمان پشت پر ڈال رہا تھا۔

تو سلطان نے اُس کا تیر لوٹا دیا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر تیر اُکھاڑا، اس کے پھل کے ساتھ موی کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ کوئی پیغام اور چندر کلا بڑی بے تابی کے ساتھ تحریر پڑھنے لگی جو فارسی کی بجائے ہندی زبان میں لکھی گئی تھی۔

"تمہاری امانت واپس کر رہا ہوں۔ شاید تمہیں اس تیر کی پھر ضرورت پڑے۔ فیروز شاہ بہمنی"

نجانے اس تحریر میں کیا جادو تھا چندر کلا پتھر کے مجسمہ کی طرح ساکت و صامت رہ گئی پھر دوسرے پل اس کے انار کے پھلوں کی مانند سرخ ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

"فیروز شاہ بہمنی...... تو کیا سلطان ہندی لکھنا بھی جانتا ہے؟"

محاصرہ

وردھن کا حسرت ناک انجام دیکھ کر دیورائے کے چہرے پر خوف کی زردیاں چھا گئیں اور اسے اپنے جسم میں ایک خنک سی لہر سرسراتے ہوئے محسوس ہوئی۔ یقیناً یہ موت کا خوف تھا جو خنک لہر بن کر اس کے جسم میں دوڑ گیا تھا۔

کسی بہمنی سوار نے ایک تیر وردھن کے گھوڑے کی گردن میں بھی پیوست کر دیا تھا
اور اب بدکا ہوا زخمی گھوڑا کرناٹکی صفوں میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ وردھن کی لاش الٹ گئی تھی۔
مگر اس کا ایک پاؤں رکاب میں اس بُری طرح اڑ گیا تھا کہ لاش گھوڑے کے ساتھ ساتھ
گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ وردھن کے جسم میں پرویا ہوا نیزہ بار بار گھوڑے کی ٹانگوں سے ٹکرا
جاتا تھا جس سے وہ اور زیادہ بھڑک اٹھتا اور بے تحاشا بھاگنے لگتا تھا۔

سیناپتی کی لاش دیکھ کر کرناٹکی سواروں کی ہمتیں ٹوٹنے لگیں۔ موت آنکھوں میں ناچ
اٹھی اور پیچھے ہٹتے گئے۔ اس وقت وجیانگر کی فوج میں عجیب سی افراتفری پھیل رہی تھی۔
چند سوار سیناپتی کی لاش سنبھالنے کے لئے سرکش زخمی گھوڑے کو گھیرنے لگے۔ جس سے
سب صفیں درہم برہم ہو کے رہ گئیں۔

اس حملے میں کرناٹک کے کئی چیدہ چیدہ سورما ہلاک ہوئے تھے اور صدمہ و حیرت نے
دشمن کو بری طرح بوکھلا دیا تھا۔ ان لمحوں سے فائدہ اٹھا کر سلطان کا اپنے لشکر سے جا ملنا
کچھ مشکل نہ تھا۔ بیدار نظام الملک نے دکن کے سیاہ پرچم کو جھٹکا دیا اور سلطان اپنے
جاں نثاروں کی معیت میں فصیل کی طرف بڑھا جہاں خانخاناں اور ارگوخان دشمن کے سروں پر
موت بن کر نازل ہو رہے تھے۔ سلطانی پرچم کو دیکھ کر ارگوخان نے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند
کیا اور بہمنی سپاہی جہاں کہیں بھی تھے نعرے کا جواب دینے لگے۔

شہزادہ حسن اور فولاد خان کے دستے بھی شہر سے لوٹ کر فصیل کی طرف بڑھ رہے
تھے جن کے پیچھے "سیاہ موت" چنگھاڑتی ہوئی بھاگی آ رہی تھی۔

سلطان کے خاص پرچم کو لہراتے دیکھ کر ولی عہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اب
وہ شہر سے اتنا پیچھے ہٹ آیا تھا کہ دوبارہ آگے بڑھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔
ہاتھیوں کی فوج اس کے لشکر کے تعاقب میں تھی۔ فولاد خان کو ہدایت دے کر وہ گھوڑا دوڑا
سلطان کے حضور آ پہنچا اور اس کا حکم سننے کے لئے جھک گیا۔

"ہم آج شہر پر قبضہ نہیں کریں گے۔" سلطان نے اسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا
فوج کو لے کر نکل جاؤ۔"

پھر سلطان نے اپنا گھوڑا فصیل کی طرف موڑ لیا اور شہزادہ اپنے لشکر کی طرف بڑھ
ہاتھی اب بہت قریب آ گئے تھے اور فولاد خان کے سپاہی ان پر تیر برسا رہے تھے

تیروں سے ہاتھیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ "سیاہ موت" سے پیچھا چھڑانے کے لئے شہزادہ حسن کی تجویز بڑی عجیب و غریب تھی۔ چند گھوڑوں پر سیاہ کپڑے کی "جھولیں" ڈال کر اور گلوں میں گھنگھرو اور گھنٹیاں باندھ کر انہیں ہاتھیوں کی طرف ہانک دیا گیا پھر فولاد خان چالیس پچاس سواروں کو لے کر "سیاہ موت" پر حملہ آور ہوا اور سپاہیوں کو ہدایت کی گئی تھی وہ تلوار کا بھرپور ہاتھ مار کر ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹنے کی کوشش کریں۔

تجویز کارآمد ثابت ہوئی۔ پہلے ہی حملہ میں آٹھ دس ہاتھیوں کی سونڈیں کٹ کر زمین پر گریں اور وہ بھیانک آواز میں چنگھاڑتے ہوئے منہ پھیر کر واپس بھاگے۔ سیاہ جھولوں والے گھوڑے بھاگتے ہوئے ہاتھیوں کے پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ آن کی آن میں نقشہ پلٹ گیا۔ زخمی ساتھیوں کو دیکھ کر ہاتھیوں کی پوری فوج پلٹ پڑی اور مہاوتوں کی ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنی ہی سپاہ کو روندتے ہوئے قلعہ کی طرف بھاگ نکلے۔

ہاتھیوں کے پیچھے جو لشکر جرار بڑھا آ رہا تھا۔ اس میں اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ دیورائے کے ہاتھی بھی اس وقت پورس کے ہاتھی ثابت ہو رہے تھے۔ جن کے قدموں سے ہزاروں سپاہی کچلے گئے۔ ان گنت انسانوں کی ہڈیاں کڑکڑا کر چور ہو گئیں۔

اس غیر متوقع صورتحال سے کرناٹکیوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ سیناپتی وردھن اور فوج کے بہادر سورماؤں کی بھیانک موت ہاتھیوں کی شکست اور پیادہ لشکریوں کی تباہی نے بیجانگر میں قیامت بپا کر دی تھی اور دیورائے ہارے ہوئے جواری کی طرح قلعہ کی برجی پر کھڑا شاید اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ وہ اپنی ہی جنگی چال کا شکار ہو گیا تھا۔

سلطان اگر چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر اور قلعہ پر بیک وقت حملہ کر کے اپنی آمد کا مقصد پورا کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ آدھے لشکر فصیل سے باہر ہی رہ گئے تھے۔ صرف پندرہ ہزار سواروں سے ساڑھے پانچ لاکھ کی سپاہ پر فتح پانا شاید ناممکن نظر آ رہا تھا پھر سپاہی بھی تھک گئے تھے کل فیروز آباد کی روانگی سے اس وقت تک ان میں سے کسی نے بھی آرام نہیں کیا تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات سفر کرتے رہے تھے اور آرام کے بغیر ہی سلطان نے حملہ کا حکم دے دیا تھا پھر وہ کئی پہر سے بھوکے پیاسے لڑ رہے تھے۔ اس حالت میں انہیں کسی مزید امتحان میں ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ سلطان اپنی سپاہ کا ہمیشہ خیال رکھتا اور یقینی ضرورت کے بغیر اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالتا تھا۔ اس وقت

واپسی ہی غنیمت تھی۔ اس نے اندرونی فصیلوں کو بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے اور سپاہ کے تازہ دم ہونے کے بعد وہ کسی وقت بھی شہر پر دوبارہ حملہ کر سکتا تھا۔

دوسری فصیل کا دروازہ پھر کھل گیا تھا اور بہمنی سوار کرناٹکی سپاہیوں کو مارتے کاٹتے لوٹ رہے تھے۔

بیجانگر کے بازار اور میدان لاشوں اور زخمیوں سے اٹے پڑے تھے۔ زمین لالہ زار ہو رہی تھی۔ مدگل کی سرزمین پر بہنے والے لہو کے قطرے رنگ لائے تھے اور بیجانگر کی مٹی اپنے سورماؤں کے خون سے بھیگ چکی تھی۔ دیورائے کو اپنے شہر اپنے ہی گھر میں اپنی حماقت کا ایک اور جواب مل گیا تھا۔

مہاراجہ کے حکم پر کرناٹکی سپاہ نے دکن کے لوٹتے ہوئے سواروں کا تعاقب کیا لیکن شاید وہ بھول گیا تھا۔ ارگو خان اپنے بہادروں کے ہمراہ فصیل کے ساتھ موت کو سنید لگائے بیٹھا ہے۔ جونہی کرناٹکی سپاہی آگے بڑھے دکن کے تیر ان کے سینوں میں پیوست ہونے لگے۔ بہمنی لشکر بیجانگر کی دیواروں کے حصار سے نکل کر آئے جب شہزادہ حسن اور فولاد خان اپنے دستوں کو لے کر باہر آ گئے تو ارگو خان بھی اپنی کمین گاہ چھوڑ کر باہر کی طرف لپکا دیورائے کا خیال تھا۔ فصیل سے باہر نکلتے ہی تعاقب کیا جائے اس طرح وہ اپنے نقصان کی تلافی کر سکے گا پھر جیسے بجلی کے کوندے لپک جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرناٹک کے بیس ہزار سوار گھوڑے دوڑاتے باہر نکل آئے اور لوٹتے ہوئے بہمنی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے لیکن مہاراجہ کو تعاقب کی یہ غلطی شاید زندگی بھر یاد رہی ہوگی۔ جونہی کرناٹکی سوار دروازہ سے باہر نکلے۔ آس پاس پہاڑی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے کوسل رائے اور قباچہ خان کے سپاہی اُن کے لئے موت کا پیغام بن گئے اور تین ہزار سپاہیوں کی بھینٹ دے کر کرناٹکی سوار پھر فصیل کے اندر جا گھسے، قلعہ کا دروازہ بند کر لیا گیا۔

پہاڑی گھاٹیوں کو عبور کر کے سلطان بیجانگر کے سامنے میدان میں آ گیا جہاں اس نے مجھر دم پڑاؤ ڈالا تھا۔ اگرچہ وہ پسپا ہو کر آیا تھا لیکن یہ پسپائی بھی دشمن ہی کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ اگر اُس نے تھوڑا سا جوا کھیلا ہوتا تو شہر پر قبضہ بھی کر لیا ہوتا لیکن جنگی اعتبار سے اس پسپائی میں بھی اُسی کا ہاتھ غالب رہا تھا۔ گھوڑے سے اترتے ہی اُس نے

سپاہیوں کو ہتھیار کھولنے اور آرام کرنے کا حکم دیا اور خود نہایت تیزی کے ساتھ خیمہ میں گھس گیا۔ مہاراجہ کی فوج کے لئے وہ شہر کے اندر بہت سا کام چھوڑ آیا تھا۔

سلطانی لشکروں نے کچھ اس انداز میں خیمے نصب کیے تھے کہ بیجانگر تین اطراف سے محصور ہو گیا تھا اور طلایہ گردستے اس سے ایک میل کے فاصلہ پر آٹھوں پہر گردش کرتے رہتے تھے۔

واپسی کے وقت بھی حریف پر ایسی کاری ضرب پڑی تھی کہ اس کی طرف سے فوری حملے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ دیورائے کے لئے یہی غنیمت تھا کہ سلطان شہر پر قبضہ کا خیال ترک کر کے لوٹ گیا تھا۔ بیجانگر کے بازاروں اور میدانوں سے لاشیں اٹھائی جانے لگیں۔ شام تک کوئی گھر ایسا نہ ہو گا جہاں سے رونے کی آواز نہ اٹھی ہو۔ کرناٹک کے پندرہ ہزار سورمے بہمنی تلواروں کا لقمہ بن گئے تھے اور اس سے دو چند زخمی ہوئے تھے۔ گھر گھر میں موت کا سیاپا ہو رہا تھا۔ دیورائے کی ہوس وجیانگر کی ہزاروں سہاگنوں کے لئے بیوگی کا نوحہ بن گئی تھی۔

بہمنی سپاہیوں میں شہید ہونے والوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ لوٹتے وقت اکثر لاشیں گھوڑوں پر لاد لی گئی تھیں۔ جنہیں بیجانگر کے باہر دفن کر دیا گیا تھا لیکن جو لاشیں شہر کے اندر رہ گئیں۔ دیورائے نے ان کے ساتھ درندگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ راجگورو پنڈت گورکھ ناتھ کے مشورہ پر انہیں کرناٹکی مردوں کے ساتھ جلایا نہیں گیا۔ بلکہ گڑھے کھود کر دفنا دیا گیا دوسرے روز دیورائے نے سلطان کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی جس میں یہ پیغام تھا۔

''سلطان کو معلوم ہونا چاہیے ہم نے ان کے سپاہیوں کو کفن تو نہیں دیا لیکن دفن ضرور کر دیا ہے۔''

اس پیغام میں دراصل یہ طنز تھی کہ وجیانگر کی زمین بہمنی سپاہیوں کے لئے قبرستان بن سکتی ہے۔

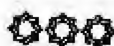
''ہم بھی دیورائے کے سپاہیوں سے اچھا سلوک کریں گے اور ان کی ارتھیاں جلانے کے لئے بیجانگر کی لکڑیاں استعمال میں لائیں گے۔''

اس جواب کے ساتھ سلطان نے سفیر کو واپس کر دیا اور شہر کے گرد محاصرہ کچھ اور تنگ

کر دیا۔ باہر کی دنیا کے ساتھ بیجانگر کا تعلق صرف جنوبی سمت سے قائم تھا۔ کرناٹکی فوجیں فصیل کے اندر اور بہمنی لشکر فصیل سے باہر ایک دوسرے کی تاک میں پڑے تھے۔

سلطانی سوار ہر روز آراستہ ہو کر نکلتے تھے لیکن بیجانگر کا دروازہ نہیں کھلتا تھا اور مہاراجہ کی فوجیں مقابلہ کے لئے باہر نہیں آتی تھیں۔ سلطانی لشکروں کو محاصرہ کئے پورے پانچ روز گزر گئے لیکن ابھی تک کرناٹکی سپاہ باہر نہیں نکلی تھی۔

شاید بیجانگر کے باشندے چندرہ ہزار سپاہیوں کا سوگ منا رہے تھے۔



11

محلاتی سازشیں

گہرے راز

بیگم جہاں کی خاص کنیز زرینہ قصرِ شیرازی کے ایک حُجرے میں اُودھی لیٹی تھی تین روز گزر جانے کے بعد بھی اُس کے سر کا زخم ابھی مندمل نہیں ہو سکا تھا جو قصرِ لالہ کی سیڑھیوں میں دھکا کھا کر گرنے سے اُبھر آیا تھا۔ وہ تو زرینہ کی قسمت بھلی تھی کہ گردن کا منکا نہیں ٹوٹ گیا ورنہ اس کے ہلاک ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

تعجب اس بات پر تھا۔ بیگم نے اپنی پرانی اور معتمد کنیز کے ساتھ جو گزشتہ بارہ سال سے اس کی خدمت پر مامور تھی۔ ایسا بہیمانہ سلوک کیوں کیا تھا؟ فیروز آباد ہی نہیں گلبرگہ کے محلات میں بھی زرینہ کی وفاداری اور خدمت گزاری ضرب المثل تھی پھر اچانک بیگم اُس کی جان لینے پر کیوں تل گئی؟

یہ معمہ محل سرا کی کسی خاتون کے ذہن میں نہ آسکا۔

زرینہ کے زخمی ہونے کی خبر سنتے ہی بیگم عالیہ بھاگی بھاگی قصرِ لالہ میں آئی تھی بیگم جہاں اس وقت پرتھال کے پاس بیٹھی خرگوشوں سے کھیل رہی تھی جب اس نے آتے ہی پوچھا تھا۔

"عالیہ خانم! یہ میں نے کیا خبر سنی ہے۔ کیا آپ نے واقعی زرینہ کو......"

بیگم جہاں اپنے بڑھاپے اور بزرگی کے باعث بہمنی خاندان میں "عالیہ خانم" کے معزز نام سے یاد کی جاتی تھی۔ ابھی عالیہ نے اپنا فقرہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ وہ غصہ میں

تھرتھراتے ہوئے بولی۔

''تم بھی وہی قضیہ لے کر آئی ہو عالیہ! خدا کے لئے اس ناگن کا نام نہ لو، جسے میں بارہ سال تک آستین میں پالتی رہی۔ کیا تم جانتی ہو اس نے میری مہربانیوں کا کیا صلہ دیا۔''

عالیہ نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

''وہ کتیا شیرازی کے ساتھ مل گئی تھی۔ کل رات اسی سپیرن نے بانو کے کمرے میں سانپ چھوڑا تھا۔''

''اوئی میرے پروردگار! تو یہ زرینہ ہی کا کام تھا؟''

پرتھال کے کمرے میں سانپ چھوڑنے اور اس کی بجائے مشتری کے مسموم ہونے کی خبر سارے محلات میں گردش کر رہی تھی اور اس وقت تک شیرازی کے سوا کئی بیگمات اور خواتین علیہ خانم کے قصر میں خیریت پوچھنے آ چکی تھیں۔

''مگر بانو سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔''

''تم سمجھ بھی کیسے سکتی ہو۔''

''یہی تو سمجھنا چاہتی ہوں۔''

خانم کی بوڑھی آنکھوں میں جہاں اس کی گزری ہوئی زندگی پلکوں کی اوٹ میں آرام کر رہی تھی ایک عجیب سی چمک تیرنے لگی اور اُس کی تجربہ کار نگاہوں کے تیر عالیہ کے دل میں چبھنے لگے۔

''بانو کو ہلاک کرنے میں دو مقصد تھے۔ اول تو مجھے سلطان کی نگاہوں سے گرانا کہ میں اُن کی امانت کی حفاظت نہ کر سکی۔ دوسرے تم سے کسی عداوت کا بدلہ لینا۔''

''مجھ سے......''

عالیہ یوں چونک اٹھی۔ جیسے کسی گہرے خواب سے اچانک ہی بیدار ہوئی ہو۔ اُس نے قریباً چلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا بدلہ علیہ خانم! بھلا میری خاطر کسی کا بانو کو نقصان پہنچانا کیا معنی رکھتا ہے خواہ وہ شیرازی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ راز تو میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔''

''ہے تو یہ ایک راز ہی۔''

''راز......''

"سنو گی؟"

"کیوں نہیں۔ میں بانو کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہونے دوں گی۔"

بیگم جہاں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"تو سنو! بانو تمہارے اور ولی عہد کے درمیان ایک کڑی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

حیرت سے عالیہ کی آنکھیں جنبش کرنا بھول گئیں اور اس کا چہرہ ایک سوالیہ کی شکل اختیار کر گیا۔ پرتھال کے رخسار پر حیا کی سرخی لہرائی۔ اُس نے ایک خرگوش اٹھایا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔ بیگم جہاں کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز تبسم رقص کر رہا تھا۔

"کیا مطلب بتانا باقی رہ گیا ہے؟ حسن پرتھال سے پیار کرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ شیرازی یہ راز جان گئی ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" عالیہ نے "اچھا" کو کھینچتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ابھی ابھی اس پر ایک ایسی حیرت کا انکشاف ہوا تھا جس نے اس کی قوت گویائی تک سلب کر لی پھر وہ آہستگی سے اٹھی اور اپنے قصر کی طرف چل دی اُس کے قدم یوں اٹھ رہے تھے جیسے وہ نیند کی حالت میں چل رہی ہو۔ بے سدھ، بے خبر۔

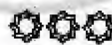
راہداری عبور کر چکنے کے بعد اس نے محسوس کیا وہ کسی ذی روح مجسمہ کے قریب سے گزر آئی ہے جو اُس سے ہمکلام ہونے کا متمنی تھا۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا پرتھال ایک محراب میں کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی عالیہ کسی خیال کے تحت ہولے ہولے چلتی ہوئی محراب کے پاس پہنچ گئی۔ پرتھال کے چہرے پر اضطراب و مسرت کے دو مختلف جذبے دن اور رات کی طرح گھل مل رہے تھے۔

"پاتو!" عالیہ کے ہونٹ کپکپائے۔ "کیا واقعی تم...... اچھا کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... کچھ نہیں......"

کوئی بات پوچھتے پوچھتے اچانک وہ رُک گئی پھر تیزی کے ساتھ مڑی اور پرتھال کو ایک نئی حیرت کے کنویں میں دھکیل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پرتھال کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے ذہن کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے مسل دیا ہو۔



بیگم جہاں کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

قصر لالہ سے نکال دیئے جانے کے بعد شیرازی اور مہر زریں نے زرینہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

اس کی چیخ کی آواز سن کر زریں فوراً ہی پہنچ گئی تھی۔ وہ شیطان تو آٹھوں پہر قصرِ لالہ کی طرف کان لگائے رکھتی تھی۔ سیڑھیوں سے گرتے ہی زرینہ کے سر پہ گہرا زخم آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے تھے اور خود بیگم جہاں بھی یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھی۔ جو ایک کھڑکی کی اوٹ سے تماشا کر رہی تھی۔

زریں نے چند خواجہ سراؤں کو بلایا اور نیم بیہوش زرینہ کو اٹھا کر اپنے حجرے میں لے آئی۔ جس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر ایک ناگن کی سی پھنکار تھی یوں معلوم ہوتا تھا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں بیگم جہاں کے خلاف کسی خوفناک سازش کا انکشاف کر دینا چاہتی ہے۔

بجلی کو اس کی خبر گیری پہ متعین کر کے زریں بیگم شیرازی کے کمرہ خاص میں داخل ہوئی۔ چند لمحے ان کے درمیان سرگوشیاں ہوتی رہیں پھر شیرازی کی آواز سنائی دی۔

لیکن سب سے پہلے اس کے زخم کا علاج ہونا چاہیے تو ذرا حکیم گیلانی کو بلا لا۔"

"حکیم گیلانی......" زریں نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم! کیا وہ کنیز کو دیکھنے آئیں گے۔"

"کیوں نہیں۔ میرا سلام کہنا۔ وہ انکار نہیں کریں گے۔ مگر تو کچھ بھی ہے، گیلانی کو بلانے کا کیا مقصد ہے۔"

"شاید زرینہ کو متاثر کرنا کہ اس کا علاج کوئی معمولی حکیم نہیں کر رہا بلکہ وہ شاہی طبیب کے زیرِ علاج ہے اس نوازش خاص کے بعد وہ ہمیشہ بیگم حضور کی احسان مند رہے گی۔"

"کمبخت! کبھی کبھی تو بھی نشانے پر تیر مارتی ہے۔"

"کبھی کبھی نہیں بیگم حضور! میرے چھوڑے ہوئے تیر اکثر نشانے پر بیٹھتے ہیں۔" زریں کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

"لیکن سلطان کے طبیب خاص کو بلانے کا ایک مقصد اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں ان سے ایک تحریر لوں گی کہ مریضہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ اگر بروقت علاج نہ ہوتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ تجھے معلوم ہے سلطان زرینہ کو چاہتے ہیں۔ شاہی طبیب کی تحریر دیکھتے ہی وہ یقیناً برافروختہ ہو جائیں گے پھر بڑھیا کے اعلیٰ اختیارات کا خاتمہ اور ہاں......"

شیرازی کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ "زرینہ کو نیا لباس پہنا دے اور اس کے خون آلود کپڑے کہیں سنبھال کے رکھ۔"

"قربانت شوم بیگم!"

جوشِ مسرت میں زریں کی چیخ سی نکل گئی۔ "آپ نے بہت دور کی سوچی ہے واللہ! یہ کھوسٹ بڑھیا ہم پر حکومت نہیں کر سکے گی۔"

پھر شیرازی کے کمرے سے نکل کر زریں طویل غلام گردشوں اور راہداریوں میں لپکتی چلی گئی جیسے سیماب کی ایک لہر تھی جس پر نگاہ بھی ٹھہر نہیں پاتی۔

تھوڑی دیر کے بعد شاہی طبیب حکیم حسن گیلانی زریں کی رہنمائی میں قصرِ شیرازی کے ایک حجرے میں داخل ہو رہا تھا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ قصرِ لالہ کی سیڑھیوں سے گرتے وقت زرینہ کو خلافِ توقع کچھ زیادہ ہی چوٹ آ گئی۔ اس وقت اگرچہ نیم بیہوشی کی کیفیت دور ہو چکی تھی پھر بھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا سر دو ٹکڑے ہو کے رہ گیا ہے اور اس وقت شدت درد سے اس مریض کی طرح کراہ رہی تھی جو موت کے دروازے پڑا زندگی کی گھڑیاں گن رہا ہو۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے گرد بیگم شیرازی اور حکیم حسن گیلانی کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

"ڈرو نہیں زرینہ! اب تم بالکل محفوظ ہو۔"

زرینہ نے بیگم شیرازی کی آواز میں شفقت اور محبت کی نرمی محسوس کی بیگم شیرازی کی نخوت یک لخت محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

مرہم لگانے اور پٹی باندھنے کے بعد حکیم گیلانی نے وہ تحریر بھی لکھ دی جس کا مضمون شیرازی نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ زرینہ چپ چاپ لیٹی سب کچھ دیکھتی رہی حکیم جا چکا تو مہر زریں نے اپنی ہمدردی کا پٹارہ کھول دیا۔

"خدا کی قسم! علیہ خانم کے علاوہ اگر کوئی دوسری بیگم تم پر یوں وار کرتی تو میرا کوڑا

اس کی کھال اکھیڑ چکا ہوتا لیکن سلطانِ معظم کی چچی ہیں۔ بھئی دودمان کی معزز و محترم ہستی اور تو جانتی ہے سلطان کے سوا کسی کو بھی ان سے باز پرس کا اختیار نہیں ہے۔"

زرینہ کے چہرے پر تشکر کی جھلک نمودار ہوئی پھر وہ مدھم آواز میں بولی۔

"زریں! میں جان دے کر بھی شیرازی کا احسان نہیں چکا سکتی۔"



تیسرے روز جب زریں شیرازی کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر مکارانہ ہنسی تھی۔

"میں نہ کہتی تھی، بیگم جہاں خود اپنے لئے پھندا تیار کر رہی ہے میں جانتی ہوں جب کسی کنیز کی وفاداریوں کا صلہ زخم کی صورت میں ملتا ہے تو اس کے اندر سوئی ہوئی ناگن اپنی زہریلی پھنکار کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔"

"تو کیا زرینہ نے تجھے کچھ بتا دیا؟" شیرازی کے لہجے کی بے قراری سے ظاہر تھا وہ کسی خوشخبری کی منتظر ہے۔

"اسے اپنی کینچلی اتارنے میں دیر نہیں لگی بیگم حضور! لیکن ڈرتی ہے کہیں راز کی بات زبان پر آجانے سے وہ اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے شاید اس کے سینہ میں کوئی گہرا راز دفن ہے۔"

زریں کی بات سن کر شیرازی اچانک کسی فکر میں ڈوب گئی۔ اس کے ذہن کے گھمبیر اندھیروں میں جیسے کوئی طلسمی چراغ آپ سے آپ روشن ہو رہا تھا۔ وہ مسہری کا پایہ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

"کوئی گہرا راز!" اس نے زریں کے الفاظ دہرائے پھر اپنی نگاہیں ایک گوشے پر مرتکز کرتے ہوئے بولی۔ "زریں! اگر اس راز کا تعلق احمد خاں خانخاناں اور شہزادہ حسن سے ہے تو یاد رکھو، یہ کنیز سونے کے تول بھی سستی ہے فوج سے روانگی سے قبل شہزادہ حسن قصرِ لالہ میں آیا تھا مگر وہ اپنی ماں عالیہ بیگم سے ملنے نہیں گیا اس کا چوری چھپے صرف بیگم جہاں سے ملنے آنا کسی علت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ میں جانتی ہوں۔ بڑھیا احمد خان کو پسند نہیں کرتی اور اس کے خلاف سلطان کے کان بھرتی رہتی ہے۔"

پھر کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک ایک دریچے کے پاس رک گئی اور سرگوشی کرتے

ہوئے بولی۔
"زریں! کیا تو نہیں چاہتی شہزادہ حسن کی بجائے کوئی دوسرا سلطان کا جانشین ہو؟"
"کیوں نہیں بیگم! کیا شہزادہ حسن سے میری نفرت ڈھکی چھپی ہے؟ مجھے تو عالیہ بیگم کے دودھ سے عداوت ہے خواہ شہزادہ کی نبضوں میں سلطان ہی کا خون کیوں نہ دوڑ رہا ہو۔"

زریں نے بڑے غصے میں اپنی نفرت کا اظہار کیا اور شیرازی نے فوراً ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔
"آہستہ زریں! خدا کے لیے آہستہ بول۔ تُو تو ایک دم چلانے لگی۔ کیا نہیں جانتی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اگر اس خبر کی بھنک بھی کسی کے کانوں میں جا پڑی تو تیرے بدن سے کھال اتر جائے گی۔"
اپنی غلطی کا احساس کر کے زرین خوف سے تھر تھرانے لگی جیسے واقعی اس کی کھال کھینچے کا حکم صادر کر دیا ہو۔ ایک لحہ چپ رہ کر بیگم نے پوچھا۔
"زرینہ کہاں ہے اس وقت؟"
"حجرے میں اوندھی پڑی ہے، شاید وہ دو روز تک چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے۔"
شیرازی نے دریچے کے پٹ کھول کر باہر جھانکا تو غلام گردش کی مشرقی جانب اُسے حجرے کا ریشمی پردہ ہلتا دکھائی دیا۔ جیسے ابھی ابھی کوئی سایہ نہایت تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ بیگم دریچہ سے سر نکالے حجرے کے پردہ کو دیکھتی رہی پھر پہلی نظر کو اپنے وہم پر محمول کر کے زریں کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔
"زریں! اگر تو زرینہ کو راز اگلنے پر مجبور کر دے تو میں تیرا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔"
"موتیوں سے آپ کی خوشنودی زیادہ قیمتی ہے۔"
یہ کہہ کر زریں مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی جب وہ سرخ پردہ ہٹا کر حجرے میں داخل ہوئی تو زرینہ بدستور اوندھے منہ لیٹی تھی مگر اس کے تیز تنفس سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کوئی سفر طے کر کے منزل پہ آئی ہو۔
مہر زریں نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا اور وہ کروٹ بدلنے لگی۔



سازش کی کڑیاں

مہر زریں نے دیکھا زرینہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھرتھرا رہی تھیں وہ اُسے بھی ایسی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ جیسے کسی انجانی دہشت سے کانپ اٹھی ہو۔ نامعلوم اس کی ان ڈری ڈری اور سہمی سہمی نگاہوں میں یہ خوف کا عکس کیسا تھا۔ اس کا ذہن کن پُراسرار گتھیوں میں اُلجھ کے رہ گیا تھا۔ وہ کیوں خوفزدہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر سہمی ہوئی خاموشیوں کا تالا کس نے ڈال دیا تھا؟

زریں کا اپنا ذہن وسوسوں اور اندیشوں کی تاریک فضا میں پرواز کرنے لگا پھر اچانک کسی خیال سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"تو کیا بیگم جہاں کا بے رحم سایہ یہاں بھی اس کا تعاقب کر رہا ہے؟

اس نے سوچا ممکن ہے اُس کی عدم موجودگی میں علیہ خانم کی کسی کنیز نے زرینہ کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی اور یہ دھمکی دی ہو کہ اُس نے اگر قصر لالہ کا کوئی راز فاش کرنے کی جسارت کی تو موت کے بے رحم ہاتھ اس کی گردن دبوچ لیں گے اور اس دھمکی نے زرینہ کو متوحش کر دیا ہو۔

چند لمحے وہ متجسس نگاہوں سے اُس کے چہرے پر خوف کے سایوں کو لرزتے ہوئے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"کیا بات ہے زرینہ! تم خوفزدہ کیوں ہو؟"

مگر زرینہ نے اب بھی زبان نہیں کھولی۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے لرز رہے تھے، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شاید کسی نامعلوم خوف نے اُس سے بولنے کی قوت چھین لی تھی، اس کے ہونٹ صرف پھڑپھڑا کے رہ گئے پھر زریں نے اچانک پوچھا۔

"میرے بعد یہاں کون آیا تھا؟"

"ک......ک......کوئی بھی نہیں۔" زرینہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

"ڈرو نہیں زرینہ! قصرِ شیرازی میں کوئی شخص تمہاری طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا شاید تمہیں کسی نے ڈرایا ہے لیکن یاد رکھو علیہ خانم کے ہاتھ یہاں نہیں پہنچ سکتے۔ اگر اُس بڑھیا نے کوئی ایسی حرکت کی تو کالا ناگ اس کو موت کی خاموش وادیوں میں لے اترے گا۔

زریں کی آواز سے نفرت کا زہر ٹپک رہا تھا کالے ناگ کا نام سنتے ہی زرینہ کے چہرے پر پھر خوف کے آثار ہویدا ہوئے، تو پرتھال کے کمرے میں سانپ واقعی زریں نے چھوڑا تھا؟ وہ اپنے آپ کو کسی اذیت ناک تصور سے دور رکھنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

"کالا ناگ" وہ مدھم اور دہشت زدہ آواز میں کہنے لگی۔

"زریں! مجھ پر مصیبت کالے ناگ ہی کے سبب آئی ہے علیہ خانم کا خیال ہے پرتھال پر میں نے سانپ چھوڑا تھا۔ لیکن......"

ایک زہر آلود قہقہہ سے حجرے کی فضا کانپ اٹھی۔

"وہ سانپ تو میں نے چھوڑا تھا۔"

زریں نے سوچا اسے اعتماد میں لے کر ہی وہ راز معلوم کر سکتی ہے جس کے لئے بیگم شیرازی اس کا منہ موتیوں سے بھرنے پر تیار ہو گئی ہے نفسیات کا بالکل ادنیٰ سا اصول ہے۔ کسی کا راز جاننے کے لئے پہلے اسے اپنے راز سے آگاہ کر دو۔ زریں نے بھی سوچ کر اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا۔

بیگم جہاں کی کنیز حیرت پاش نگاہوں سے اُسے گھور رہی تھی جیسے اُسے زریں کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

تم نے سانپ چھوڑا تھا؟ کیوں......"

"لمبی بات ہے زرینہ......!"

"لیکن میں سننا چاہتی ہوں۔ یہ بے کار وقت کسی طرح تو کٹے۔"

"میں شہزادہ حسن، اس کی ماں عالیہ اور بیگم جہاں سے نفرت کرتی ہوں۔"

"بیگم شیرازی بھی......"

"ہاں وہ بھی۔"

"لیکن نفرت کا شکار پرتھال کیوں ہوئی؟"

"اوہ...... وہ ذلیل لڑکی......" وہ غصے میں دانت پیستے ہوئے بولی۔ "زرینہ! سچ کہو کیا تم پسند کرو گی۔ ایک معمولی سنار کی لڑکی دکن کی ملکہ بن کر تم پر حکومت کرے؟ کیا ہمیں اس کی توہین نہیں؟ سب جانتے ہیں ہم ایرانی الاصل ہیں۔ کئی نسلوں سے ہمارا خون حکومت کر رہا ہے لیکن شہزادہ حسن اب ایک سنار کی لڑکی کو ہمارے سروں پر مسلط کر رہا ہے اور یہ

بددماغ بڑھیا علیہ بیگم بھی بے وقوف شہزادہ کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔"

"مگر پرتھال کو تو سلطانِ عالم نے اپنی بیٹی بنایا ہے۔" زرینہ کے لہجے میں خوف کی بجائے اب حیرت کا اظہار تھا۔

"بے شک! بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے وہ مسلمان ہو یا ہندو مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں۔ شہزادہ ایک ہندو لڑکی کو شہزادیوں پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس کا انجام خطرناک ہوگا...... بے حد خطرناک......"

"زریں! تمہارے الفاظ سے بغاوت کی بو آرہی ہے۔"

اور زریں کا قہقہہ گھنگھروؤں کے چھناکے کی طرح بکھرتا چلا گیا۔ ہنستے وقت اس کی گول گول آنکھیں بڑی خوفناک ہوگئی تھیں۔ جن میں نفرت و حقارت کی بجلیاں سی کوند رہی تھیں اس کا کتابی چہرہ جو عام خواجہ سراؤں کی بہ نسبت خوبصورت، دلکش اور بارعب بھی تھا۔ اس وقت اس عیار مسخرے کی مانند مضحکہ خیز نظر آرہا تھا جو دوسروں پر قہقہے لگا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے مگر یہ عجیب ہنسی تھی۔ زرینہ کو محسوس ہوا جیسے اس بھیانک ہنسی کی لہریں اس کے سراپا میں انگارے بھرتی چلی جارہی ہیں اچانک زریں اس کے بدن پر جھکتے ہوئے بولی۔

"بغاوت کی بو...... ہی ہی ہی ہی...... تم ٹھیک کہتی ہو زرینہ! صرف الفاظ سے نہیں ذرا سونگھ کر دیکھو میرے جسم کے ہر ذرہ سے تمہیں بغاوت کی بو آئے گی۔ آہا بغاوت کتنا خوبصورت لفظ ہے جب یہ ان بے وقوف شہزادوں کے خلاف استعمال کیا جائے جو حکومت کی خاطر تلوار کی بجائے عورت کے حُسن پر بھروسا کر لیتے ہیں۔"

زرینہ کو اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ بیٹھے بٹھائے وہ کس جنجال میں آ پھنسی تھی۔ بیگم جہاں نے اُسے صرف ایک سانپ کا راز معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا لیکن قصر شیرازی میں تو ہر طرف سانپ ہی سانپ رینگ رہے تھے۔ سازشی ناگ اور زریں اسے بھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ بیگم شیرازی کے پھیلائے ہوئے دام میں پھانس رہی تھی۔ اُس نے سوچا یہاں تو نیولے کی سی چالاکی سے کام لینا پڑے گا۔

"لیکن تمہیں حکومت کے بکھیڑوں سے کیا مطلب؟" اس نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے زریں کو دیکھا جس کے چہرے پر شیطانی ہنسی اب زہریلی مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی

تھی۔ تمہارا کام تو صرف محلات کی نگہداشت ہے کیا یہ اعزاز کچھ کم ہے تم بیگمات پر حکومت کرتی ہو بغاوت سے تمہیں اور کیا مل جائے گا۔"

"کنیزوں کے دماغ بغاوت کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتے زرینہ! وہ صرف تسلیم و اطاعت کی عادی ہوتی ہیں۔ محرم راز بنا جانتی ہیں مگر سر پر زخم کھانے کے بعد بھی افشائے راز سے ڈرتی ہیں مبادا ان پر کوئی بجلی ٹوٹ پڑے۔"

"زریں......"

"زری! کیا میں تمہیں جانتی۔ تم ابھی تک مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔" زریں نے بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "اپنے سینہ کو کسی راز کی قبر نہ بناؤ۔ دل کا بوجھ ہلکا کر دو جو کچھ جانتی ہو مجھ سے کہہ دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ تمہاری جان کی حفاظت کی جائے گی۔"

زرینہ نے حیرت پاش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن فوراً کسی خیال سے سنبھل گئی شاید سانپ اور نیولے کی لڑائی یاد آ گئی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولی "لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ خانخاناں کے متعلق بیگم شیرازی کی کیا رائے ہے؟"

یہ کہہ کر زرینہ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی اس نے اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا۔ زریں خوشی سے ایک دم اچھل پڑی جیسے اس نے کسی خزانہ کا سراغ لگا لیا ہو۔

"ہم خانخاناں کو شہزادہ حسن سے بہتر سمجھتے ہیں اور ہر کوئی جانتا ہے دو دعویداروں میں سے صرف ایک ہی زندہ رہ سکتا ہے۔"

"میں ڈرتی ہوں زریں! یہ کہیں مدعی سست اور گواہ چست والی مثال نہ ہو۔" زرینہ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ پانسہ پھینکا۔ "اگر خانخاناں کو شیرازی کی کارگزاریوں کا علم ہی نہ ہو سکا تو ان باتوں سے کیا حاصل...... زندگی ہر کسی کو پیاری ہے۔"

"واہ...... علم کیسے نہیں۔ بیجانگر کی طرف کوچ کرنے سے پہلے ہی سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ بیگم شیرازی اندھیرے میں تیر چلانے کی عادی نہیں۔" پھر زریں نے اس آہستگی سے کہ زرینہ بھی اس کی آواز بمشکل ہی سن سکی، کہا۔

"بیجانگر سے شہزادہ حسن زندہ بچ کر نہیں آئے گا۔ موت اس کے ساتھ روانہ ہو چکی ہے۔"

زرینہ نے اپنی حیرت پر بڑی مشکل سے قابو پایا پھر بولی۔

"میں سمجھ نہیں سکی۔"

"کالا ناگ......" زریں کے چہرے پہ نفرت رینگنے لگی۔ اس نے تیز نظروں سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ "لیکن یاد رکھو تمہاری زبان بند رہے گی۔"

"مجھ پر اعتماد رکھو، بیگم شیرازی کا احسان اس راز سے زیادہ قیمتی ہے۔"

زرینہ کے لہجے میں اعتماد کی جھلک تھی لیکن کالے ناگ کا یہ نیا مصرف جان لینے کے بعد اس کا دل سینے کے اندر کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی یہاں سے اڑ کر نکل جائے اور بیگم جہاں کو ان بھیانک خطروں سے آگاہ کر دے جو جان عالم کے آس پاس رینگ رہے تھے۔

"اور ہاں...... اب میں تمہارے سینہ کا راز معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ جس کی خاطر بیگم جہاں نے تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔"

زرینہ حیران تھی وہ کیا جواب دے، زریں اور بیگم شیرازی شروع ہی سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھیں کہ وہ کسی ایسے راز سے واقف ہے جو شہزادہ حسن اور سلطان کے بھائی خانخاناں کی زندگیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ان تینوں کے اندر کسی پر جھوٹ بول کر انہیں مطمئن کر سکتی تھی۔ یک لخت زرینہ کا ذہن ایک نئے خطرے کی بو سونگھنے لگا اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"زریں! مجھے جو کچھ کہنا ہے بیگم شیرازی کے سامنے ہی کہوں گی۔ تم مجھے سہارا دے کر ان کے پاس لے چلو۔"

پھر حجرے کی فضا پر ایک گہری خاموشی چھا گئی۔



12

ناگن کی بیٹی

زہر کا شکاری

سرنگ قریباً نصف کوس لمبی تھی جس کے آخری سرے پر دو غار نما حجرے تھے۔
زرینہ نے پلٹ کر دیکھا۔ مشعل کی مردہ سی روشنی میں سرنگ کسی طویل اژدھے کی طرح منہ کھولے کھڑی تھی۔ کچھ دور تک روشنی کا غبار سا اڑتا نظر آ رہا تھا پھر پتھروں سے گھرا ہوا یہ تنگ سا راستہ بتدریج اندھیرے میں گھل مل گیا دور اور دور اس کا دہانہ تاریکی کا ایک دھبہ سا بن کے رہ گیا تھا۔
یہاں کسی ان دیکھے رستہ سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی جس سے مشعل کی لو تھرتھرانے لگی تھی۔
زرینہ نے اندازہ لگایا۔ یقیناً یہاں سے کوئی پُراسرار راستہ باہر کھلی فضا میں نکلتا ہوگا لیکن سرنگ ختم ہونے کے باوجود باہر نکلنے کا کوئی دروازہ، کوئی دہانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔
غار نما حجروں کی دیواریں بھی پتھروں سے اٹھائی گئی تھیں جن کے چوبی دروازے مرور ایام کا پتہ دے رہے تھے۔ خواجہ سرا مہر زریں نے مشعل سرنگ کی ایک دیوار کے ساتھ ٹانک دی اور بیگم شیرازی کے اشارہ پر آگے بڑھ کر ایک حجرے کی کھڑکی کھول دی۔ روشنی کے ہالہ سے حجرے کی تاریک فضا روشن ہو گئی اور زرینہ کو کچھ عجیب و غریب سی آوازیں...... نہیں پھنکاریں اپنی سماعت سے ٹکراتی محسوس ہوئیں۔ پھر ایک ثانیہ کے بعد وہ یوں اچھل کر پیچھے ہٹ گئی جیسے اس نے اپنی موت کو دیکھ لیا ہو۔

غار نما حجرے میں سانپ ہی سانپ رینگ رہے تھے۔ ایک دو نہیں بیسیوں، ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو بالشت سے لے کر تین تین چار چار گز تک طویل، مختلف رنگوں میں مختلف قسموں اور مختلف نسلوں کے ساتھ پھنیر چتکبرے، کوبرے، کنکوڑیئے، کروڈیئے، افعی اور دو منہ والے سیاہ ناگ خاکی، مٹیالے، سرخی مائل، لہریئے دار اور چمکیلے جو حجرے کی دیواروں اور فرش پر جھومتے بل کھاتے ہوئے موت کے سایوں کی مانند لہرا رہے تھے لیکن زیادہ تعداد ان دو بالشتیے سیاہ ناگوں کی تھی جیسا ناگ پرتھال کے کمرے میں چھوڑا گیا تھا۔

روشنی کو دیکھ کر کئی سانپ کھڑکی کی طرف لپکے ایک کالا ناگ اپنا سر باہر نکال کر سپاہی کے نیزے کی طرح جھولنے لگا اور اپنی باریک، سرخ، شعلہ سی زبان بار بار منہ سے نکالنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی ڈر کے مارے زرینہ کی ایک چیخ نکل گئی اور وہ سرنگ کی دیوار کے ساتھ لگ گئی دوسرے لمحے بیگم شیرازی کے ہونٹوں سے ایک قہقہہ ابل پڑا۔

آواز کے اس اژدھے نے زرینہ کی ڈری ڈری، سہمی سہمی چیخ کو نگل لیا اور وہ انتہائی خوف زدہ نگاہوں سے شیرازی کو دیکھنے لگی۔ وہ بولی۔

"سانپ اور عورت کی دوستی بہت قدیم ہے لیکن تم ڈرو نہیں۔ میرے دشمنوں کے سوا یہ اور کسی کو نہیں ڈستے۔"

زرینہ کی نگاہیں ابھی تک اس سرخ شعلے پر مرتکز تھیں جو سیاہ ناگ کے منہ میں تیر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

اچانک مہر زریں نے اپنا ہاتھ زرینہ کے کندھے پہ رکھ دیا اور عیار خواجہ سرا نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ دہشت کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ رہی ہے۔

زرینہ کے چہرے پر خوف کے سائے رینگ رہے تھے اس نے بیگم شیرازی کی طرف دیکھا پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے شیرازی خود بھی ایک ناگن ہو جس نے اپنی کینچلی اتار کر عورت کا روپ دھار لیا تھا۔ شیش ناگ کی بیٹی۔

"ابھی تم ایک اور تماشا دیکھو گی۔"

یہ کہہ کر شیرازی نے تالی بجائی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے حجرے کا دروازہ...... "چوں...... روں...... چرر......" کی موسیقی بکھیرتا ہوا کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی گھنی داڑھی مونچھوں اور الجھے الجھے بالوں والا ایک کریہہ ہیئت بڈھا اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ

گیا۔ سرنگ میں نکلتے ہی اس نے سر جھکا کر شیرازی کو سلام کیا۔

اُس کے چہرے پر کسی گہرے اسرار کے سائے یوں جم سے گئے تھے جیسے وقت کی گردش تھم گئی ہو۔

بکھرے بکھرے بے ترتیب پریشان بالوں کے درمیان اس کے خوفناک چہرے پر چیل کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جس طرح ان کے اندر مشعلیں جل رہی ہوں۔ ان آنکھوں کے درمیان لمبی سی ناک جس کی ہڈی ابھری ہوئی تھی آگے سے طوطے کی چونچ کی مانند نیچے مڑ گئی تھی ہونٹ موٹے اور بھدے تھے۔ کانوں میں پیتل کے بڑے بڑے چھلے آویزاں تھے اور گردن میں رنگین پتھروں کا ہار دائیں شانے پہ ڈھلک کے رہ گیا تھا۔

شکل و شباہت سے بڈھا مشرق کا ایک روایتی جادوگر معلوم ہو رہا تھا لیکن بھیانک اور مضحکہ خیز صورت کی بہ نسبت اُس کی شخصیت زیادہ پُراسرار اور حیران کن تھی۔ وہ کون تھا اور اس تاریک سرنگ میں کیا اس کا کام صرف سانپوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا تھا؟

زرینہ کا ذہن نجانے کہاں کہاں الجھنے لگا۔

عجیب بات تھی۔ پُراسرار بڈھے کی شکل دیکھتے ہی وہ سیاہ ناگ جو کھڑکی سے گردن نکالے جھول رہا تھا۔ فوراً اندر دبک گیا شاید بڈھے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سرزنش کی تھی۔

''سوانا بابا.....'' بیگم شیرازی نے زرینہ کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''یہ لڑکی تمہیں دیکھنے آئی ہے اسے بھی سانپوں سے پیار ہے۔ کیا تم اپنا ناشتہ کر چکے؟''

سوانا بابا نے تیز اور شعلہ بار آنکھوں سے زرینہ کی طرف دیکھا شاید وہ بیگم شیرازی کا خفیہ اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے اپنے حلق سے ''ہم.....'' کی آواز نکالی پھر کھڑکی کی طرف مڑ گیا۔

بڈھے جادوگر کے اگلے قدم نے زرینہ کو حیران و ششدر سا کر دیا۔

کھڑکی کی چوکھٹ پہ ہاتھ رکھے وہ ایک لمحہ حجرے کے اندر سانپوں کو گھورتا رہا پھر اچھل کر اندر جا رہا۔ اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب و غریب تیز اور بانسوں کے جھنڈ میں گزرنے والی ہوا کی سی سرسراہٹ کی آواز نکالی جیسے کوئی اژدھا پھنکار رہا ہو۔

زرینہ کے ہونٹوں سے نکلنے والی چیخ ایک سسکی میں تبدیل ہو کے رہ گئی لیکن اس کے

بعد اس کی آنکھوں نے جو دیکھا وہ ناقابلِ یقین، ناقابلِ بیان اور ناقابلِ فراموش تھا۔ اس نے بار بار اپنی پلکیں جھپکائیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا پھر اُس کے ہوش و حواس تحلیل سے ہونے لگے۔

اس نے دیکھا..... جونہی بڈھے سوانا نے اپنے حلق سے اژدھے کی سی پھنکار نکالی۔ جھومتے لہراتے ہوئے سانپ خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اکثر دوڑ کر ان گڑھوں میں لڑھک گئے جو گوشوں میں سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے بعض کھردری دیواروں پہ رینگتے ہوئے چھت کی طرف لپکے اور برگد کی جٹاؤں کی طرح جھول گئے۔

وہ سب کے سب یوں ڈر کے بھاگے تھے جیسے وہ سانپ کے بچے نہیں مرغی کے بچے تھے اور اگر بھاگ کر جلد ہی کہیں روپوش نہ ہو گئے تو سوانا جو "آسمانی بلا" کی طرح پھنکارتا ہوا جھپٹتا تھا ان میں سے کسی نہ کسی کو اپنے منحوس پنجوں میں اُچک لے جائے گا۔

سانپ انسان کا ازلی دشمن..... ایک انسان کے وجود سے اس قدر ہراساں اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے؟ کم از کم زرینہ نے یہ ہیبت ناک نظارہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور اس کے جسم کے اندر بولنے کی قوت شاید ختم ہو چکی تھی کیونکہ اس نظارہ کی وحشت سے اُس کے لبوں سے نکلنے والی چیخ فقط ایک سسکاری میں ڈھل کے رہ گئی تھی۔

اس نے سانپوں کو موت کے ڈر سے رینگتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن موت بہر حال اُن میں سے کسی ایک کا مقدر بن چکی تھی۔

سوانا ایک شیطان کی طرح حجرے کے اندر روشنی کے ہالہ میں کھڑا تھا پھر زرینہ نے اس کی منحوس آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"او میرے بیٹو! تم مجھ سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ میں تمہیں زمین کے پیٹ سے بھی نکال لاؤں گا۔ تم میرے منہ کا لقمہ اور میرے پیٹ کا ایندھن ہو۔"

پھر اس نے حجرے کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اس کی آنکھیں مشعلوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ اچانک وہ چھت کی طرف دیکھ کر اُچھل پڑا۔

"او چھینے! میرے دوست! آج تم سہی۔"

اُس نے چھت کے ساتھ جھولتے ہوئے ایک سیاہ ناگ کی طرف اُنگلی اٹھائی اور فوراً ہی ایک شعلہ سا اس کی طرف لپک گیا۔ سیاہ ناگ کے منہ میں تیرتی ہوئی آگ سی بڈھے کے

خوفناک چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ اچانک خاموش فضا ایک ہولناک قہقہہ سے مرتعش ہو گئی۔

"نہیں چھینے! تم انکار نہیں کر سکتے۔ ہو ہو ہو...... ہو ہو ہو...... جدھر تمہاری بھو نگی گئی تمہیں بھی اُدھر ہی جانا ہو گا۔ میں تمہاری آگ سے نہیں ڈرتا یہ تو میری زندگی ہے بس اب آ جاؤ۔ ہو ہو ہو...... ہو ہو ہو......"

اور ابھی یہ قہقہہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ بڈھے نے ہاتھ بڑھا کر جھولتے ہوئے سیاہ ناگ کو تیزی کے ساتھ کھینچ لیا۔ یہ وہی ناگ تھا جو چند لمحے پیشتر کھڑکی سے سر نکالے جھول رہا تھا۔ ایک ساعت کے بعد وہ فضا میں یوں لہرایا جیسے تنا ہوا نیزہ لہراتا ہے مگر دوسرے ہی لمحے اس کا سر سواتا کی مٹھی میں تھا۔

"ہو ہو ہو...... ہو ہو ہو......"

سواتا کا خوفناک قہقہہ پھر بلند ہوا جو بجلی کی لہر کی مانند ساری سرنگ میں تیرتا چلا گیا۔

کالا ناگ بڈھے جادوگر کی کمر کے گرد بل ڈال رہا تھا لیکن وہ بدستور ہنس رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اپنی زبان باہر لٹکا کر ناگ کے پھن سے قریب کر دی۔ کالے سانپ کے منہ میں آگ کا شعلہ تیزی سے حرکت کرنے لگا پھر اس نے بڈھے کی زبان پہ ڈنک مارا اور بے دم سے ہو گیا۔ سواتا نے اپنی کمر سے اس کے بل نکالے اور بڑی بے رحمی کے ساتھ زمین پہ پٹخ دیا۔

قصرِ لالہ کی کنیز نے یہ وحشت انگیز، بھیانک کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے ہونٹ بس تھرتھرا کر رہ گئے اس کی قوت گویائی بالکل سلب ہو چکی تھی۔

آن کی آن میں بڈھے سواتا کا چہرہ انگارے کی مانند دہک اٹھا۔ سیاہ ناگ کا زہر اُس کے خون میں دوڑنے لگا تھا اور وہ ایک عجیب سی لذت، ایک مانوس سا کیف محسوس کر رہا تھا۔ سانپ کا زہر بڈھے جادوگر کی غذا بن چکا تھا۔ جب تک وہ اپنی زبان پر انتہائی زہریلا سانپ ڈسوا نہ لیتا اُسے چین نہ آتا تھا۔

غالباً کالے ناگ کے زہر نے اُس کے جسم میں نشے کی ترنگ پیدا کر دی تھی اُس نے خمار آلود آنکھوں سے سیاہ ناگ کی طرف دیکھا جو فرش پر بے سدھ سا پڑا تھا۔ گویا بڈھے نے اُس سے زندگی کی حرارت چھین لی تھی۔

سواتا نے جھک کر اُسے زمین سے اٹھا لیا اور اُس کے تیز دانت سانپ کے جسم میں

پیوست ہو گئے۔ کالا ناگ تڑپا، کسمسایا مگر فوراً ہی اُس کی جدوجہد ختم ہو گئی۔

بڈھا بڑے مزے سے اس کا جسم ادھیڑ ادھیڑ کر کھائے جا رہا تھا۔

اب زرینہ کو اس سے خوف آنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی روشنی پہلے سے دو چند ہو گئی تھی۔ چہرے کا رنگ دہکتے شعلوں کی طرح چمک رہا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔ یہ غالباً زہر کے نشہ کا اثر تھا۔

اپنی غذا کھا کر بڈھا سوانا حجرے سے باہر آ گیا۔ کھڑکی بند کر دی گئی۔ اب سانپ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر دیواروں اور فرش پہ رینگ سکتے تھے۔ ان کا آقا روز مرہ کا خراج وصول کر کے جا چکا تھا۔

''سب ٹھیک ہے ناسوانا بابا!''

''ٹھیک ہے بیگم حضور! میں زہر کا شکاری ہوں۔ میرے پالے ہوئے ناگ اپنا فرض پہچانتے ہیں۔''

''ایک ماہ اور انتظار کرنا ہو گا۔'' بیگم شیرازی نے کہا۔

''غلام حکم کا منتظر ہے۔'' بڈھا کر تک جھک گیا۔

''بس انتظار کرو۔''

یہ کہہ کر بیگم شیرازی مہر زریں کی طرف مڑی۔

''مشعل اٹھاؤ......''

مہر زریں نے اٹھ کر مشعل اٹھائی اور اپنی مالکہ کے آگے آگے ہو لی۔

شیرازی کی گردن ایک ناگن کی مانند تنی ہوئی تھی اور اس کی رفتار میں قدیم مصر کی ان شہزادیوں کا سا سحر انگیز وقار تھا۔ جن کے ایک اشارے پر سینکڑوں سر قلم ہو جاتے تھے۔ ریشمی قبا بل کھائے ہوئے سانپ کی طرح اُس کی پشت پر لہرا رہی تھی۔

زرینہ طلسم زدہ انسان کی مانند چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ سرنگ میں ان کے قدموں کی چاپ یوں ابھر رہی تھی۔ جیسے فضا میں کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔

شیرازی کی کہانی

''ایک ماہ بعد...... ٹھیک ایک ماہ کے بعد جب پہاڑوں کے تنگ و تاریک غاروں

میں رینگنے اور زمین کی چھاتی چاٹنے والے سانپ اپنی کینچلی اتار دیں گے۔ فیروز آباد اور گلبرگہ کے محلوں میں حکومت کا پانسہ الٹ دیا جائے۔

کئی بیگمات کالے زہر کا لقمہ بن جائیں گی......

بوڑھی چوہیا بیگم جہاں علیہ خانم زمین چاٹتی ہوئی تڑپ کر مرے گی...... اور چرم دوز اس کے جسم کی سخت کھال کھینچ کر میرے پاؤں کی جوتی تیار کریں گے۔ سرخ گلہری بیگم جس نے ایک سانپ کو جنم دیا ہے میرے پاؤں پہ سر رکھ کے رحم کی بھیک مانگے گی لیکن زمین پر ان کی قبروں کا نشان بھی نہیں ملے گا۔

اور یہ ستار زادی مدگل کی مغنیہ پرتھال جسے کسی آشرم میں دیوداسی بن کر ناچنا اور پروہت پجاریوں کے تاریک کمروں میں فانوس روشن کرنا تھے۔ بھنی کوشک سراؤں میں کیا لینے چلی آئی ہے؟ اس نے اپنی گردن میں ریشم کی ڈوری کیوں پہن لی؟

کیا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اُس کا سحر جمال بے وقوف شہزادے کی طرح دوسرے لوگوں کو بھی مسحور کر دے گا اور وہ سرداروں کی گردنیں ناپتی ہوئی دکن کے اس تخت پر جا بیٹھے گی جو شیرازی کی میراث ہے لیکن یہ احمق لڑکی اتنا نہیں جانتی۔ شہزادہ حسن کے سر بیجانگر کی فتح کا سہرا باندھنے والے اس کی لاش پر ماتم کرتے ہوئے لوٹیں گے اور یہ تو جوان ساحرہ اپنے پریتم کے آخری درشن بھی نہ کر پائے گی۔ اس کی تمنائیں جوان ہونے سے پہلے ہی حسرتوں کا سفید کفن پہن لیں گی اور وہ خود کسی کالی رات میں سیاہ ناگ کی خوراک بن جائے گی۔

”سنو لڑکی! دکن کی سرزمین ایک انوکھے انقلاب سے دو چار ہونے والی ہے۔ محلوں اور کوشک سراؤں پر زہریلے سانپ لپکیں گے۔ فصیل سے باہر خوں آشام تلواریں جگمگائیں گی اور بیسیوں سر کاٹ کر نیزوں پر لٹکا دیئے جائیں گے پھر دکن کا تخت نئے وارث کے قدم چومے گا اور شیرازی...... جو آج سلطان فیروز شاہ کی ایک کنیز خاص کے سوا اور کچھ نہیں...... جس پر محلات کی بوڑھی کتیا بیگم جہاں اپنے حکم نافذ کرتی ہے۔ ننگی تلواروں کی چھاؤں میں چلتی ہوئی دربار خاص کو رونق بخشے گی اور وہ لوگ انعام و اکرام پائیں گے جو اس کے حق وراثت کی خاطر خطروں سے کھیلتے رہے۔

بوڑھا سلطان جس نے میرے عزیزوں کو تلوار کا لقمہ بنایا اور حکومت چھین لی تھی بہت

دن جی لیا لیکن اب اُس کی کتاب زندگی کا آخری ورق باقی ہے جو بیجانگر سے لوٹتے ہی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی اور اس کا شیر دل بھائی احمد خاں خانخاناں صرف اس لئے زندہ رہے گا کہ میری طرح وہ بھی شہزادہ حسن سے نفرت کرتا ہے اس نے میرے سوچے ہوئے انقلاب کو بروئے عمل لانے کے لئے میری امداد کی ہے۔ وہ صرف یہ سمجھتا ہے میں اس کو دکن کے تخت پر بٹھانے کی خاطر سازش کے خاکے بن رہی ہوں۔ فیروز شاہ نے اس کے حقوق فراموش کر کے شہزادہ حسن کے سر پر ولی عہد کا تاج رکھا ہے اور سلطان کی غلطی احمد خان کو مشتعل کرنے کے لئے کافی ہے۔ میں نے اُس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور انقلاب کے بعد اس کے لئے صدر جہاں کا عہدہ محفوظ رکھا ہے۔ اگر اُس نے وفاداری دکھائی تو ممکن ہے میں اس کے ساتھ شادی بھی کرلوں۔ وہ بہادر ہے اور اس کی تلوار اپنے دشمنوں کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتی لیکن اُس نے بھی اگر سرکشی دکھائی تو سوانا بابا کی سیاہ اولاد اُس کی خواب گاہ میں رینگ جائے گی۔

حیرت سے تمہارے چہرے کا رنگ یوں اُڑ گیا ہے جیسے موت کے فرشتے نے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا ہو شاید تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ لیکن یاد رکھو۔ میرے سوچے ہوئے کھیل کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب اس کے منظر تبدیل نہیں کیے جا سکتے۔ اس ایک ماہ کے اندر اندر کئی نام زندہ انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیئے جائیں گے۔ میں اپنے دشمنوں کے لئے موت کے علاوہ کوئی حکم نافذ نہیں کروں گی۔ لوگ قید خانوں سے واپس آ سکتے ہیں لیکن قبروں سے نہیں۔ میرے سینے کے اندر ایسا دل دھڑک رہا ہے جو میرے بزرگوں کے صدمہ سے دو نیم ہے اور اُسے اس وقت تک قرار نہیں آئے گا۔ جب تک میں دشمنوں کے خون سے اپنی پیاس نہیں بجھا لیتی۔ میرا پیمانہ صبر میرے دشمن کی کھوپڑی کی طرح خالی ہو چکا ہے۔ اب میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی۔ میں نے کئی سال تک خون کے گھونٹ پیے اور اپنے بزرگوں کی روحوں کو انتقام کا یقین دلایا ہے۔ یہ جذبہ انتقام ہی تھا جو مجھے برار کی وادی سے گلبرگہ کی محل سراؤں میں لایا اور میں نے سلطان کے دل پر اپنی محبت کا چرکہ لگایا۔ اب میں اپنے دشمنوں کی موت کے حکم نامے صادر کروں گی۔

تم حیران ہو۔ میں جو ایک کمزور عورت ہوں۔ ایک ایسی حکومت کا تختہ کس طرح الٹ سکوں گی جس کی ہیبت سے پورا ہندوستان لرزتا ہے۔ جس کا سلطان بیجانگر ایسی طاقتور

سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن تم عورت کو کمزور حقیر نہ سمجھو۔ عورت وہ طاقت ہے جو شہزور مردوں کو جنم دیتی اور انہیں اپنی چھاتیوں کا دودھ پلاتی ہے۔ وہ اگر طاقت سے نہیں تو فریب سے مردوں کی ہر قوت کو اپنے پاؤں پر جھکا لیتی ہے۔ ہاں وہ عورت ہی تھی جس نے ازل میں مرد پر فتح پائی اور سانپ کو اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔ آج وہ سانپ شیرازی کے محرم و دمساز ہیں اور اُن کا زہر مرد کی ہر قوت کو ڈس لینے کے لئے کافی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں میرے پاس سوانا بابا کی اولاد کے سوا اور کوئی طاقت نہیں۔ تم تلنگانہ کے ان بہادروں کو نہیں جانتی جو سلطان کے سیاہ پرچم کے نیچے لڑتے ہیں جن کی باگ دراصل میرے ہاتھ میں ہے۔ ان کا سردار داؤد خاں ہمارا نمک خوار ہے اور سلطان کی مراجعت کے بعد جونہی شاہی محل سرا کا نقشہ بدل گیا داؤد باہر کے مُہرے تبدیل کر دے گا اور خانخاناں پر یہ راز اس وقت افشا ہو گا جب میں بہ نفس نفیس تخت پر جلوہ افروز ہو کر اُس کے نئے عہدے اور اعزاز کا اعلان کروں گی۔ وہ جانتا ہے بادشاہوں کی معمولی سی غلطی قیامت آفریں انقلاب کا پیش خیمہ بن جایا کرتی ہے لیکن فوج کی کمان داؤد خاں کے ہاتھ میں آ جانے کے بعد خانخاناں کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے گا کہ وہ میرے بخشے ہوئے اعزاز کو قبول کرے یا پھر اُس کا سر بھی نیزے پر چڑھ جائے گا لیکن یقین جانو! مجھے اس کے مرنے کا افسوس ہو گا تم عورت ہو اس لئے اس صدمہ کی وجہ بخوبی سمجھ سکتی ہو۔ ہاں میں اُسے پسند کرتی ہوں لیکن تمہارا چہرہ بتا رہا ہے تمہیں یہ بات تسلیم کرنے میں شاید تذبذب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کو اپنے دل کے راز بتا دینے پر مجبور ہے۔ نجانے اس کے دل کی دھڑکنوں کو زبان کہاں سے عطا ہو جاتی ہے...... اب تم کچھ مطمئن نظر آنے لگی ہو۔ ہاں مجھے محبت کے اقبال جرم میں ایک لذت محسوس ہو رہی ہے لیکن اگر خانخاناں نے میری محبت ٹھکرا دی۔ مجھے ٹھکرا دیا تو یقین رکھو محبت کی تاریخ میں ایک خونریز باب کا اضافہ ہو گا لیکن یہ باتیں اس وقت کرنے کی نہیں۔

اور تمہاری آنکھوں میں یہ نیا سوال کیوں اُبھر آیا ہے؟ آخر تمہاری حیرت کس دروازے پہ جا کر ختم ہو گی تاکہ میں اس کے پٹ بھیڑ لوں اچھا لو میں تمہیں یہ قصہ بھی سنائے دیتی ہوں۔

آج سے کئی سال پیشتر جب میں گلبرگہ میں اپنی ماں کی چھاتیوں کا دودھ پیتا اور قصرِ شاہی کے قالینوں پر ابھی گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہیں سیکھی تھی۔ وہ نوجوان صدر جہاں کی سفارش اور اس عیار بڑھیا بیگم جہاں کی وساطت سے قصر میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں سلطان داؤد شاہ بہمنی کے بیٹے تھے جنہیں باپ کی وفات کے بعد گلبرگہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور میرے ماموں تخت پر جلوہ آرا ہو کر سلطان داؤد شاہ کی ان کوتاہیوں اور لغزشوں کا ازالہ کر رہے تھے جن سے دکن کی سلطنت کمزور ہو چکی تھی۔ میرے ماموں سلطان کی حکومت کیسی تھی؟ میں اس کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتی کیونکہ اس وقت میری عمر دو اڑھائی سال سے زیادہ نہ تھی مگر سلطنت کے بعض بدخواہ میرے ماموں کے خلاف اندر ہی اندر سازش کر رہے تھے اس لئے سلطان معظم نے حکم دے رکھا تھا۔ داؤد شاہ کے دونوں بیٹے گلبرگہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ چاہتے تو ان لڑکوں کے سر بھی قلم کرا سکتے تھے لیکن میں نے سنا ہے میرے ماموں خلد آشیانی کشت و خون کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہی کمزوری ایک روز انقلاب کا پیش خیمہ بن گئی۔

لڑکی......! غور سے سنتی جاؤ۔ میں اپنے عظیم بزرگوں کی روح کی قسم کھا کر یقین دلاتی ہوں۔ میں نے اپنے خاندان کی تباہی و بربادی کا جو افسانہ سنا اُسے لفظ بلفظ بیان کر رہی ہوں یہی تو وہ آگ ہے جو سالہا سال سے میرے سینے میں بھڑک رہی ہے اور اب شاید خون کے چھینٹے اسے سرد کر سکیں۔

دیکھو! میں اُن شہزادوں کا ذکر کر رہی تھیں جو صدر جہاں کی سفارش اور بیگم جہاں کی خاص کوششوں سے قصر سلطان میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ عذر پیش کیا تھا وہ اپنے چچا سلطان حضور کو دیکھنے اور اُن کے نیاز حاصل کرنے آئے ہیں غالباً سلطان کو یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ غریب الدیار شہزادے اپنے ذہن سے حکمرانی کے خیالات محو کر چکے ہیں اور صرف سلطان کی نگاہِ کرم کے اُمیدوار ہیں یہی وجہ تھی میرے ماموں نے انہیں گلبرگہ میں ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔

اُن کی تمناؤں کے گلشن ویران ہو چکے تھے...... لیکن میرے ماموں حضور اُن سے غافل بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ بس شرط یہ قرار پائی تھی۔ سلطان سے ملاقات اور اپنے عزیزوں کے ملنے کے بعد جو بدستور گلبرگہ میں کہیں غربت و افلاس کی زندگی بسر کرنے لگے

تھے وہ اپنے مسکن کو لوٹ جائیں گے۔

میں نے سنا ہے جب دونوں بھائی گلبرگہ میں داخل ہوئے۔ اُن کے بدن پر معمولی سے کپڑے تھے۔ اُن کے چہروں پر حسرت و یاس کے لرزتے ہوئے سائے اُن کے بخت داژگوں کا افسانہ دہرا رہے تھے۔ سنا ہے انہوں نے زندگی کے لئے در در کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ جن لوگوں نے گلبرگہ کے شاہی محلات میں انہیں پر تکلف پالنے جھولتے ہوئے دیکھا تھا وہ ان کی اس بے بسی پر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور سوچنے لگے اُن کی گلبرگہ میں آمد دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو سلطان ان بدبخت شہزادوں کے حال پہ رحم کھا کر ان پر بخشش و عنایت کرے گا یا اُس نے انہیں قتل کر دینے کے لئے دھوکا سے بلایا ہے۔

نجانے لوگ خیالات کی کن وادیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور بدنصیب شہزادوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں سوچنے لگے تھے لیکن تقدیر الگ تھلگ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ قسمت اُن کا ہاتھ پکڑ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف لئے جا رہی تھی۔ وہ تنہا اور بے ہتھیار تھے......

جب قصرِ لالہ میں داخل ہوئے اس وقت سلطانِ عالی چند ایک مشیروں کے ہمراہ قصر کا زینہ اُتر رہے تھے۔ بڈھا وکیل سلطنت تعارف کی خاطر بدقسمت شہزادوں کے ہمراہ تھا۔ گردش ایام نے ان میں شہزادگی کی کوئی علامت باقی نہ رہنے دی تھی جب انہوں نے سلطان کو اس وسیع و عریض کمرے میں آتے دیکھا جہاں زینہ ختم ہوتا تھا تو دونوں ایک بلند ستون کے پاس رُک گئے مگر انہوں نے تعظیم کے لئے سر نہیں جھکائے نہ کورنش کی رسم ادا کی اس پر سب لوگ متحیر رہ گئے۔

سلطان نے قریب آ کر پوچھا۔

"یہ کون گستاخ ہیں جنہیں مابدولت کی حاضری کے آداب کی بھی پروا نہیں؟"

بڑے بھائی نے قہر آلود نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھا اور لپک کر وکیل سلطنت کی میان سے تلوار کھینچ لی پھر وہ ایک بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا سلطان کی طرف بڑھا اور ایک ہی وار میں اس کا سر قلم کر دیا۔ جن کے پاس تلواریں تھیں وہ بھی دل کھول کر مقابلہ نہ کر سکے اور چند ہی لمحوں میں ڈھیر ہو گئے۔

چھوٹے بھائی نے زینہ کی طرف کسی کو بڑھنے ہی نہیں دیا جو پہرے دار سلطان کی حفاظت کے لئے بھاگتے ہوئے آئے انہیں بھی زندگی کی بازی ہار دینا پڑی۔

بڑا بھائی خون میں ڈوبی ہوئی تلوار سونت کر سلطان کی لاش کے سرہانے جا کھڑا ہوا جو خون میں لت پت پڑی تھی اور خوفناک آواز میں دھاڑا۔

"ہم نے اپنے باپ کے قاتل کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے اس سانپ کا سر کچل دیا جو ہمارے جنت مکانی باپ کے تخت پر پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ حکومت اپنے اصل وارث کے پاس لوٹ آئی ہے۔ اب صدر جہاں کو بلاؤ وہ ہماری بادشاہت کا اعلان کرے۔"

"لڑکی! تم یہ سن کر حیران رہ جاؤ گی۔ یہ نوجوان جس نے سلطان کو اس کے اپنے قصر میں ذبح کر ڈالا تھا فیروز شاہ تھا جو "سکندر ثانی" اور "روز افزوں" کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا اور اس وقت ہم سب کا آقا ہے اور اس کا چھوٹا بھائی احمد خاں تھا جو آج امیر الامراء اور خانخاناں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

صرف دو بھائیوں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور میرے ماموں کو ایک بھیڑ کی طرح ذبح کر ڈالا تھا۔

اب تم یہ بھی سننا چاہو گی۔ اس کے بعد کیا؟ میں تمہیں اپنی بدبختی اور کم نصیبی کی پوری داستان سناؤں گی۔ یہ الف لیلہ کا افسانہ نہیں وہ کہانی ہے جو میرے اپنے ساتھ پیش آئی۔

غلام بھاگے بھاگے گئے اور صدر جہاں نے فیروز شاہ کے ساتھ جھک کر شاہی آداب کے مطابق کورنش کی رسم ادا کی۔ گویا اس نے داؤد شاہ بہمنی کے بیٹے کو سلطان دکن تسلیم کر لیا۔ جب محل کے خدام، غلاموں، کنیزوں اور خواجہ سراؤں نے صدر جہاں کو ایک اجنبی نوجوان کے سامنے جھکتے دیکھا جس کے کپڑوں سے ابھی سفر کی گرد بھی دور نہیں ہوئی تھی اور جو خون آشام تلوار لیے سلطان کی لاش کے سرہانے کھڑا تھا تو نئے سلطان کی تعظیم میں ان کے سر بھی خود بخود جھک گئے۔

صدر جہاں وکیل سلطنت اور چند پرانے مصاحبین کی موجودگی میں فیروز شاہ کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔

اس کے بعد فیروز شاہ وہی خون آلود تلوار تھامے جس پر بے گناہ سلطان کا لہو جم رہا تھا بھیڑیئے کی طرح غراتا اور دراتا ہوا قصر کے اندر داخل ہوا لیکن اس کے اوپر آنے سے پہلے ہی سلطان کے قتل کی خبر کنیزوں اور خواجہ سراؤں نے آسنائی تھی اور محل سرا میں کہرام بپا ہو چکا تھا۔ چیخوں، سسکیوں اور آہ و بکا سے گلبرگہ کا قصرِ سلطانی ماتم کدہ بنا

تبدیل ہو گیا تھا۔ ہر طرف خوف و ہراس اور وحشت کے سائے لرزنے لگے تھے۔ فیروز شاہ کی کھنچی ہوئی تلوار کا خوف موت کی خنک لہر بن کر جسموں میں دوڑ رہا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کون مرے گا کون بچے گا۔

میری ماں کا قصر بڑی بیگم کے قصر سے ملحق تھا۔ صاف ظاہر تھا۔ فیروز شاہ سلطان کی بہنوں، بیگمات اور فرزندوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ سب کے چہرے پر موت کی زردیاں کھنڈ گئی تھیں۔ بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن قصرِ سلطانی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور میری ماں جس کی تقدیر نے ایک پلک جھپکنے کے عرصہ میں آنکھیں پھیر لی تھیں۔ موت کے خوف سے لرزہ براندام کھڑی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کریں، کہاں جائیں، کدھر جائیں؟

ماں نے مجھے اُٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا...... وہ ڈرتی تھی کہیں فیروز شاہ کی تلوار اس کی ننھی اور معصوم بچی کا لہو نہ چاٹ لے۔ میری ماں کو چونکہ سلطان مرحوم کے مزاج میں بڑا دخل رہا تھا اس لئے ظاہر ہے نیا حکمران اپنے دشمن کی اُس بہن کو زندہ کیسے چھوڑ دے گا جس نے داؤد شاہ کی اولاد کے متعلق سب سے پہلے جلا وطنی کا مشورہ دیا تھا لیکن ماں کو شاید اپنی بہ نسبت میری زیادہ فکر تھی۔ اُس نے ایک خواجہ سرا سے کہا...... تم اس بچی کو لے کر نکل جاؤ۔ میرے ساتھ جو کچھ بیتے گی برداشت کر لوں گی۔"

لیکن اُسی لمحے محل کے تمام خادموں بالخصوص خواجہ سراؤں کو فیروز شاہ کے حضور میں طلب کر لیا گیا اور میری ماں میری بے کسی اور اپنی بے کسی پر آنسوؤں کے ہار پروتی رہ گئی۔ نجانے زندگی اُس روز کہاں روپوش ہو گئی تھی لیکن عین اسی لمحے مملکت کا دیوان اور ماموں مرحوم کا ایک خاص معتمد بھاگا بھاگا قصر میں داخل ہوا اور میری ماں کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"میرے ساتھ آؤ...... میں نے بھاگ نکلنے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

میری ماں مجھے چھاتی سے لپٹائے دیوانہ وار دیوان کے ساتھ نکلی اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے فصیل پر آ گئے باہر ایک غلام دو گھوڑے لئے کھڑا تھا۔ سوال صرف یہ تھا اتنی بلندی سے اگر چھلانگ لگائی جائے تو ہڈیاں تک چور ہو جانے کا اندیشہ تھا پھر سب سے بڑی پریشانی میری ننھی سی جان تھی لیکن دیوان نے واقعی فرار کا پورا اور مکمل بندوبست کیا

تھا۔ اس نے فصیل کے کنگورے کے ساتھ ایک رسہ باندھا اُس میں ایک ٹوکرا اس طرح باندھا کہ کسی طرح جھولنے کا اندیشہ نہ رہے پھر مجھے اس ٹوکرے میں رکھ کر نیچے لٹکا دیا۔ غلام نے مجھے تھام لیا اور دیوان نے پھر رسہ اوپر کھینچ لیا۔ پھر میری ماں اسی ٹوکرے میں بیٹھ کر نیچے آئی۔ اس کے بعد دیوان رسہ کی مدد سے فصیل پر پاؤں ٹکاتا ہوا نیچے اترا وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر گلبرگہ سے باہر آئے اور ہوا ہو گئے اس طرف جدھر قسمت انہیں ہانک کر لے گئی۔

شاید میں نے ابھی یہ نہیں بتایا...... میں ماں کے پیٹ ہی میں تھی کہ باپ کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ دیوان میرے مرحوم باپ کا دوست اور ماموں سلطان کا خاص معتمد تھا۔ وہ دکن کے اُس ہندو خاندان سے تھا جس نے ہمیشہ سلطان کی خدمت گزاری کی تھی اس لئے اُسے دیوان کے عہدے پر مقرر کیا گیا تھا۔

دیوان نے جہاں فرار کا مکمل انتظام کیا تھا وہاں وہ اشرفیوں کے چند توڑے بھی ہمراہ لانا نہیں بھولا تھا۔ یہ مختصر سا قافلہ دن رات چلتا رہا اور آخر برار کی ایک سرائے میں آ اُترا۔

تعزیر و عقوبت کے متعلق وہ تمام اندیشے درست ثابت ہوئے جن کے ڈر سے وہ گلبرگہ سے بھاگ آئے تھے۔ فیروز شاہ نے محل سرا میں قتل عام نہیں کیا۔ صرف چند خاص خاص افراد تلوار کے گھاٹ اترے البتہ دیوان اور میری والدہ کی تلاش شروع ہو گئی۔ نئے سلطان نے حکم دیا انہیں زندہ یا مردہ میرے حضور میں پیش کیا جائے۔

اب کسی سرائے میں رہنا اپنی زندگی سے جوا کھیلنے والی بات تھی۔ دیوان نے مجھے گود میں اٹھایا اور میری ماں کو ساتھ لے کر شہر سے دور اُن پہاڑی غاروں میں آ چھپا جہاں جھاڑیوں اور درختوں کا ایک جنگل آباد تھا۔ انہی پہاڑوں پر قریب ہی ایک چشمہ مل گیا۔ کھانے پینے کا سامان شہر ہی سے گھوڑوں پر لاد لیا گیا تھا اور یوں موت کے ڈر سے وہ پہاڑی غار ہمارا مسکن بن گئے جدھر انسانوں کا گزر نہیں ہوتا۔

میری ماں کی تلاش ابھی تک جاری تھی جسے فیروز شاہ کے دربار سے "سیاہ ناگن" کا خطاب دیا گیا تھا۔ سلطان کے سپاہی اگرچہ بو سونگھنے والے کتوں کی طرح گھومتے اور ڈھونڈتے رہے لیکن انہیں ماں کا سراغ نہ مل سکا۔

وہ پہاڑی زندگی کیسی تھی اور اس میں تین جانوں کو کیسی کیسی تکلیفوں اور مصیبتوں کا

سامنا کرنا پڑا؟ شاید میں اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ بیان نہیں کر سکتی لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو میری عمر سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور میں بوڑھے دیوان کے ہمراہ برار کے ایک گاؤں میں زندگی گزار رہی تھی۔ ماں کو ایک پہاڑی ناگ نے ڈس لیا تھا اور زہر کی تاب نہ لا کر وہ انہی پہاڑی غاروں میں فوت ہو گئی تھی جہاں دیوان بابا کے بقول ہم نے پورے چار سال دنیا کی آنکھوں سے چھپ کر گزار دیئے تھے۔ انہی غاروں میں میری ماں کی قبر آج بھی خاموشی کی زبان سے اُس بھیانک اور پر مصائب زندگی کی کہانی بیان کر رہی ہے۔ میرے ذہن پر اُس زندگی کی کچھ ہلکی ہلکی پرچھائیاں سی ضرور تیرتی پھرتی ہیں مگر گاؤں کا زمانہ تو اچھی طرح یاد ہے۔ میرا ایک ایک لمحہ اپنی ماں کی یاد میں بسر ہوتا تھا...... آخر سسکیاں بھرتی اور ہچکیاں لیتی میں جوان ہو گئی۔ مجھے سلطان فیروز شاہ کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس نے ماں کے متعلق کہے تھے۔

"سیاہ ناگن......"

اور میں نے عہد کر لیا اب ناگن ہی بن کر اپنے بزرگوں کا انتقام لوں گی اور اپنی روح کی پیاس بجھاؤں گی یا اس کوشش میں اپنی جان دے دوں گی۔

میں نے دیوان بابا سے اپنے اس عزم کا اظہار کیا۔ اس کے سینہ کے اندر بھی وقت کی راکھ میں انتقام کی دبی ہوئی چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

"شیرازی بیٹی! اگرچہ وقت نے مجھے بڈھا کر دیا ہے۔ میرے سب ہتھیار چھین لئے ہیں اور میں بالکل بے دست و پا ہو چکا ہوں پھر بھی میں ترے ترکش کا تیر ہوں۔ تو مجھے چلائے گی تو سیدھا نشانہ پر بیٹھوں گا۔"

"تیر و تلوار کی بات نہیں بابا! کیا تم بھول گئے۔ میں ایک ناگن کی بیٹی ہوں۔ سیاہ ناگن بس میں سانپ کے زہر سے انتقام لوں گی۔ تیر خطا ہو سکتا ہے۔ تلوار کا وار چوک سکتا ہے لیکن سانپ کا زہر انسان کو کروٹ بھی نہیں لینے دیتا۔"

پھر دیوان بابا سپیرا بن گیا۔ وہ سانپ پکڑنے میں اس قدر طاق ہو گیا کہ زہریلے ناگ اُس سے ڈرنے لگے حتیٰ کہ خود کو بھی زہرناک بنانے کے لئے اُس نے سانپ کھانے شروع کر دیئے۔ کیا تم نے سرنگ میں سوانا بابا کو اپنی زبان پر ناگ ڈستے اور پھر اُسے اُدھیڑ اُدھیڑ کر کھاتے نہیں دیکھا...... وہ دیوان ہی تھا جو مجھے گلبرگہ کے شاہی محل سے لے کر

بھاگا پھر فیروز شاہ کی کوشک سراؤں تک رسائی حاصل کرنے کا سوال تھا لیکن یہ اس طرح ہوا کہ دو سال پہلے جب سلطان اپنے دستہ خیاص کے ساتھ برار کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ایک ندی کنارے ایک حسین وجوان لاوارث لڑکی ملی۔ جس کے حسن وشباب نے سلطان کو دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ اس ساحرہ جمال کو اپنی کنیز خاص بنا کر گلبرگہ لے آیا تھا۔ وہ میں ہی تھی...... شیرازی......"

اور اب تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو گی۔ سرنگ میں وہ سانپوں کے حجرے کیسے ہیں۔ سوانا بابا کون ہے۔ میں کون ہوں؟

میں جانتی ہوں فیروز شاہ میرے ماموں کو قتل کرنے میں حق بجانب تھا کیونکہ اُس نے تخت حکومت وراثت میں نہیں، چھین کر حاصل کیا تھا اور جب اس کے اصل وارث کا داؤ چل گیا اُس نے بھی اُسی طرح چھین لیا لیکن میری مظلوم ماں نے کیا گناہ کیا تھا۔ وہ پہاڑوں اور غاروں میں زندگی کے پیچھے بھاگتی رہی اور آخر سیاہ ناگ کا لقمہ بن گئی؟ اب ناگن کی بیٹی اپنی ماں کا، اپنے ماموں کا، اپنے اس خاندان کا جو تباہ و برباد ہو چکا...... انتقام کیوں نہ لے؟ فیروز شاہ جوان تھا اُس نے تلوار سے ایک سلطان کا گلا کاٹا اور حق وصول کر لیا میں ایک عورت ہوں۔ تلوار کا کام سانپ کے زہر سے لوں گی اور بالائے دکن کے تخت پر میرا حق نہ سہی لیکن میں ملکہ بنوں گی اور ہر اس شے کو فنا کر دوں گی جو میرے راستہ میں آئے گی۔ میں سانپوں کی شہزادی ہوں۔ زہر کی پجارن اور خوب جانتی ہوں سوانا بابا کی اولاد مجھ سے بے وفائی نہیں کرے گی۔

اب جب تم میری داستان سن چکی ہو۔ میں نے اب تک جو کچھ کیا اور جو کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ سب تم پر واشگاف ہو چکا سو اب تم اپنے متعلق بھی میرا فیصلہ سن لو۔

سلطان جب بیجانگر کی مہم سے لوٹے گا۔ اس وقت تمہیں اس کے سامنے اپنی زندگی کا بہترین رقص کرنا ہو گا۔ میں جانتی ہوں وہ تمہیں عزیز رکھتا اور قصر لالہ میں تمہارا رقص دیکھ کر محظوظ ہوا کرتا ہے لیکن پچھلے رقص اور اس رقص میں ایک فرق ہو گا۔ پہلے تمہارے پاؤں کی ہر جنبش اُسے زندگی کا ایک کیف بخشتی رہی ہے لیکن یہ رقص اس کے جسم سے زندگی کی آخری رمق بھی چھین لے گا۔ کیسے؟

یہ تمہیں سوانا بابا بتائے گا...... بہر حال میں اتنا جانتی ہوں۔ وہ موت کا رقص ہو گا۔

بابا تمہیں سکھا دے گا۔ اگر تم یہ رقص کرنے میں کامیاب رہیں تو میں تمہیں قول دیتی ہوں کہ تم اگر میرے ساتھ تخت پر نہ بیٹھ سکیں تو داؤد خان کے پہلو میں ضرور بیٹھو گی۔ جو اس وقت احمد خاں کی طرح خانخاناں کا رتبہ پا چکا ہو گا۔

نہیں بیوقوف لڑکی! اس میں ڈرنے یا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ ہو گا۔ کھیل کا کوئی منظر تبدیل نہیں ہو سکتا اور تم پر بھی کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بس کل سے تم سوانا بابا کے پاس رقص سیکھنے جاؤ گی۔ موت کا رقص کیا خبر سلطان کب لوٹ آئے بس تمہیں صرف رقص کرنا ہے۔ جس میں وہ کھو جائے گم ہو جائے۔ ناگ تو میں ہی چھوڑوں گی۔"

ایک اور سازش

زرینہ کے دل میں ایک طوفان بپا تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچتی۔ شاید وہ الف لیلیٰ کے ابوالحسن کی طرح سوتے جاگتے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ گزشتہ چند روز میں اُس کے ساتھ جو واقعات پیش آ رہے تھے۔ وہ الف لیلیٰ ہی کی طرح پراسرار اور حیرت افزا تھے۔

کہیں وہ بھی کوئی بھیانک خواب ہی تو نہیں دیکھ رہی؟ یہ سوچ کر جب وہ اُن واقعات کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی جو خوابوں کے سے کہرے کی طرح اُس کے دماغ کے حاشیوں پر تھرتھراتے پھرتے تھے تو وہ زیادہ خوفناک اور لرزہ خیز سنگینی اختیار کر کے بھوتوں کی طرح اس کی نگاہوں کے عمق میں رقص کرنے لگتے اور ایک چیخ اس کے ہونٹوں پہ دم توڑ کے رہ جاتی...... وہ جس قدر غور کرتی، واقعات کی پُراسرار زنجیریں اتنی ہی سفاکی کے ساتھ اس کے پاؤں میں جھنجھنا اُٹھتیں۔ اس کے جسم کی ہڈیاں کڑکڑانے لگتیں اور ذہن کے ننھے ننھے دریچوں اور سوراخوں میں جادو کی بیسیوں پھلجھڑیاں سلگ جاتیں جن کی تڑتڑاتی ہوئی سفید دودھیائی روشنی کی لہریں اُس کے شعور کو گم صم سی کر دیتیں۔ نجانے یہ سب کیا تھا۔ فیروز آباد میں آ کر وہ کن طلسمی خیالوں میں الجھ گئی ہے۔ مگر نہیں یہ خواب نہ تھا۔ فیروز آباد کے محلات اس کے دیکھے بھالے تھے یہاں کی کوشک سراؤں کا ایک ایک قصر اور ایک ایک کمرا اُس کا جانا بوجھا تھا۔ وہ اپنی آقا بیگم علیہ خانم کے ساتھ پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آ چکی تھی اور گلبرگہ کی طرح فیروز آباد کے ایوانوں کا ہر تختہ اُس کے پاؤں سے

مانوس تھا لیکن قصر شیرازی کے ایک تاریک حجرے سے نکلنے والی وہ پُراسرار سرنگ اس کے ذہن پر ایک طلسمی لکیر کی مانند جم کے رہ گئی تھی۔ جس کے حجروں میں اُس نے سوانا بابا کے سانپ دیکھے تھے۔ تو کیا شیرازی اور مہر زریں کے علاوہ کوئی بھی اُس سرنگ کے بھید سے آشنا نہیں؟ اور یہ شیرازی جو دو سال پہلے صرف ایک کنیز بن کر بہمنی کوشک سراؤں میں آئی تھی آج بیگموں کی طرح نہ صرف شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے بلکہ ایک بھیانک انقلاب کے خواب بھی دیکھنے لگی ہے۔ کیا سچ مچ وہ اُس شاہی خاندان کی یادگار ہے جس نے ایک خوفناک سازش کر کے سلطان داؤد شاہ بہمنی کو قتل کیا اور حکومت چھین لی تھی؟

ہو گی...... اُس کی بلا سے لیکن اُسے دکن کے تخت و تاراج سے کیا واسطہ وہ بہمنی میراث پہ کیا حق رکھتی ہے؟ فیروز شاہ نے بزورِ شمشیر اپنے جنت مکانی باپ کی وراثت حاصل کی تھی لیکن یہ ناگن بہمنی حشمت کو پھر ڈس لینا چاہتی ہے۔ دکن کے امن کو زہر کا لقمہ بنا دینے کی خواہش رکھتی ہے۔

وہ اپنے سحر آفریں حُسن و شباب کی بدولت ایک کنیز سے بیگم کا درجہ حاصل کر چکی ہے اُسے سلطانِ عالی کے مزاج میں بھی بڑا دخل ہے اور اُس کے جمالِ جہاں آرا نے سلطان کے دل و دماغ پر جادو سا کر رکھا ہے لیکن کیا عورت اتنی مُحسن کش بھی ہو سکتی ہے کہ جس شخص نے اُسے برار کی ایک گزرگاہ سے اٹھا کر بہمنی محلات میں لا بٹھایا اُسے کنیزوں، غلاموں اور خواجہ سراؤں پر حکومت بخشی اور بیگم کے معزز لقب سے سرفراز کیا وہ اُسی کو ڈسنے پر آمادہ ہو گئی؟

کیا عورت کا دوسرا نام واقعی فریب ہے؟

وہ عورت...... جو جنت کے فرشتوں کی ایک معصوم اور پاکیزہ مسکراہٹ کے خمیر سے تیار کی گئی تھی۔ کیا شیطان کی تمناؤں کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے؟

کیا عورت اور سانپ کا رشتہ ازلی ہے؟

زرینہ کا ذہن جھنجھنا اٹھا...... اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے دماغ کی نسیں شدید کھنچاؤ سے تڑک جائیں گی اور اُس کی شریانوں میں دوڑنے والا خون یکلخت منجمد ہو کر رہ جائے گا۔

"نہیں...... نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا عورت پیکرِ وفا ہے۔ وہ فرشتوں کا تبسم اور حوروں کا تقدس ہے۔ وہ انسان کے ذہن کا ایک کیف آفریں خواب ہے اُس کی تعبیر اتنی

بھیانک اور جہنم خیز نہیں ہو سکتی۔ میں شیرازی کو دکن کا امن تباہ نہ کرنے دوں گی۔ اس کا حسن بہمنی محلات میں موت کا کھیل نہیں کھیل سکتا۔ اس کے جہنمی خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکیں گے۔ وہ عورت کے چہرے پر بیوفائی کی کالک نہیں مل سکتی۔" زرینہ کے دل و دماغ میں ایک ساتھ وفاداری اور آقا پرستی کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا شاید اُسے دکن کی سرزمین سے محبت تھی اور وہ اپنے دیس کی مٹی کو انسانوں کے خون سے آلودہ نہ ہونے دینا چاہتی تھی یا پھر شیرازی کی بے وفائی نے اس کے جذبات مشتعل کر دیئے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا لیکن اس کی نگاہوں کے سامنے ابھی تک سینکڑوں سیاہ مٹیالے اور نیلے پیلے سانپ لہرا رہے تھے اُس کے ذہن کے گوشہ گوشہ سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں اور نبضوں کا خون نہایت تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگا تھا جیسے اُس کے جسم کے اندر آگ دہکانے والی دھونکنی لگی ہو۔

وہ چاہتی تھی جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے نکل کر قصر لالہ میں جائے اور بیگم جہاں کو اس بھیانک سازش سے آگاہ کرے جو قصر شیرازی کے تاریک حجروں میں موت کی طرح رینگ رہی تھی۔ سلطان کی زندگی تو ابھی محفوظ تھی۔ نہ جانے بیجانگر سے کب واپسی ہو اور کب شیرازی انہیں زہر کا لقمہ بنائے لیکن شہزادہ حسن کے اردگرد ضرور موت کے سائے ناچ رہے ہونگے۔ شیرازی کے بقول ولی عہد کی موت اس کے ساتھ ہی روانہ کر دی گئی تھی اور وہ وہی زہریلا ناگ تھا جو سوانا بابا کے حجرے سے روانہ کیا گیا تھا۔

زرینہ کو ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی معمولی سی غفلت ہولناک تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ لیکن وہ قصر شیرازی سے نکل بھی کس طرح سکتی تھی۔ مہر زریں آٹھوں پہر سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی حتیٰ کہ رات کو سوتے کے وقت بھی جب تک وہ نیند کی جمائیاں نہ لینے لگتی وہ اس کا ساتھ نہ چھوڑتی تھی پھر کل سے اُس کے حجرے کے باہر دو غلام بھی نظر آنے لگے تھے جو ساری ساری رات "کھوں کھوں" کرتے اور نسوار تھوکتے رہتے تھے۔ زرینہ نے محسوس کیا۔ اس کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

تو پھر اب وہ کیا کرے؟

بیگم جہاں تک کیسے پہنچے..... شہزادہ حسن کو موت کے منہ سے کس طرح نکالے؟ اگر

زیادہ دیر ہوگئی تو سوانا بابا کے بھیجے ہوئے کالے ناگ اُسے ضرور ڈس لیں گے اور پھر بیجانگر کے ولی عہد کا جنازہ ہی لوٹے گا..... اُف خدایا! وہ اس تصور ہی سے تڑپ اٹھی۔

اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دونوں محافظ غلام گردش کے ستونوں سے ٹیک لگائے بیٹھے اونگھ رہے تھے لیکن ذرا سی آہٹ پر بلی کی طرح چوکنے ہو جاتے..... پرے بیگم شیرازی کے کمرے میں فانوسوں کی روشنی دریچوں اور غرفوں سے جھانک رہی تھی۔ شاید وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔

زرینہ کو قصر شیرازی میں آئے چوتھا روز تھا۔ دو دن وہ سوانا بابا کی حاضری بھی دے چکی تھی۔ مہر زریں اس کے ساتھ ہی جاتی تھی۔ سوانا نے اُسے ایک نئے رقص کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ لیکن زرینہ محسوس کر رہی تھی شیرازی رقص کے علاوہ اُس سے کوئی اور خطرناک کام لینا چاہتی ہے۔ وہ کام کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے متعلق وہ ابھی تک اندھیرے میں تھی البتہ مہر زریں کی باتوں سے اُسے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ زرینہ کو بغاوت کی رات ایک اہم خدمت سرانجام دینا ہو گی اور وہ "اہم خدمت" رقص نہیں ہو سکتی تھی۔ سوانا اُسے "خنجر رقص" سکھا رہا تھا اُسے رقص کے دوران اپنے خنجر کسی کے سینہ میں اتارنا ہوں گے؟ وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اور سوچنے لگی یہ شیرازی کس قدر خونخوار عورت ہے لیکن وہ عورت کب ہے وہ تو اپنے آپ کو ناگن کی بیٹی کہتی ہے۔ وہ ناگن ہی تو ہے۔

زرینہ نے ابھی تک اپنی کسی حرکت سے بھی شبہ کا اظہار نہ ہونے دیا تھا اور شیرازی اس بات پر خوش تھی کہ محل کی ایک معتمد کنیز جو سلطان کے کمرہ خاص میں بھی جا سکتی تھی اس کے ساتھ شریک ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود عیار خواجہ سرا زریں ایک ساعت کے لئے بھی اسے تنہا نہ چھوڑتی تھی..... اُسے صرف چند لمحوں کی ضرورت تھی بس وہ قصر لالہ تک ہو آئے اور پل بھر کے لئے بیگم جہاں سے مل سکے مگر زریں کی موجودگی میں چند لمحوں کی فرصت اور علیحدگی بھی مشکل ہی نظر آتی تھی اور ادھر جوں جوں وقت گزر رہا تھا زرینہ کے سینہ پر جیسے سانپ لوٹ رہے تھے۔



چوتھا روز..... چوتھی رات

اور یہ رات بھی زرینہ نے کروٹیں لیتے ہی کاٹ دی۔

صبح جونہی پھیرے دار غلام ہٹے۔مہر زریں روز کی طرح چہچہاتی اور قہقہے بکھیرتی ہوئی حجرے میں آدھمکی پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ دونوں سرنگ میں داخل ہو رہی تھیں لیکن چلتے چلتے اچانک زرینہ نے محسوس کیا سرنگ میں وہ تنہا ہی چل رہی ہے۔مہر زریں کے قدموں کی چاپ شاید کہیں پیچھے ہی ڈوب کر رہ گئی تھی وہ سرنگ کی پتھریلی دیوار کے ساتھ لگ کر اندھیرے میں اُس کے پاؤں کی آہٹ سننے لگی لیکن سرنگ گہرے سکوت اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی چاپ، کوئی آہٹ، کوئی دھمک بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تاریکی میں ایک پُراسرار خاموشی ہونک رہی تھی۔زرینہ کو یوں معلوم ہوا جیسے یہ گہری خاموشی اس کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہی ہو۔اس احساس کے ساتھ ہی سینے کے اندر اُس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے اس نے سرگوشی کے انداز میں آواز دی۔

''مہر زریں!''

لیکن یہ سرگوشی اس کے آس پاس ہی سسک کے رہ گئی۔

''مہر زریں!تم کہاں ہو؟''

اس مرتبہ اس کی کہی ہوئی آواز اندھیری سرنگ میں سانپ کی طرح رینگتی ہوئی چلی گئی۔ یکلخت وہ کسی خطرے کے احساس سے لرز اٹھی۔اُسے خیال آیا۔شاید مہر زریں سرنگ میں داخل ہی نہیں ہوئی اور دہانہ ہی سے یا تو لوٹ گئی تھی یا کسی پُراسرار طاقت نے اُس کا گلا دبوچ لیا تھا اور وہ اپنے حلق سے آواز تک نہ نکال سکی تھی۔

پتھریلی دیوار کی خنکی اس کی کمر میں سرایت کرتی جا رہی تھی شاید یہ خوف کی لہر تھی جو اس تاریک اور سنسان سرنگ میں تنہائی کے خوف سے پیدا ہوا تھا۔اس کا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سردی کے باوجود ماتھے پر پسینے کی نمی تیر رہی تھی۔مہر زریں کا اچانک گم ہو جانا ایک معما تھا جو اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور وہ ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکی تھی اُسے اب کیا کرنا ہے۔

اگر تاریک حجرے کا وہ راستہ بھی بند کر دیا گیا جس کا زینہ اتر کر وہ سرنگ کے دہانے میں داخل ہوئی تھی تو وہ اسی تاریک اور لمبے غار میں سسک سسک کر مر جائے گی۔اس خیال کے آتے ہی اس کے جسم پر ہزاروں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔کہیں مہر زریں نے اس

کو ہلاک کر دینے کی نہ سوچی ہو ورنہ وہ خود کہاں غائب ہو گئی؟

کیا اُسے واپس جانا چاہیے؟

لیکن پھر خود بخود اُس کے قدم سوانا بابا کے حجروں کی طرف اٹھنے لگے وہ معلوم کرنا چاہتی تھی آیا سرنگ کا دہانہ بدستور بند ہے یا......

اندھیرے میں دیوار کا سہارا لئے وہ ہولے ہولے چلتی رہی۔ سرنگ کم و بیش نصف کوس تک طویل تھی اور محض سمت سے اُس نے اندازہ لگایا تھا اس کا دوسرا سرا جھورہ ندی کے کنارے کھلنا چاہیے کیونکہ قلعہ کی فصیل سے جنوبی سمت جھورہ ندی کوئی نصف پون کوس ہی کے فاصلہ پر تھی۔

اندھیرے میں وہ کوئی آہٹ بھی پیدا نہیں کر رہی تھی۔ یہ اُس کے دل کا خوف ہی تھا جس نے اس کے قدموں میں بلی کی سی نرمی اور آہستگی پیدا کر دی تھی ایک سحر زدہ انسان کی مانند چلتی ہوئی آخر کار سوانا کے حجروں کے قریب پہنچ کر رک گئی اور خوف اس کے دل میں سانپ کے پھن کی طرح سر اٹھا کر جھومنے لگا۔ ایک لمحہ دیوار کے ساتھ لگی وہ کسی آہٹ یا آواز کا انتظار کرنے لگی لیکن معلوم ہوتا تھا ان حجروں پر بھی جیسے سکوت مرگ طاری تھا۔ ساری سرنگ ایک ٹھنڈی اور گہری خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی البتہ سانپوں والے حجرہ سے کبھی کبھار پھنکاریں سی ضرور سنائی دیتی تھیں جو اس تاریک سناٹے میں خوف کی لہریں پیدا کر رہی تھیں۔

زرینہ ہولے ہولے سوانا کے حجرے کی طرف کھسکنے لگی۔ اچانک اُسے اندر سے سرگوشی کی آواز سنائی دی۔ مدھم، پُراسرار اور خوفناک سرگوشی...... زرینہ نے دروازہ کے ساتھ کان لگا دیئے جس کے چوبی پٹ محض بھیڑ دیئے گئے تھے۔ سوانا بابا کسی کے ساتھ مدھم آواز میں گفتگو کر رہا تھا جسے سرگوشی ہی کہا جا سکتا تھا۔ پہلے تو زرینہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر آہستہ آہستہ وہ الفاظ اور ان کا مفہوم سمجھنے لگی۔ سوانا کہہ رہا تھا۔

”بس تم یہ سندیس راج محل تک پہنچا دو راجکماری چندر کلا یہ انگوٹھی دیکھتے ہی سمجھ جائے گی۔“

”لیکن بابا! تمہیں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ تم ایک خوفناک جوا کھیل رہے ہو...... اگر بات الٹ ہو گئی تو......“

سوانا نے غصیلے لہجہ میں اپنے مخاطب کی بات کاٹ دی۔

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ اس وقت صرف پانچ سات ہزار سپاہی پورے فیروز آباد پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ محلات کے اندر جو کچھ ہو گا اُسے میں سنبھال لوں گا۔ بیگم شیرازی میرے اشاروں پہ ناچ رہی ہے۔ وہ خود فیروز شاہ کو ٹھکانے لگا دینا چاہتی ہے لیکن اگر اس نے میرا راستہ روکا تو کالا ناگ اسے بھی ڈس لے گا۔ بس اب زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

جس قدر جلد ہو سکے تم یہ پیغام راج محل تک پہنچا دو میں صرف سات روز تک انتظار کروں گا۔ اگر اس عرصہ میں مدد نہ پہنچی تو میں سمجھ لوں گا مہاراج خود کسی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں پھر شاید مجھے فیروز شاہ بہمنی کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے...... تم خود سوچو! اس وقت جب فیروز آباد میں تین چار ہزار سے زیادہ فوج نہیں اور قلعہ اور محلات کا ہر دروازہ میرے ہاتھ کی ایک ضرب سے کھل سکتا ہے۔ اس شہر پر قبضہ کرنا کیا مشکل ہے؟

اگر مہاراج ذرا ہمت سے کام لیں اور مجھ پر وشواش کریں تو میں بہمنی حکومت کا تختہ الٹ سکتا ہوں اور اس سمے جب دکن کے تمام لشکر بیجانگر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ ہمارے لئے میدان بالکل خالی ہے بس مہاراج پانچ سات ہزار سوار بھیج دیں باقی میں خود سنبھال لوں گا اور پھر دکن کی سرزمین پر بھی رائے رایاں کا زرد پھریرا لہلہائے گا۔ میں مہاراج سے صرف اپنی خدمت کا صلہ چاہتا ہوں لیکن اس وقت باتوں کا وقت نہیں...... بس تم فوراً بیجانگر کی طرف روانہ ہو جاؤ اور میرا یہ خط راج کماری تک پہنچا دو۔ میں نے اس میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔"

سوانا نے ایک لمبا سانس لیا اور اُس کا مخاطب جسے اس نے "رائے" کے نام سے پکارا تھا شاید یہ تقریر سننے کے بعد مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ پھر اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

"تمہیں اب روانہ ہو جانا چاہیے۔" سوانا کہنے لگا...... وہ بدمعاش خواجہ سرا لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر آنے ہی والی ہے۔ میں نہیں چاہتا تمہیں دیکھ سکے۔"

پھر ان کے اٹھنے کی آواز آئی اور زرینہ نہایت تیزی کے ساتھ سائیوں والے حجرے کی اوٹ میں ہو گئی۔ اُس کا بدن ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا تھا اور ایک نئی سازش نے جیسے اس کے دل کو کسی تنگ صراحی میں بند کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دروازہ کے پٹ

کھلے اور وہ دونوں اندھیرے میں سرنگ کے اندر ایک طرف کو مڑ گئے۔

"تمہارا گھوڑا کافی تیز رفتار ہے..... اگر تم چاہو تو آج شام تک بیجانگر پہنچ سکتے ہو۔"

"نہیں..... سلطانی لشکروں نے بیجانگر کو گھیر لیا ہے۔ مجھے ایک لمبا چکر کاٹ کر جانا ہو گا پھر بھی میں پو پھٹنے سے پہلے ہی اپنی منزل پہ پہنچ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر سوانا نے ایک تھیلی پیش کی۔ "یہ راستے کا خرچ" شاید رشوت ہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سرنگ کی دیوار پہ ابھرے ہوئے ایک کیل کو دبایا اور دہانے کا پتھر کسی گڑگڑاہٹ کے بغیر ایک طرف کو سرک گیا اور سرنگ میں اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ اُس میں سے ایک آدمی بخوبی گزر سکتا تھا۔ رائے نہایت تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا..... سوانا نے دیوار کا کیل اُوپر گھمایا خلا پھر بند ہو گیا اور پتھر پھر دہانے پر یوں جم گیا کہ ایک چھوٹی سی درز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ سوانا اپنے حجرے میں پلٹ آیا۔ اُس نے اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھالی اور شاید زریں کا انتظار کرنے لگا۔

زرینہ نے نہ صرف سوانا کی گفتگو سن لی تھی بلکہ دیوار کی اوٹ سے اس کو دیوار کی کیل گھماتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ جس سے دہانے پہ رکھا ہوا پتھر یوں سرک گیا تھا جیسے وہ ہلکی پھلکی لکڑی کا ایک تختہ تھا۔

اب وہ ہر قیمت پر اس پُراسرار سرنگ سے باہر نکلنا چاہتی تھی جس کے اندھیروں میں نت نئی سازشیں جنم لیتی تھیں۔ پہلے اُس نے شیرازی ہی کو خطرناک سمجھا تھا لیکن اب سوانا بابا اُسے شیرازی سے بھی زیادہ بھیانک اور خوفناک معلوم ہو رہا تھا جو دکن کی سرزمین پر دیورائے کے منحوس اقتدار کے لئے تانے بانے بن رہا تھا اور اس مقصد کی خاطر شیرازی کو بھی ٹھکانے لگا دینے پر تیار تھا جسے اُس نے پالا اور اپنی گود میں کھلا کر جوان کیا تھا۔ وہ دکن میں "دیوان" کے عہدے پہ رہ چکا تھا اور اب حالات کو ایک نئی کروٹ لیتے دیکھ کر اُس کے دل میں ہوسِ اقتدار کا شعلہ پھر بھڑک اٹھا تھا۔ اس وقت زرینہ کے سارے جسم پر ایک ٹھنڈی سی کپکپاہٹ طاری تھی..... وہ بلی ایسے نرم قدموں کے ساتھ بغیر کوئی آہٹ پیدا کئے ہولے ہولے رینگنے لگی پھر اندھیرے میں اس کا ہاتھ کیل پہ جا پڑا جسے اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ دبا دیا۔ کوئی آواز یا کھٹکا پیدا کئے بغیر دہانے کا پتھر سرک گیا اور زرینہ لپک کر خلا سے باہر آ گئی۔ لیکن باہر آتے ہی وہ پتھر کو کھسکا کر دہانے پر رکھنا نہیں بھولی، دہانہ پھر بند ہو

گیا تھا۔ زرینہ اس وقت ایک تنگ و تاریک سے غار میں کھڑی تھی۔ جس پر کریر کی جھاڑیاں سایہ کناں تھیں۔ جب وہ غار سے باہر نکلی تو چھورہ ندی اُس کے قدموں کے نیچے بہہ رہی تھی۔

اپنا منہ لپیٹ کر وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ قلعہ کے دروازے کی طرف چل دی جو یہاں سے ایک ڈیڑھ کوس سے کم فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ اڑ کر قصر لالہ میں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ پورے پانچ روز کے بعد اُسے آزادی نصیب ہوئی تھی لیکن ان دنوں میں اُس نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا وہ ناقابلِ یقین اور ناقابلِ اعتبار ہی معلوم ہوتا تھا۔ بالکل کسی جادوگر کے کھیل کی مانند، حیرت انگیز اور ہوشربا لیکن یہ کوئی جادو اور طلسم نہیں تھا۔ دکن اور بہمنی سلطنت کے خلاف بیک وقت دو سازشیں دریا کے بھنور کی طرح اندر ہی اندر نہایت تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھیں جیسے چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ جب وہ غار سے کافی دور ہٹ آئی تو اُس نے قلعہ کی فصیل پر سیاہ پرچم کو پھڑ پھڑاتے دیکھا۔ اچانک اس کے قدم رک گئے وہ چھورہ ندی کے کنارے کھڑی ہو کر فصیل پر لہراتے ہوئے پرچم کو دیکھنے لگی اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔

”اے دکن! میرے پیارے دیس! جس کی خاک میں میرے بزرگوں کے جسم ابدی نیند سو رہے ہیں۔ مجھے تیرے ذرے ذرے سے پیار ہے۔ تو ہمیشہ بہاروں کی مانند شگفتہ اور سرسبز رہا ہے اور تو نے اپنے بیٹوں کو زندگی کی توانائی بخشی ہے لیکن آج تیری چھاتی پہ زمین کے کیڑے رینگنے لگے ہیں۔ سانپ اور انسان مل کر تجھے ڈس لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کئی سال سے اپنے پھن میں زہر کی پرورش کی ہے اور اب وہی زہر تیرے حلق میں ٹپکا دینا چاہتے ہیں وہ تیری حسین فضاؤں کو مسموم کرنے کے لئے آئے ہیں...... لیکن مجھے اپنے بزرگوں کی قسم! جو تیرے آغوش میں محوِ خواب ہیں۔ میں تیری شاداب فضاؤں کو مسموم نہ ہونے دوں گی۔ میں تیری خاک پر تیرے فرزندوں کا بے گناہ لہو نہ گرنے دوں گی۔“

”اے دکن! تو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اپنی جان دے کر بھی تیرے امن کی حفاظت کروں گی۔ تیرے سیاہ پرچم اسی طرح لہراتے رہیں اور تیرے بہادر اپنے کوتل گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے اسی طرح تیرے دشمنوں کو پامال کرتے رہیں...... تو سدا شاداب رہے...... تو ہمیشہ آباد رہے۔“

یہ کہہ کر زرینہ نے ایک مرتبہ پھر فصیل کے بلند دروازے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے سیاہ پرچم کو دیکھا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگی۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ قلعے کا دروازہ عبور کر کے محلات کی طرف جا رہی تھی مگر جونہی اُس نے پائیں باغ کا راستہ کاٹ کر قصر لالہ کا رخ کیا اسے مہندی کی باڑھ کے پاس مہر زریں نظر آئی جو انہی دو غلاموں کے ساتھ باغ میں جا رہی تھی جو زرینہ کے حجرے کے باہر پہرہ دیا کرتے تھے اچانک اس کا ماتھا ٹھنکا کہیں وہ اُسے ہی تلاش نہ کر رہی ہو؟

زرینہ لپک کر دیوار کی اوٹ میں ہو گئی اور ہولے ہولے قصر لالہ کی طرف کھسکنے لگی۔ جب وہ دروازے میں داخل ہوئی تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا پھر وہ طویل غلام گردشوں میں لپکتی چلی گئی۔

بیگم جہاں اپنے کمرے ہی میں تھی اور پرتھال اس کی پالتو بلی کو دودھ پلا رہی تھی۔ زرینہ کو دیکھتے ہی دونوں چونک اٹھیں۔ اسے آداب شاہی کے مطابق کورنش کی رسم ادا کرنا بھی یاد نہ رہی اور وہ بھاگتی ہوئی بیگم جہاں کے قدموں میں گر پڑی۔

"ارے زری......تو......ہم تو تیرے لئے پریشان تھے۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں اُس کتیا شیرازی نے تجھے مروا ہی نہ ڈالا ہو۔ آخر تو اتنے دن کہاں غائب رہی؟"

"بیگم حضور! میں مر ہی گئی ہوتی تو اچھا تھا...... لیکن نہیں...... مجھے آپ سے ملنے کے لئے زندہ رہنا چاہیے تھا......"

بیگم جہاں نے اُس کا سر اٹھایا تو آنسو اُس کے رخساروں پہ بہہ رہے تھے۔

"مگر تو رونے کیوں لگی۔ کیا ہوا ہے تجھے؟"

"میرے منہ میں خاک علیہ خانم! میرے دل میں شعلے دہک رہے ہیں۔ میں سانپوں کے منہ سے نکل کر آئی ہوں۔ سارا ملک خطرہ میں ہے ظلِ سبحانی خطرہ میں ہیں ولی عہد خطرے میں ہیں، سارے فیروز آباد پر سانپ چھوڑ دیئے جائیں گے۔"

بیگم جہاں اور پرتھال متحیر نگاہوں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کہیں زرینہ پاگل تو نہیں ہو گئی۔

"نہیں بیگم حضور! میں دیوانی نہیں ہوں۔ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آپ کو اطلاع دینے آئی

ہوں..... میرے پاس وقت بہت ہی کم ہے۔" آنسو ابھی تک اُس کی آنکھوں میں لڑکھڑا رہے تھے۔

"تو کیا سنا ہے تو نے......"

پھر جب زرینہ نے روتے روتے وہ تمام حیرت انگیز اور پُر اسرار واقعات بیان کئے جو اُسے قصرِ شیرازی میں پیش آئے تھے تو بیگم جہاں اور پرتھال دونوں ہی پتھر کی مورتیاں بن گئیں۔ اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔

"بیگم حضور!" زرینہ گلوگیر آواز میں کہنے لگی۔ "خدا کے لئے ولی عہد کو بچایئے۔ اُن کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں کئی دن سے آپ کو ملنے اور خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے بے تاب تھی۔ لیکن وہ شیطان مہر زریں سایہ کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ اس وقت بھی شاید وہ پائیں باغ میں مجھے ہی ڈھونڈتی پھر رہی ہے لیکن میں واپس جاؤں گی اور اپنی جان پر کھیل کر بھی سلطان معظم کی حفاظت کروں گی۔"

"ہاں تمہیں جانا ہی چاہیے۔" بیگم جہاں نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن زری! اب تجھے جان پر کھیلنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ سلطان کی واپسی سے پہلے ہی اس ناگن کا سر کچل دیا جائے گا۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ قصرِ شیرازی میں آج ہی تمہاری حفاظت کا انتظام ہو جائے گا۔"

جب بیگم جہاں نے پرتھال کی طرف دیکھا تو کانپ اٹھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح ہو رہی تھیں اور بدن پر لرزہ طاری تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خون کی تیزی سے اُس کا جسم پھٹ جائے گا۔

"بانو!" بیگم نے کپکپاتی ہوئی آواز میں اُسے مخاطب کیا لیکن پرتھال یوں گم صم تھی جیسے وہ یہاں موجود ہی نہیں تھی۔ واقعی اس وقت وہ قصرِ لالہ میں نہیں تھی، فیروز آباد میں تھی، دکن میں نہیں تھی، بلکہ دریائے مدگل کے اُس پار بیجانگر کی بلند فصیل سے باہر پہاڑی ٹیلوں میں بھٹک رہی تھی۔ اچانک اُس کے لبوں کو جنبش ہوئی شاید وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔



12

تشویش انگیز خبریں

نیا فیصلہ

بیجانگر کے اردگرد پھیلا ہوا سلسلہ ہائے کوہ جو اس کے لئے قدرتی حصار کا کام دے رہا تھا۔ اس وقت بہمنی لشکروں کا مسکن بن گیا تھا۔

سیاہ پرچموں نے تین اطراف سے شہر کو گھیر لیا تھا۔

بھیڑیے اپنے اپنے بھٹ میں بیٹھے غرا رہے تھے اور اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے وہ حسب عادت اپنی کچلیاں چمکانے لگے تھے۔ بیجانگر کے پہاڑ وکنی بھیڑیوں کے بھٹ بن گئے تھے اور اُن کی خوفناک غراہٹوں کی بازگشت اُس بلند و مہیب فصیل سے ٹکرا رہی تھی۔ جس کے آہنی دروازے پر "رائے رایاں" کا زرد پھریرا پیغام رساں کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا مگر فصیل کے دروازے بند تھے اور اس طرح کرناٹک کا سورما مہاراج زخمی سانپ کی مانند پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"ہم فیروز شاہ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

راج محل کے ایوانوں میں جو سنگِ احمر سے تعمیر کئے گئے تھے دیوانے کی زخمی آواز دور تک گونجتی چلی گئی اور در و دیوار پر ایک زلزلہ سا طاری ہو گیا۔

ادھر پہاڑی غاروں میں بھیڑیوں کی غراہٹ ہر لحہ بڑھتی جا رہی تھی...... انہیں رہ رہ کر اپنے شکار پر غصہ آ رہا تھا جو فصیلوں کے پیچھے دبک گیا تھا۔ اُس کے سردار نے کہا۔

"ہم دیوانے کو زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنے حضور میں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

دونوں حریف ایک دوسرے کے متعلق ایک ہی فیصلہ رکھتے تھے۔

"زندہ گرفتاری......"

پہاڑی غاروں میں دشمن کی تاک میں بیٹھے ہوئے بھیڑیئے ایک ساتھ غرائے۔

"حملہ" شاید وہ محاصرہ کی بے جوش وخروش زندگی سے تنگ آ گئے تھے اور ہر قیمت پر اپنے شکار پر جھپٹنا چاہتے تھے جو چالاک لومڑی کی طرح شہر میں دبکا بیٹھا تھا۔ پھر وہ سب کے سب اپنے سردار بھیڑیئے کے بھٹ میں جمع ہوئے دشمن کی سرزمین پر وہ زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ انہیں جلد سے جلد اپنے ملک کو لوٹ جانا تھا۔

محاصرہ کے ساتویں دن کا کپکپاتا ہوا بنفشی سورج اونچے نیچے ٹیلوں کی اوٹ میں غروب ہو چکا تھا اور بھیانک رات بیجانگر کے اردگرد زخمی مگرمچھوں کی طرح سسیا رہی تھی۔ پہاڑی سے ہٹ کر ایک وسیع میدان کے وسط میں جہاں چاروں طرف سپاہیوں کی چھولداریاں تنی ہوئی تھیں۔ سلطانِ دکن کی سفری بارگاہ اپنی منقش قناتوں، گنبد نما خیموں اور سرسراتے ہوئے ریشمی پردوں کے ساتھ سب سے ممتاز و منفرد نظر آ رہی تھی۔ اس کے دروازوں پر لوہے کی سلاخوں کے ساتھ بندھی ہوئی مشعلیں فروزاں تھیں جن کی تھرتھراتی ہوئی روشنی میں ارگو خان کے چاق و چوبند مسلح سپاہی لمبے لمبے بھالے اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ سفری بارگاہ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر اصطبل تھا جس میں صرف خاصہ کے گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔

سات روز کے محاصرہ کے بعد سلطان نے اپنے فوجی سرداروں کی مجلسِ مشاورت طلب کر لی تھی۔ اس وقت امیر فضل اللہ، شہزادہ حسن، خانخاں احمد ارگو خان، کوسل رائے قباچہ فولاد خاں سیستانی شمشیر خاں، داؤد خاں، (جو امیر فضل اللہ کے لشکر برار کا نائب سالار تھا) میاں سدھو سرنوبت پیادہ فوج کا سالار اور دوسرے سرکردہ امیر، سرداراں، علما اور عامل سلطان کی بارگاہ میں حاضر تھے جن کی رائے پر وہ اعتماد کرتا تھا۔ ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک اپنی روایتی مستعدی اور پوری ہوشیاری و بیداری کے ساتھ سلطان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے جو پہلے سے کچھ زیادہ فکرمند نظر آ رہا تھا۔

وہ سب قریباً ایک پہر سے بیٹھے جھلا اور غرا رہے تھے اور ابھی تک کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

ظاہر تھا بہمنی سلطان بیجانگر کو فتح کیے بغیر ٹلنے والا نہیں تھا لیکن رائے رایاں کا شہر ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ بن گیا تھا اور اس کی بلند و بالا فصیل جیسے سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار میں منتقل ہوتی جا رہی تھی۔ دیورائے کو اسی فصیل پر غرور و ناز تھا وہ جانتا تھا۔ فصیل در فصیل گھرے ہوئے اس شہر کو فتح کرنا کم از کم انسانی طاقت سے ضرور باہر ہے مگر سلطان نہ صرف شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کی قسم کھا کر آیا تھا بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد دیورائے کو پابہ سلاسل دکن لے جانا تھا۔

بہمنی لشکروں نے شہر کو تین اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ صرف جنوب مشرق کی ایک سمت کھلی تھی اور اسی طرف سے دیورائے نے کرناٹک کے دوسرے قلعوں کے ساتھ نامہ و پیام اور رسد کا سلسلہ قائم رکھا تھا۔

سب سردار یہی چاہتے تھے بیجانگر پر تین اطراف ہی سے ایک بھرپور حملہ کر کے انجام خدا پر چھوڑ دیا جائے لیکن سلطان نے اس مشورہ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ وہ سر جھکائے کسی گہری فکر میں منہمک تھا اور اس کے ساتھ ہی بارگاہ پر سناٹا سا چھا گیا تھا۔ وہ سب کے سب محاصرے سے قریباً اکتا گئے تھے اور کوئی فیصلہ کن ہنگامہ چاہتے تھے۔ جو ندی کی اس پرسکون اور خاموش حالت کو یکسر بدل ڈالے۔

"اس مرتبہ فصیل کو توڑ کر قسمت آزمائی کی جائے ظلِ سبحانی!"

اچانک ارگو خاں کی بھاری آواز نے خاموشی کا سینہ پھاڑ دیا۔

"تیر اندازوں کی حفاظت میں سرنگ لگانے والے فصیل کو پاش پاش کر سکتے ہیں۔"

ارگو خاں کی اس رائے کو سب نے پسند کیا۔ واقعی بیجانگر کا حصار توڑنے کے لئے فصیلوں کی شکست و ریخت ضروری تھی کھلے میدان میں وہ دیورائے کی پانچ لاکھ سپاہ سے نپٹ سکتے تھے۔ سلطان بدستور خاموش تھا۔ ارگو خاں کی نگاہیں سخت اور کھردرے چہروں پر کئی استفہامیے بناتی چلی گئی۔

"ہم جانتے ہیں فصیل کی حفاظت کی خاطر دیورائے اپنا آخری سپاہی بھی کٹوا دے گا۔ وہ سرنگ لگانے والوں پر پتھروں کی بارش کر دے گا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اس کے سپاہیوں کی تعداد شائد قلعہ کی تعمیر میں صرف ہونے والی اینٹوں سے بھی زیادہ ہے۔ جب تک باہر نکل کر مقابلہ نہیں کرتا۔ وہ ہر طرح محفوظ ہے۔"

یہ مایوس کن جواب سن کر سرداروں کے چہروں پر ایک اور جھنجھلاہٹ کے آثار طاری ہو گئے۔ انہوں نے جواب طلب نگاہوں سے صدر جہاں امیر فضل اللہ شیرازی کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہیں...... جو پوچھ رہی تھیں۔

''امیر! تم کوئی راستہ بتاؤ۔ لڑائی کی نوبت کب بجے گی؟ واللہ! ہم دیوراے کا لہو چاٹے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔''

''تم اس قدر پریشان کیوں ہو گئے۔ تلواریں ایک مرتبہ پھر تلواروں سے ضرور ٹکرائیں گی۔ وہ زیادہ دیر تک قلعہ بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔ رسد ختم ہوتے ہی فصیل کے دروازے کھل جائیں گے اور دیوراے اپنی فوج لے کر باہر نکلے گا۔''

امیر فضل اللہ کی رائے نے انہیں اور زیادہ مایوس کر دیا۔ وہ تو محاصرہ سے تنگ آئے ہوئے تھے اور امیر نے یہی مشورہ دیا تھا۔ محاصرہ جاری رہنا چاہیے تا آنکہ قلعہ والوں کی رسد ختم ہو جائے۔

''لیکن رسد کب ختم ہو گی؟''

خانخاناں کے اس طنز آلود سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا پھر بیجانگر کی ایک سمت کھلی تھی اور قلعہ کے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری تھا۔

''ہم کب تک لومڑیوں کی طرح دبکے پڑے رہیں گے؟''

''شب خون کیوں نہ مارے جائیں؟''

''اگر محاصرہ ہی جاری رکھنا ہے تو قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لینا چاہیے۔''

بھیڑیے پھر غرانے لگے تھے۔

''ہمارے پہلے حملہ نے دیوراے کی کمر ہمت توڑ دی ہے۔ دوسرا حملہ اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گا۔''

''حملہ...... حملہ......''

وہ جنگ کے جوش میں پاگل ہو رہے تھے۔ اچانک سلطان نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور اپنا ہاتھ بلند کر دیا۔ یہ خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ کافوری شمعوں کی روشنی میں سلطان کا چہرہ چمک رہا تھا شاید اس نے اس پیچیدہ گتھی کا حل تلاش کر لیا تھا جس نے دکن کے فوجی افسروں کو دیوانہ سا کر دیا تھا۔

سلطان کا کھلی آستین والا ہاتھ بلند ہوتے ہی وسیع و عریض بارگاہ پر خاموشی چھا گئی انہوں نے اپنی مضطرب نگاہیں سلطان کے چہرے پر مرتکز کردیں جو کہہ رہا تھا۔

"بیجانگر پر حملہ ضرور ہوگا۔ لیکن حملہ سے پہلے ہمیں اس کے بازو کاٹ دینا ہوں گے۔ تم اپنے سلطان پر بھروسہ رکھو۔ ہم اسی وقت حملے کا حکم دیں گے۔ جب فتح یقینی ہوگی لیکن دیورائے کو قلعہ سے باہر نکالنے کے لئے ہم نے جنگ کے لئے نقشے بدل ڈالے ہیں۔ کیا تم بیجانگر کی خاطر کرناٹک کو چھوڑ دو گے؟ نہیں...... ہم ایک شہر کے لئے نہیں ایک ملک سے لڑنے آئے تھے۔ احمد خاں! تم دس ہزار سوار لے کر جنوب کی طرف نکل جاؤ اور کرناٹک کا جو قلعہ سامنے آئے اس پر اپنا پرچم نصب کردو۔ امیر فضل اللہ! تم اپنے لشکر کے ہمراہ پنکاپور کی طرف روانہ ہو جاؤ اور اُسے روند ڈالو۔ حسن خاں! تم اپنے ایک دستہ کے ساتھ بیجانگر کے نواحی دیہات میں چکر کاٹو اور قلعہ کا رستہ رسد کاٹ دو۔ اپنے جانبازوں کے ہمراہ ہم محاصرہ جاری رکھیں گے اور دیورائے کا انتظار کریں گے کہ اُس کی بدبختی کب قلعہ کا دروازہ کھول کر اُسے باہر دھکیلتی ہے۔"

سلطان کے یہ احکام سن کر تمام امیر، خاں اور سردار حیران و ششدر رہ گئے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا بیجانگر کی فتح سے پہلے وہ پورے کرناٹک کو روند ڈالنا چاہتا ہے بہرحال اس نے ایک بہترین فیصلہ کیا تھا اور تمام افسروں نے اس کی اعلیٰ ذہانت کا اعتراف کرلیا جو جنگ کے میدانوں میں ہمیشہ ان کی صحیح راہنمائی کرتی تھی اس کا تازہ فیصلہ اس امر کا ثبوت تھا کہ جنگ جیتنے کے لئے صرف تلوار کی نہیں دماغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

خانخاناں، امیر فضل اللہ اور شہزادہ حسن خاں نے اطاعت میں گردنیں جھکا دی تھیں۔ سلطان کے فیصلہ کے مطابق جنگ کے خطوط بیجانگر سے نکل کر اب پورے کرناٹک کو اپنے گھیرے میں لے لینا چاہتے تھے۔ یہ فیصلہ افسروں اور سپاہیوں کی تمنا کے عین مطابق تھا۔ انہیں تلواریں لہراتے اور نیزے مارنے کا موقع میسر آ گیا تھا البتہ ارگو خاں کے چہرے پر بدستور جھنجلاہٹ کی لکیریں تھرک رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا اسے سلطان کے ہمراہ بیجانگر کے محاصرہ پر رہنا ہوگا اور کون کہہ سکتا ہے قلعہ کے دروازے کب تک بند رہیں گے اور ارگو خاں کی تلوار کب تک نیام میں پڑی تڑپتی رہے گی۔

وہ ان بہادروں میں سے تھا جو میدان میں اترنے کے بعد ایک لمحہ بھی چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کی پیٹھ آٹھوں پہر گھوڑے کی پشت پر رہنی چاہیے اور ہاتھ میں وہ کھنچی ہوئی تلوار جو دشمن کے لہو سے موت کے نوشتے تحریر کرتی ہے۔

غالباً سلطان نے ارگو خاں کے چہرے پر اُس کے دل کی بے چینی کو کروٹ بدلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ''یقین رکھو ارگو خاں ہمارے اندازے بہت کم غلط نکلتے ہیں۔ امیر فضل اللہ اور احمد خاں کے جاتے ہی جب ہماری جمعیت تھوڑی رہ جائے گی۔ دیورائے کی بدبختی اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ وہ قلعہ کا دروازہ کھول کر خود ہمیں جنگ کے لئے للکارے گا۔ اس وقت تمہارا برچھا پیاسا نہیں رہے گا۔

ارگو خاں نے جواب میں مسکرا کر سر جھکا لیا۔ اس کے درشت اور کھردرے چہرے پر سفاکی کا پہرہ رہتا تھا مگر اس وقت مسکراہٹ اُس سفاکی سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک تھی جیسے موت کا فرشتہ ہنس دیا ہو۔

''ہمیں کب روانہ ہونا چاہیے ظلِ سبحانی!''

امیر فضل اللہ نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر پوچھا۔

''آج ہی رات....'' سلطان نے جواب دیا۔ ''ان اندھیروں میں تم لشکر لے کر نکل جاؤ۔ صرف حسن خاں کی روانگی دن کے وقت ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ تمام سرداروں نے اپنی نشستیں چھوڑ دیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مجلس ختم ہوئی اور اب وہ خلوت چاہتا ہے۔ سردار کورنش ہی ادا کر رہے تھے کہ اس نے اپنی پشت پر ملتے ہوئے حریری پردے کو جنبش دی اور بجلی کے سے جھپاکے کے ساتھ خیمہ سرا کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کافوری شمعوں کی روشنی میں فوجی سردار موت کے بھیانک سایوں کی طرح بکھرنے لگے۔

مہا وشنو کے نام پر

امیر فضل اللہ شیرازی اور خانخاناں کے لشکروں کی روانگی میں اگرچہ بہت احتیاط سے کام لیا گیا تھا اور بڑی خاموشی کے ساتھ گھوڑوں پہ نمدے کس لئے گئے تھے پھر بھی بیجانگر

کی فصیل سے کرناٹک کے عقاب نظر خبر رسانوں نے دکنی سپاہ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ رات کے اندھیروں کا سینہ چیرتی ہوئی بیجے نگر کی فصیلوں سے جا ٹکرائی تھی اور کرناٹک کا نیا سیناپتی راج سنگھ جو دیورائے کا بھانجہ تھا ایک بلند برجی پہ کھڑا بے شمار سیاہ دھبوں کو صف در صف پہاڑی گھاٹیوں سے دور..... اور دور ہوتے دیکھ رہا تھا۔

دونوں لشکروں کی روانگی نصف رات تک جاری رہی دشمن کو بے خبر رکھنے کے لئے انہوں نے ایک مشعل تک روشن نہیں کی تھی اور اندھیرے ہی میں اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیئے تھے لیکن دشمن کا سپہ سالار ایک پہر سے فصیل پر حیران و ششدر کھڑا اس روانگی کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اندازہ کے مطابق دکن کے آدھے سے زیادہ لشکر نامعلوم سمتوں کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ جب رات کے آخری پہر زرد چاند پہاڑوں پہ جھکنے لگا تو راج سنگھ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ سلطان کا خاص پرچم بدستور بیجانگر سے باہر کھلے میدان میں نصب تھا لیکن ایک خیال سانپ کی مانند اُس کے ذہن میں رینگنے لگا..... کہیں بہمنی لشکر شب خون کے ارادہ سے تو روانہ نہیں ہوئے؟ ممکن ہے وہ ایک طویل چکر کاٹ کر قلعہ پر اُس سمت سے حملہ کر دیں جو محاصرہ سے ابھی تک محفوظ تھی۔

پھر اُس نے فوراً ہی اپنے افسروں کو کچھ ہدایات روانہ کیں اور خود بھی برجی سے نیچے اُتر آیا۔

بیجے نگر کے مہاشوالہ میں صبح کا پہلا گجر گونج اٹھا اور سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ بہمنی لشکر شبخون مارنے کے ارادہ سے نکلے ہیں۔ کوئی دم میں صبح کا اجالا پھیل جائے گا اور اس اجالے میں قلعہ پر حملہ کرنا حماقت ہی تھی لیکن اب اس کے دماغ میں نئے وسوسوں اور اندیشوں نے سر اُبھارا۔

کیا سلطان فتح سے مایوس ہو کر محاصرہ اٹھا لینا چاہتا ہے یا اس کے لشکر کرناٹک کے دوسرے قلعوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں؟

بیجانگر کے بعد ادونی اور ڈیکاپور کے علاوہ کرناٹک کے اور کسی بھی قلعہ میں بہمنی لشکروں کی یلغار روکنے کی سکت نہیں تھی۔ اگر سلطان نے انہی قلعوں کو مسمار کرنے کے لئے لشکر روانہ کیے ہیں تو کرناٹک میں ایک تباہی پھیل جائے گی۔

سنگھ بہادر سورما ہی نہیں تھا بلکہ جنگی چالوں کو سمجھنے میں اُس کی فراست ہمیشہ صحیح رائے متعین کرتی تھی اور حقیقت یہ ہے مہاراج دیورائے کی فوجی اور سیاسی عظمت محض اس کے تدبر پہ قائم تھی ورنہ وہ بہت عرصہ پہلے کرناٹک کے ان ہندو راجپوتوں کے قہر و غضب کا نشانہ بن گیا ہوتا جو اس کے سیاسی مظالم اور رائے رایاں کے جذبۂ برتری کا شکار ہوئے تھے۔ راج سنگھ کسی خاندانی جھگڑے کی وجہ سے دیورائے سے ناراض تھا لیکن بعد میں اُس نے اپنے بہادر بھانجے کو ادونی ایسے مضبوط قلعہ کا حاکم بنا کر صلح کر لی تھی اور چند ہی روز قبل اُسے بیجانگر میں بلایا تھا۔ بجے نگر کی پہلی لڑائی میں سیناپتی وردھن کی موت ایسے بھیانک اور لرزہ خیز طریق سے ہوئی تھی کہ بڑے بڑے سورماؤں کے جگر کانپ اٹھے تھے۔ سیناپتی ہونے کے علاوہ وہ مہاراج کا منظورِ نظر بھی تھا اور شاید اُس نے وردھن کو راجکماری چندر کلا کے لئے منتخب بھی کر لیا تھا لیکن لڑائی میں جب وہ خود سلطان پر حملہ آور ہوا تھا بہمنی حکمران کا بھالا اس کا پیٹ پھاڑتا ہوا نکل گیا تھا اور بجے نگر کے قلعہ کے علاوہ دیورائے کے راج رنواس میں بھی کئی روز تک اُس کی موت کا سوگ منایا گیا تھا۔ وردھن کے بعد اب راج سنگھ ہی مہاراجہ کی اُمیدوں کا مرکز تھا اور اُسے سیناپتی مقرر کر کے وہ بہمنی لشکروں کے محاصرہ کے باوجود کچھ مطمئن سا نظر آنے لگا تھا۔ اس نازک سے سنگھ کا جنگی تدبر ہی اُسے سہارا دے سکتا تھا...... لیکن کرناٹک کے قلعوں پر بہمنی یلغار کے خیال سے راج سنگھ بھی کانپ اٹھا۔ وہ جانتا تھا۔ دکن کے بپھرے ہوئے سپاہی پورے ملک کو روند ڈالیں گے اور رائے رایاں کا پھریرا صرف بیجانگر کی فصیلوں پر لہراتا رہے گا۔ وہ بھاری قدموں اور مضطرب دل کے ساتھ دیورائے کے کمرۂ خاص میں داخل ہوا۔ مہاراجہ چند ہی ساعت پہلے یہ خبر سن چکا تھا کہ فتح سے ناامید ہو کر بہمنی سلطان نے محاصرہ اٹھا لیا ہے اور اُس کے لشکر راتوں رات دریائے تنگ بھدرا کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ اس خبر نے اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ حالانکہ صبح جب پہلے سنگھ کے ساتھ وہ بیدار ہوا تو اُس کے چہرے پر نامعلوم پریشانیاں ناچ رہی تھیں اور آنکھوں میں موت کا خوف سہما بیٹھا تھا جیسے اس نے کوئی بھیانک سپنا دیکھ لیا ہو۔ راج سنگھ کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔

"سنگھ! کیا ہم نہیں کہتے تھے فیروز شاہ کو بجے نگر سے مایوس و نامراد لوٹنا پڑے گا؟ اس ناکامی کے بعد اب وہ زندگی بھر کبھی اِدھر کا رُخ نہیں کرے گا۔"

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں فیروز شاہ لوٹ گیا؟"

سنگھ آبنوس کے ایک منقوش تخت پر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں وہ سندر داسی دروازے کی طرف کھسک گئی تھی جو دیورائے کے لئے "صبح کا دارو" تیار کر رہی تھی۔

"ہم نے تو یہی سنا ہے اُس کا لشکر اپنے خیمے اکھاڑ چکا ہے۔"

لیکن فیروز شاہ بدستور محاصرہ کئے پڑا ہے۔"

"کیا......؟" سنگھ کی زبانی سلطان کے قیام کی خبر سن کر دیورائے بوکھلا سا گیا۔

"مہاراج! اگر میرا قیاس غلط نہیں تو بہمنی حکمران نے ایک خطرناک چال کھیلی ہے۔ جو سارے ملک کو تباہی میں جھونک سکتی ہے۔"

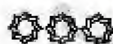
دیورائے جو ریشمی تکئے کے سہارے نیم دراز تھا...... ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

خطرناک چال؟ ہم کچھ نہیں سمجھ سکے راج سنگھ!"

"میرا خیال ہے......" سنگھ نے تشویش انگیز لہجے میں کہا۔ "سلطان نے اپنے لشکر کرناٹک کے وسطی قلعوں کو پامال کرنے کے لئے روانہ کر دیئے ہیں اور خود اپنی فوج لئے محاصرہ پر پڑا ہے تاکہ ہمیں جنگ میں اُلجھائے رکھے اور ہم دوسرے قلعوں کو مدد نہ پہنچا سکیں...... یہ ایک خطرناک چال ہے۔

مہاراج! اس طرح بیجے نگر چھوڑ کر وہ پورے کرناٹک پر قبضہ کر سکتا ہے اور پھر اس شہر کو زیر کرنا بھی کچھ مشکل نہیں ہوگا۔"

دیورائے کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں کانپنے لگیں۔ راج سنگھ کا قیاس غلط نہ تھا اس نے سلطان کے تباہ کن ارادوں کی بو سونگھ لی تھی اور مہاراج کو انہی آنے والے خطروں سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ دیورائے جو چند لمحے قبل بہمنی لشکروں کے کوچ کی خبر سن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور دارو کے پیالہ سے اُس خوشی کو دوچند کرنے کا ارادہ کئے بیٹھا تھا اچانک مہادشنو کی اُس مورتی کی مانند ساکت و جامد ہو کے رہ گیا جو دیورائے کی پشت پر دیوار کے ساتھ ایستادہ تھی۔



مہادشنو...... خالقِ کُل جو تمام روشنی کا ظہور اور سنوگن کا مجسم ہے۔ جو ہر ذی روح کو نیکی عطا کرتا ہے اور ظہور کائنات سے پہلے انسان کی شکل میں شیش ناگ کے بستر پر لیٹے

ہوئے سمندروں پر تیرتا رہتا تھا۔ جو دھرتی کا خالق، اس کا محافظ اور اس کو تباہ کر دینے کی قوتیں رکھتا ہے جس نے کئی صورتوں میں اوتار لے کر ظالموں اور راکھششوں کو تباہ و برباد کیا۔ گنگا جس کے پاؤں سے خارج ہوتی ہے۔ جو اپنی استری لکشمی کے ساتھ ساتھ کنٹھ کے مقام پر رہتا اور جانوروں میں سے صرف گرڑ (گدھ) پر سواری کرتا ہے جو ہمیشہ جوان اور خوبصورت رہتا ہے۔ جس کا رنگ شام سے ملتا جلتا نیلی فام اور جو اکثر قدیم مہاراجوں کی طرح زرق برق لباس پہنتا ہے۔ جس کے چار بازو اور چار ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ میں شنکھ (چاپیہ سنگھ) دوسرے میں درشن (وجرنابھ چکر) تیرے میں گرزا موسوم بہ گوکھی اور چوتھے میں پدم یعنی کنول کا پھول ہے۔ جس کے ایک ہاتھ میں شارنگ کمان اور دوسرے میں نندک تلوار رہتی ہے۔ جس کے سینہ پر بالوں کا ایک خاص نشان "شری ونس" بنا رہتا ہے۔ گلے میں کوستھ منی کی مالا اور بازو پر سیمنک جواہر لٹکتے رہتے ہیں جو اپنی لکشمی کے ساتھ کبھی کنول کے پھول پر بیٹھتا، کبھی شیش ناگ کے اوپر لیٹتا اور کبھی گدھ پر سوار ہوتا ہے۔ جس کے نام غیر فانی "اچیت" لا انتہا "اننت" "شیش ناگ پر سونے والا۔ اننت شائین، چار بازو والا "چتر بھج" پیٹ کے گرد رسی باندھنے والا "دامودر" محافظ مادہ گائے "گوند"، "گوپال" عناصر کا مالک "ہرشی کیش" پانی پر سونے والا "جل شائین" انسانوں کا معبود "جناردن" روشن اور منور "کیشور" سر پہ کلغی والا "کریتن"، لکشمی کا پتی "لکشمی پتی" رہا کرنے والا "مکند" دشمن مر "مراری"، آدم زاد "نر" پانی پہ حرکت کرنے والا "نارائن" پانچ ہتھیاروں سے مسلح "پنچایدھ" کنول کی ناف والا "پدم نابھ" زرد پوشاک میں ملبوس "پیتامبر" سب سے اعلیٰ "پروشوتم" وسدیو کا بیٹا کرشن "واسدیو" سورگ کا مالک "دی کنٹھ ناتھ" زمانوں کا مختار "تریتے" اور اپنے ان مقدس اور پوتر ناموں کے ساتھ انسانوں کو شکتی دیتا اور مہاراجگان کے سروں پر اپنے ہاتھ کا سایہ رکھتا ہے اسی مہاوشنو کی مورتی کرناٹک کے مہاراج دیوراے کے سر پر بھی سایہ کناں تھی لیکن اس مقدس مورتی نے بھی نہ اُسے گمراہی سے باز رکھا نہ اس کی آتما کو شکتی بخشی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح دارو پیتا اور حسین کنواریوں سے کھیلتا تھا مگر اس وقت نجانے دیوراے کو کیا خیال آیا۔ راج سنگھ کی زبانی آنے والے بھیانک خطروں کا ذکر سنتے ہی اُس نے دارو کے پیالے کو ٹھوکر ماری اور بے اختیار مہاوشنو کی مورتی کی طرف پلٹ کر اوندھے منہ گر گیا۔ اس کی سوئی آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو تیرنے لگے تھے۔

اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا اور جب سنگھ نے پلٹ کر دیکھا تو راجگورو گورکھ ناتھ دہلیز پر کھڑا دیوانے کو مہادشنو کی مورتی کے سامنے سربسجود دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ دیوانے کا سر مہادشنو کے سامنے جھکا تھا جب اس نے گردن اٹھا کر راجگورو کی طرف دیکھا تو گلوگیر آواز میں بولا "راجگورو! ہمارے قریب آؤ۔ ہمیں اس سمے تمہارے مشورہ کی ضرورت ہے۔"

گورکھ ناتھ آگے بڑھ کر ایک چوبی تخت پر بیٹھ گیا۔ دیوانے کی حالت عجیب تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو تیر رہے تھے۔ وہ راجگورو کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"رات ہم نے بڑا بھیانک سپنا دیکھا ہے۔ دوشی نیل کنٹھ پہ سوار ہو کر ہم سے ملنے آئی تھی۔ اُس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر کمان میں رکھا اور ہماری چیخ پکار کے باوجود اُسے ہمارے دل پہ کھینچ مارا۔ اس کی آواز ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔ دوشی نے کہا تھا "مہاراج! میرا لہو آپ کی گردن پر ہے۔ میرے بعد آپ بھی اپنی بیٹی کی طرف سے دکھ اٹھائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ نیل کنٹھ پہ سوار دور پربتوں کی طرف اُڑ گئی اور ہم خون میں لتھڑے تڑپتے ہی رہ گئے۔ جب آنکھ کھلی تو صبح کا پہلا سنکھ بج رہا تھا۔ اُسی سمے ہم نے خبر سنی سلطان فیروز شاہ نے بیجے نگر کا محاصرہ اٹھا لیا ہے۔ اس خوشی میں ہم اپنے سپنے کو بھول گئے۔ اب راج سنگھ نے ایک اور ہی دل شکن خبر سنائی ہے کہ سلطان نے محاصرہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنے لشکروں کو کرناٹک کے قلعے روند ڈالنے کی خاطر روانہ کیا ہے۔ اس خبر نے ہماری آتما کا سکھ چھین لیا ہے اور ہماری سب خوشیاں پامال کر دی ہیں...... راجگورو! ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے دوشی کی روح ہمارے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے اور ہمارے دل پر کوئی گہرا چرکا لگانا چاہتی ہے۔ مہادشنو کی سوگند! ہم نے اُس کے لہو میں ہاتھ نہیں بھرے۔ تم دوشی کے باپ ہو اور اگر اُسے راج رنواس میں بلانا پاپ تھا تو اس کے لئے تم ہمیں شما کر چکے ہو۔ پھر دوشی ہمارے سپنوں میں کیوں آتی ہے؟

"بتاؤ! ہم اس کشٹ کے لئے کیا بلیدان کریں؟"

گورکھ ناتھ مہاراجہ کی بے تابی اور تشویش دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ "تو آج اس مورکھ کو بھی اپنے کشٹ کا دھیان آ گیا ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا مگر وہ تو دوشی کے بے گناہ لہو کی سوگند کھا چکا ہے کہ اُس کے دل پر بیٹی کے داغ کا چرکا ضرور لگائے گا۔ دیوانے کی

حالت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔

"سپنے تو آدمی کے اپنے ہی دھیان کی چھایا ہوتے ہیں مہاراج! آپ اس قدر پریشان نہ ہوں۔"

"نہیں راجگورو! ہمارے دل کو قرار نہیں اور اب دیش کا کیا ہوگا۔ فیروز شاہ کے لشکر کرناٹک میں گھس رہے ہیں۔"

"تو اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔" راجگورو تشفی آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "آپ ان سپنوں کا دھیان بھول جائیں اور مہاوشنو کے نام پر گجرات، خاندیش اور مالوہ کے مہاراجوں کو امداد کے لئے سندیس بھیجئے، وہ اس سے ضرور کرناٹک کی سہائتا کریں گے اور بھمنی خطرہ ٹل جائے گا......"

"تم نے خوب یاد دلایا۔" دیورائے کے افسردہ چہرے پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسرت افزا لہجے میں بولا۔ "واقعی اب لڑائی کے نقشے بدل گئے ہیں اور ہم تنہا شاید فیروز شاہ کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ گجرات، خاندیس اور مالوہ کے مہاراجے ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں امید ہے وہ ضرور مدد کو آئیں گے پھر...... لیکن راج سنگھ! تمہارا وشواش کیا ہے۔"

"راجگورو نے ٹھیک مشورہ دیا ہے مہاراج! اپنے دوستوں کو مدد کے لئے بلانا ہی چاہیے۔"

"تو پھر ان کو سندیس بھیجنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

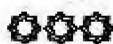
دیورائے بوڑھے پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے ہماری روح کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے راجگورو! لیکن مہاراجوں کی طرف یہ سندیس بھی تم ہی لے کر جاؤ گے۔ تم کرناٹک کے راجگورو ہو اور اپنی ودیا سے بھی انہیں آنے والے خطروں سے آگاہ کر سکتے ہو۔ اگر سلطان نے کرناٹک پر فتح پالی تو پھر اس کے قدم گجرات، خاندیس اور مالوہ ہی کی طرف اٹھیں گے۔ تم انہیں ہماری مدد پر اکساؤ اور ہماری طرف سے بہترین تحفے لے جاؤ۔ اس سفر کے لئے ہماری خاص سواری تمہیں تیار ملے گی۔"

"جو آگیا مہاراج! میں ہر سیوا کے لئے تیار ہوں۔"

"پھر دیورائے اسی وقت اپنے پڑوسی راجوں کے نام سندیس لکھوانے لگا۔ اندھیرے

میں امید کی اس نئی روشنی کی شعاعیں اس کے چہرے پر بھی منعکس ہونے لگی تھیں اور وہ اپنا بھیانک سپنا بھول گیا تھا جس نے کچھ دیر پہلے اس کی روح کا چین چھین لیا تھا۔



وہ ابھی پیغامات سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ راجکماری چندر کلا اپنے ہاتھ میں کوئی چتر لئے داخل ہوئی۔ کمرے میں اس وقت دیورائے، راجگورو اور سنگھ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اس نے آتے ہی سب پر اپنی مسکراتی ہوئی نظریں ڈالیں پھر اپنے باپ کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔

"میں تو خوشی کا ایک سندلیس لائی ہوں مہاراج!"

"بھگوان تمہیں سدا خوش رکھے۔ کہاں سے آیا ہے سندلیس؟"

"فیروز آباد سے......"

"فیروز آباد سے؟"

سب یوں چونک اٹھے جیسے انہوں نے کوئی انوکھا اور حیرت انگیز نام سن لیا ہو۔ چندر کلا نے سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"دیوان سوانا کو آپ نہیں بھولے ہوں گے پتا جی!"

"سوانا!"

دیورائے کے ذہن پر روشنیوں کا فوارہ سا پھوٹ نکلا۔ اس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

"تو کیا سوانا کامیاب ہو گیا؟"

اُس نے سندلیس بھیجا ہے۔ اس وقت میدان خالی ہے۔ فیروز آباد میں صرف تین ہزار سپاہ ہے۔ اگر اُسے پانچ سات ہزار سوار بھیج دیئے جائیں تو یہ سارا علاقہ اس کے قبضہ میں ہو گا۔ بہمنی خاندان کی تمام بیگمات اور شہزادیاں آج کل گلبرگہ سے فیروز آباد ہی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ سوانا نے لکھا ہے وہ اُن سب کو گرفتار کر کے بیجا نگر روانہ کر دے گا۔"

پھر چندر کلا نے وہ چتر دیورائے کی طرف بڑھایا۔

"سوانا کا ایک خاص آدمی ابھی ابھی یہ خط لے کر آیا ہے۔ آپ اسے پڑھ لیجئے۔"

دیورائے نہایت بے تابی کے ساتھ خط پڑھنے لگا اور اُس کی آنکھوں میں بھیڑیے کی سی چمک بیدار ہوتی چلی گئی خط پڑھ چکنے کے بعد اُس کے رخسار تمتما اٹھے اور ایک مسرت

انگیز کراہ کے ساتھ اُس نے خط راجگورو کی طرف بڑھا دیا پھر اُسے راج سنگھ نے پڑھا اور سب کے سب ایک نامعلوم سے احساسِ مسرت میں سرشار نظر آنے لگے۔

"سوانا کا خط غیبی امداد سے کم نہیں۔" دیورائے کے ہونٹ تھرتھرائے۔

راج سنگھ ایک لمحہ تک سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"اگر سوانا اعتماد کے لائق اور خط کا مضمون درست ہے تو جنگی لحاظ سے اس کی امداد ضروری ہے۔ وہ فیروز شاہ کی بیگمات اور شہزادیوں کو گرفتار کر کے بیجے نگر روانہ کر دے تو بہمنی سلطان کی تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہو گی ہم اپنی مرضی کے مطابق اُس سے ہر بات منوا سکتے ہیں اور اگر ہمیں صلح ہی کرنی پڑی تو ہم فیروز آباد کا علاقہ جزیہ کے طور پر وصول کر سکتے ہیں۔"

"بے شک...... بے شک......"

دیورائے مسرت سے چیخ اٹھا۔ "سنگھ! بس آج ہی سات ہزار سوار فیروز آباد کی طرف روانہ کر دو۔"

"لیکن اُن کا سالار کون ہو گا؟" سنگھ کہنے لگا۔

"اس سے کسی رائے کو بیجے نگر سے باہر بھیجنا مناسب نہیں ہو گا۔"

مہاراجہ کا چہرہ لٹک گیا۔ شاید وہ سنگھ کی بات پر غور کر رہا تھا۔ اچانک چندر کلا بولی۔

"پتا جی! گھبرائیے نہیں۔ اس فوج کی کمان میں کروں گی۔"

"تم......"

اور ایک ساتھ چھ آنکھوں نے چندر کلا کے حسین چہرے پر نگاہوں کا جال سا بن دیا۔

"ہاں...... میں خود...... اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ کیا میں نے فوجی تربیت حاصل نہیں کی۔ تلوار اور تیر چلانا نہیں سیکھے؟ کیا آپ نے کبھی میرا نشانہ خطا ہوتے دیکھا ہے؟"

راجکماری چندر کلا ان سب کے سامنے ایک مجسم سوال بن گئی تھی اور وہ حیرت پاش نگاہوں سے اس کی جراٴت و ہمت پر حیران ہو رہے تھے۔ یہ درست ہے دیورائے نے اپنی بیٹی کو لڑکوں ہی کی طرح جنگی فنون کی تعلیم و تربیت دلائی تھی۔ تیر اندازی اور شہسواری میں بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر سکتے تھے اور یہ چندر کلا ہی تھی جس نے راج رنواس کے دریچہ

سے تیر چلا کر سلطان فیروز شاہ کا شانہ زخمی کر دیا تھا پھر حیرت انگیز بات تو یہ تھی وہ مردوں کی طرح میدان جنگ میں فوج کی قیادت بھی کر سکتی تھی اور کئی معرکوں میں باپ کے دوش بدوش اپنی تلوار کے جوہر بھی دکھا چکی تھی۔ اس کے باوجود ایسے نازک وقت میں جب زندگی تلوار کی دھار پہ رقص کر رہی تھی راجکماری کا فوج لے کر دشمن کے دیس میں جانا کسی لحاظ سے مناسب نہیں تھا۔

"نہیں چندر کلا! ہم تمہیں دکن جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر تمہیں لڑنے ہی کا شوق ہے تو بیجے نگر میں بھی تم یہ شوق پورا کر سکتی ہو۔ ہم بہت جلد سنگھ کو سلطان کے لشکر پر حملہ کرنے کا حکم دینے والے ہیں۔"

"مگر میرے دکن جانے میں حرج ہی کیا ہے؟" چندر کلا کہنے لگی۔

"جب فیروز شاہ کو معلوم ہو گا اس کے بہادروں نے ایک لڑکی سے شکست کھائی اور اس کے اپنے بسائے ہوئے شہر فیروز آباد پر رائے رایاں کا زرد پھریرا اڑنے لگا ہے تو اس کی کیا حالت ہو گی؟"

"ضروری نہیں تم اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو سکو۔"

"دیوان سوانا کبھی غلط خبر نہیں دے سکتا۔"

"لیکن جنگ کے نقشے شطرنج کی چالوں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ کیا معلوم تمہارے دکن جاتے ہی حالات کون سا رخ اختیار کر لیں۔"

راجکماری نے اپنی نگاہیں باپ کے چہرے پر گاڑھ دیں اور پرعزم لہجہ میں کہنے لگی۔

"میں سوانا کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتی کہ حالات کو جانچے بغیر اپنی زندگی داؤ پر لگا دے۔ وہ اٹھارہ برس سے لومڑی کی طرح گھات لگائے بیٹھا ہے بھلا اب اندازے کی غلطی کیوں کرے گا پھر ذرا یہ بھی سوچیے! اس وقت سارا دکن فوجوں سے خالی ہو چکا ہے۔ سلطان اپنے تمام لشکروں اور سرداروں سمیت بیجانگر میں ڈیرے ڈالے پڑا ہے پیچھے چند مذہبی عالموں کے سوا کوئی بھی قابل ذکر امیر موجود نہیں پھر مجھ سے الجھنے والا کون ہے؟ اگر کہیں جھڑپ ہو بھی گئی تو سات ہزار سوار کم نہیں میں ہر دشمن سے نپٹ لوں گی اور یہ کبھی نہ بھولئے سوانا کا پھیلایا ہوا جال شاہی محلات کی دہلیزوں تک پہنچ چکا ہے۔ بیگمات اور شہزادیوں کو گرفتار کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ سوانا نے جس سرنگ کا پتہ دیا

ہے میں اسی راستے قلعہ میں پہنچ جاؤں گی اور سوانا کو پانچ ہزار سوار سونپ کر خود قیدیوں کے ساتھ دوسرے ہی روز بیجے نگر لوٹ آؤں گی۔ یہ سب کچھ اس خاموشی اور احتیاط سے عمل میں آئے گا کہ سلطان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکے گی۔ آپ اُسے بیجے نگر کے باہر جنگ میں الجھائے رکھیں اُسے یہ خبر دینے والا کون ہو گا کہ فیروز آباد کی بہاروں پر آگ برس پڑی ہے۔"

چندر کلا کی بات سن کر وہ سب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس مہم کی کمان کوئی بھی کرتا بہر حال سنگھ کا خیال تھا فیروز آباد پر حملہ بے حد ضروری تھا۔ اس کے دو فائدے ناقابل انکار تھے اول تو سلطان کو اپنے سرحدی دارالحکومت کو بچانے کی فکر لاحق ہو گی اور وہ کرناٹک کو پامال کرنے کا ارادہ ترک کر کے اپنے گھر کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ دوم اگر چندر کلا بہمنی بیگمات کو گرفتار کر کے بیجے نگر پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو جنگ کا نقشہ ہی بدل سکتا تھا۔ دیوان سوانا نے تیر ہی ایسا چلایا تھا جو ہر پہلو نشانے پر بیٹھتا ہے۔

چند لمحے جب دیورائے نے سر اُوپر اٹھایا تو اس کا آدھا اضطراب خود بخود دور ہو چکا تھا۔

"کیا فیصلہ کیا آپ نے مہاراج!"

چندر کلا نے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ نیم رضامند نظر آ رہا تھا اُس نے ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"اگر راجکمار پڑوسی راجوں کی طرف سہاتنا کا سندیس لے کر نہ جا رہے ہوتے تو ہم انہیں تمہارے ساتھ بھیج کر مطمئن ہو جاتے۔ لیکن......"

"سہاتنا کا سندیس چار دن بعد بھی جا سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ذرا سوچیے پتا جی! اگر فیروز آباد کی مہم کامیاب ہو جائے تو ہمیں پڑوسی راجوں سے سہاتنا لینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کیا اس صورت میں سلطان خود آپ کے قدموں میں بندھا ہوا نہیں آئے گا؟"

"راجکماری کا وشواش بالکل درست ہے مہاراج! سہاتنا سے پہلے ہمیں فیروز آباد کی خبر لینی چاہیے۔"

اور اپنے سیناپتی کی زبان سے یہ فقرہ سن کر دیورائے بھی سوچنے لگا بات کچھ ناممکن بھی نہیں تھی اس چال سے وہ فیروز شاہ کو باآسانی اپنے پاؤں پر جھکا سکتا ہے۔ یکلخت اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"راجکورو! پہلے تمہیں چندر کلا کے ساتھ فیروز آباد جانا ہوگا۔

"راج سنگھ! تم دس ہزار بہترین سوار تیار رکھو۔ کل رات کے اندھیروں میں یہ لوگ دکن کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور چندر کلا! تم رایچور کے قریب کرشنا ندی کو عبور کرو گی۔ شاید یہ راستہ تمہیں خالی ملے۔"

پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر زیر لب بڑبڑایا۔

"ہم کل ہی قلعہ کے دروازے کھول کر فیروز شاہ کو لڑائی میں اُلجھالیں گے۔"

"لیجئے! دیورائے کی بدبختی نے اُسے جنگ کے میدانوں میں ہانکنے کی تدبیر سوچ لی ہے اور بے گناہ دوشی کی آتما راجکماری چندر کلا ہی کا انتخاب کرتی ہے۔

اور بہمنی سلطان..... جو میدان جنگ میں بھی شکست اور پسپائی کے امکانات کو مدنظر رکھتا اور اپنے لشکروں کو اس انداز سے ترتیب دینے کا عادی ہے کہ ناکامی کی صورت میں بھی وہ اپنے سپاہیوں کو دشمن کے چنگل سے محفوظ نکال لے جائے گا کیا اتنا ہی احمق اور بے وقوف ثابت ہوگا کہ کرناٹک ایسے ملک پر حملہ کے بعد وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت سے غافل ہو گیا تھا۔ یا وہ اپنے سرحدی دارالحکومت کو درندوں کے چیرنے پھاڑنے کے لئے بے سہارا چھوڑ آیا تھا؟

عنقریب دیورائے کو اس کا جواب بھی مل جائے گا۔

فیروز آباد کا قاصد

شہزادہ حسن کا ستارہ کچھ اچھا ہی تھا۔

اگر وہ چونک کر جاگ نہ اُٹھتا تو شاید اس وقت کالے زہر کا لقمہ بن چکا ہوتا۔

اڑھائی بالشت کا سیاہ ناگ اس کے پاؤں میں مرا پڑا تھا اور مشعل کی روشنی میں اس کا کالا جسم یوں چمک رہا تھا جیسے آئینہ چمکتا ہے۔

سلطان کے حکم کے مطابق صبح اُسے بیجا نگر کے مضافات میں چکر کاٹنا تھے۔ تاکہ

قلعہ کو ملنے والی رسد کا رستہ کاٹ دے اس لئے فولاد خاں کو تیاری کے احکام دے کر وہ سیدھا اپنے خیمہ میں آ کر بستر پہ لیٹ گیا تھا۔ امیر فضل اللہ اور خانخاناں کے لشکر نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی منزل کی طرف کوچ کر رہے تھے اور شہزادہ کے سپاہی بھی دلچسپی کے ساتھ اپنی چھولداریوں سے باہر بیٹھے ان کی روانگی کا نظارہ کر رہے تھے۔ شاید اسی لمحے ولی عہد کے محافظ سپاہی بھی خیمہ سے ذرا ہٹ آئے تھے اور کسی سپیرے کو اس کے سفری کمرے میں ناگ چھوڑنے کا موقع مل گیا تھا۔

حسن خاں چپ چاپ آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا شاید پرتھال ہی کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ باہر نوجوان کی روانگی کا ہنگامہ بپا تھا اور کبھی کبھار گھوڑوں کی ہنہناہٹیں فضا کے سینہ پر یوں تیر جاتی تھیں جیسے شوالوں میں کانسی کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں۔ لیکن اس دبے دبے اور گھٹے گھٹے سے شور و غل کو بھول کر اُس کا ذہن بہت دور فیروز آباد کی محل سراؤں کی طرف اُڑا جا رہا تھا جہاں اس کے خوابوں کی تعبیر...... قصر لالہ کی مہمان تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کوئی ایسی تدبیر پیدا ہو سکے کہ چند لمحوں کے لئے اپنے خوابوں کے شہر فیروز آباد سے ہو آئے کہ اچانک اُسے خیمہ کی دیوار کے ساتھ کچھ کھٹکا سنائی دیا...... پھر یہ سوچ کر اُس نے اپنی آنکھیں دوبارہ موند لیں کہ ممکن ہے کوئی محافظ خیمہ کی اس سمت آ نکلا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنے پاؤں کے قریب ہی ایک بھیانک پھنکار سنائی دی اور وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔

مشعل کی روشنی میں اڑھائی بالشت کا سیاہ ناگ اس کے بستر کے پاس رینگ رہا تھا۔ نہایت تیزی کے ساتھ اُس کا ہاتھ سرہانے کی طرف گیا اور تلوار کی ایک ہی ضرب سے کالا ناگ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

وہ سوچنے لگا یہ سیاہ ناگ جو برار کی پہاڑیوں میں پایا جاتا ہے۔ بیجانگر کے علاقہ میں کہاں سے آ گیا؟

اس لمحے محافظ ایک آدمی کی گردن پہ بھالے کی نوک رکھے خیمہ میں داخل ہوا۔

"کون ہے یہ؟"

شہزادہ لپک کر آگے بڑھا۔

"جانِ عالم! یہ داؤد خاں کے لشکر کا سپاہی ہے آپ کی بارگاہ کے عقب میں قناتوں کی

لوٹ سے بھاگ رہا تھا۔"

محافظ نے سپاہی کی گردن میں بھالے کی نوک چبھوتے ہوئے جواب دیا۔

"داؤد خاں کا سپاہی...... برار کا لشکری۔"

حسن خاں کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی...... پھر وہ مردہ سانپ کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

"یہ کالا ناگ بھی برار ہی کے پہاڑوں پہ ملتا ہے۔"

"کالا ناگ......"

محافظ نے حیرت خیز نگاہوں سے زمین پر مرے ہوئے سانپ کی طرف دیکھا اور دانت پیسنے لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

شہزادہ کرخت لہجہ میں برار کے لشکری سے مخاطب ہوا لیکن اُس کے ہونٹوں پہ خاموشی کا تالا پڑ گیا تھا۔ اُس کی زبان بند تھی اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔

"خاموشی جرم کو نہیں چھپا سکتی۔ یاد رکھو اگر تم نے سب کچھ سچ سچ نہ بتا دیا تو کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

لیکن اب بھی ملزم کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ حسن خاں کے تالی بجاتے ہی دوسرا محافظ خیمہ میں داخل ہوا۔

"معلوم کرو داؤد خاں کا لشکر روانہ ہو چکا یا نہیں؟"

"لشکر جا چکا ہے جانِ عالم!" محافظ نے جھک کر جواب دیا۔

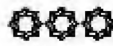
"داؤد خان امیر شیرازی کے میمنہ کا سالار ہے۔ سب سے پہلے اُسی نے اپنے خیمے اکھاڑے تھے۔ اس وقت وہ یہاں سے تین کوس کی مسافت پر ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شہزادہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "اسے زنجیروں میں جکڑ دو اور یہ سانپ اٹھا کر لے جاؤ۔ صبح یہ دونوں ظلِ سبحانی کے حضور پیش کیے جائیں گے۔"

محافظوں نے اُسی وقت لشکری کو جکڑ لیا۔ وہ اب بھی خاموش تھا لیکن خوف کے مارے اس کا بدن یوں کانپ رہا تھا جیسے تیز ہوا میں بید مجنوں کی شاخیں لرزتی ہیں۔ اگر سلطان بہ نفسِ نفیس اس پڑاؤ میں موجود نہ ہوتا تو شہزادہ حسن کو برار کے اس لشکری کی زبان کھلوا لینے میں شاید اتنی مشکل پیش نہ آتی لیکن ابھی تک یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آ سکی

تھی۔ برار کا سیاہ ناگ اس کے خیمہ میں کیوں چھوڑا گیا۔ فوج میں کون شخص اس کی جان کا دشمن ہو سکتا ہے؟

بقیہ رات اس نے جاگتے جاگتے ہی گزار دی۔



صبح جب وہ سلطانِ معظم کی بارگاہ میں داخل ہوا تو چوبدار نے اسے بتایا سلطانِ عالی اس وقت خلوت میں ہیں اور ابھی ابھی انہوں نے فیروز آباد۔ کے ایک قاصد کو شرف ملاقات بخشا ہے۔

قاصد کا گھوڑا خیمہ سے باہر کھڑا ہونک رہا تھا اور ایک سپاہی اس کی لگام تھامے کچھ فاصلہ پر کھڑا تھا۔

سورج ابھی طلوع ہوا تھا اور اس کی بنفشی شعاعیں بیجانگر کی بھوری چٹانوں پر رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اتنے سویرے کسی قاصد کی ملاقات خالی از ملت نہیں ہو سکتی حسن خاں کا خیال تھا شاید اب دن چڑھے تک اُسے سلطان کی حاضری نصیب نہ ہو سکے نجانے قاصد کیا پیغام لے کر آیا ہے۔ کہیں فیروز آباد میں کوئی گڑ بڑ نہ ہو گئی ہو...... پھر فوراً ہی اُسے یہ خیال آیا ”لیکن قاصد کون ہے...... کس کا پیغام لے کر آیا ہے؟“

اس استفسار پر چوبدار نے بتایا۔ اس نے علیہ خانم بیگم جہاں کی انگشتری اندر بھجوائی تھی اور سلطانِ عالی نے فوراً طلب کر لیا تھا۔“

بیگم جہاں کی انگشتری، شہزادہ حسن کا ماتھا ٹھنکا اور اچانک سینہ کے اندر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب چوبدار واپس آیا تو اس نے جھک کر عرض کیا۔

”ظلِ سبحانی نے جانِ عالم کو یاد فرمایا ہے۔“

شہزادہ حسن دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حریری پردوں کو ہٹاتا لپکتا ہوا گزرتا چلا گیا۔ وہ جلد سے جلد فیروز آباد سے آنے والے قاصد کی زبانی محل کی صورتحال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ راہداری سے گزر کر جب وہ سلطان کی خاص سراپردہ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر ٹھٹک سا گیا کہ سلطان نہایت جوش کی حالت میں ایرانی قالین پر چکر کاٹ رہا تھا اور ایک خوش پوش نوجوان جس نے جمیلوں کے خاص انداز میں منہ پر پٹکا باندھ رکھا تھا۔ چوبی شہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



نشین کے پاس مؤدب کھڑا تھا سلطان کا چہرہ غصہ میں انگارے کی مانند سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے خون ٹپکا پڑ رہا تھا اور بدن پر رعشہ سا طاری تھا۔ جس پر وہ چلتے چلتے قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ولی عہد نے سلطان کو آج تک اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ ضرور کوئی حیرت انگیز سانحہ رونما ہوا ہے۔ وہ پردہ کے پاس ہی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اس نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اُسے سلطان کی گرج سنائی دی۔

"قریب آجاؤ۔"

اُس کی آواز بری طرح مرتعش تھی۔ حسن کے جسم پر کپکپی سی دوڑ گئی سلطان خلاف عادت اپنے کولہوں پر ہاتھ ٹکا کر شہ نشین کے پاس کھڑا ہو گا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ولی عہد نے محسوس کیا آج وہ اُس سے آنکھیں نہ ملا سکے گا۔

"حاضری کا مطلب؟"

سلطان کے لہجے میں کسی درندے کی سی وحشت تھی۔

"ظلِ سبحانی! رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔" آدابِ سلطانی کے مطابق سب سے پہلے اُسے سلطان کی خیریت دریافت کرنا چاہیے تھی۔ قاصد نے بھی سہمی ہوئی نگاہوں سے شہزادہ کی طرف دیکھا شاید وہ اس کی غلطی پر چونک اٹھا تھا لیکن حسن خاں نے اُس جانب دھیان نہیں دیا۔

"اجازت ہے۔"

"رات برار کے ایک لشکری نے میرے خیمہ میں کالا ناگ چھوڑا تھا۔"

شہزادہ کا فقرہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ سلطان اور قاصد دونوں اچھل سے گئے۔ اُن کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں اور پھر سلطان کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔

"کالا ناگ؟"

"سلطان عالی! رات کسی نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجرم کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ سردار داؤد خاں کے لشکر کا سپاہی ہے۔"

"اور سانپ......"

"اُسے ہلاک کر دیا گیا۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی پھر سلطان کی کرخت آواز سنائی دی۔

''تو پرتھال کا بیان صحیح ثابت ہوا۔''

''پرتھال......''

شہزادہ کے ہونٹ کپکپائے اور اُسی وقت قاصد نے اپنے منہ سے سیاہ ڈھاٹا اتار دیا۔ اب حسن خاں کے سامنے مردانہ لباس میں پرتھال کھڑی تھی اس کے خوابوں کی تعبیر وہ متحیر نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

''پرتھال کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ تمہیں سانپ کے حملہ سے خبردار کر سکے۔'' سلطان اُس کی حیرت دور کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ''اس نے آتے ہی تمہاری خیریت دریافت کی تھی۔''

''تو سانپ میرے لئے فیروز آباد سے بھیجا گیا تھا؟''

سلطان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے جوشِ غضب کی اُسی حالت میں آگے بڑھ کر گونگ پر ضرب لگائی اور نشست کا چوبی بازو تھام کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے چوبدار نے خیمہ میں قدم رکھا۔

''ارگو خاں کو بلاؤ۔''

سلطان بدستور غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا خون کی تیزی سے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ ولی عہد ابھی اصل واقعہ کی نوعیت سے بے خبر تھا لیکن پرتھال کے فیروز آباد سے آنے کا مقصد سمجھ جانے کے بعد وہ اس قدر ضرور جان گیا تھا کہ اس سازش کی پشت پر بیگم شیرازی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا دو سال پہلے وہ بھی تو برارہی سے آئی تھی اور اسی کی سفارش پر سردار داؤد خاں کو امیر فضل اللہ کے لشکر میں ایک اہم عہدہ دیا گیا تھا۔ ارگو خاں کو آنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ بھی سلطان کی حالت دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔

''ارگو خاں!'' سلطان غضب ناک آواز میں دھاڑا۔ ''امیر فضل اللہ ٹھکا پور کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ ایک تیز رفتار سوار ان کی طرف دوڑاؤ۔ وہ ابھی دور نہ گئے ہوں گے۔ انہیں پیغام بھیجو۔ سردار داؤد کو پابہ زنجیر ہمارے حضور بھیج دیں اور اپنا سفر جاری رکھیں۔''

ارگو خاں دم بخود رہ گیا۔ سلطان کہہ رہا تھا۔

''ہم ایک رات کے لئے فیروز آباد میں جائیں گے لیکن ہماری روانگی کی خبر کسی کو نہ

ہونی چاہیے۔ صرف ہمارے دستہ خاص کے ایک ہزار سوار دریائے تنگ بھدرا کے گھاٹ پر ہمارا انتظار کریں۔ لشکر گاہ سے ہم تنہا اور چھپ کر نکلیں گے ہمارے بعد جانِ عالم فوج کی کمان کریں گے۔ شاید دیورائے کی بدبختی اُسے آج یا کل قلعہ کے باہر لے آئے لیکن ہمیں دور مت سمجھو۔ ہمارا ایک قدم فیروز آباد میں ہوگا اور دوسرا بیجے نگر میں اب تم جا سکتے ہو ایک ہزار سوار فوراً دریائے تنگ بھدرا کی طرف روانہ کر دو ہم نصف رات سے پہلے ہی فیروز آباد پہنچ جانا چاہتے ہیں اور حسن خاں! تمہاری روانگی ہماری واپسی تک ملتوی رہے گی۔ برار کے لشکری کی قسمت کا فیصلہ ہم خود سنائیں گے۔ بس اب ہم تخلیہ چاہتے ہیں پر تھال ہمارے ساتھ ہی فیروز آباد جائے گی۔"

یہ کہہ کر سلطان نہایت تیزی کے ساتھ ایک جانب مڑ گیا ارگو خاں اور شہزادہ حسن اُلٹے قدموں سے دروازہ کی طرف چلنے لگے پر تھال جو ابھی تک گم صم کھڑی تھی مضطرب نگاہوں سے ولی عہد کو جاتے دیکھنے لگی۔ اگر اُس کے بس میں ہوتا تو وہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جاتی اور پاؤں پکڑ کر التجا کرتی۔

"جانِ عالم! یہ کنیز آپ ہی کی زندگی کے لئے فیروز آباد سے بھاگی آئی ہے میں نے کسی قاصد کا بھی انتظار نہیں کیا کیونکہ آپ کی زندگی کسی بھی قاصد سے مجھے زیادہ عزیز تھی پھر میں خود کیوں نہ آتی اور آپ کو کیا خبر آپ کے بعد بیگم شیرازی نے مجھے بھی ڈس لینا چاہا تھا۔ وہ ہم دونوں کی جان لینا چاہتی ہے۔ نہیں اُس نے تو سلطان عالی کے لئے بھی کالے ناگ پال رکھے ہیں۔ وہ پورے بہمنی خاندان کا صفایا کر دینا چاہتی ہے۔ سارے دکن کو ڈس لینے پر تلی بیٹھی ہے۔ وہ عورت نہیں ناگن ہے۔ میں آپ کو اُس کے زہر سے بچانے آئی ہوں لیکن سلطان عالی کی موجودگی میں میں آپ کو اپنے دل کی بے قراری کا حال کیسے سنا سکتی ہوں۔ میرے من مندر کے دیوتا! بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔"

اور واقعی سلطان کی موجودگی میں وہ شہزادے کو اپنی بے تابیوں کی داستان سنا بھی کیسے سکتی تھی۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو الوداع کہی اور شہزادہ اپنے دل میں تازہ دھڑکنیں لئے کمرہ سے باہر نکل گیا۔



14

سازش کی کڑیاں

شبِ انقلاب

مہر زریں نے چونک کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے حجرے میں بستر پر اوندھے منہ لیٹی سسکیاں لے رہی تھی۔

"اری میں تو سارا دن تجھے ڈھونڈتی پھری ہوں۔ مجھے کیا خبر تھی تو اپنے حجرے میں لیٹی ہے لیکن تجھے ہوا کیا۔ تو رو کیوں رہی ہے۔ بس اب آنسو پونچھ ڈال۔ بیگم شیرازی کب سے تجھے یاد کر رہی ہیں۔ ہم تو ڈر ہی گئی تھیں۔ تجھ پر کوئی نئی آفت نہ آ پڑی ہو۔"

زریں نے ہزار بہلایا لیکن زرینہ کی سسکیاں بدستور جاری تھیں۔ عیار خواجہ سرا کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا آخر اس کے رونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بڑی مشکل سے اس نے زرینہ کو شیرازی کے کمرے میں چلنے پر رضامند کر لیا۔

زرینہ کے لئے وہ دونوں واقعی پریشان رہی تھیں۔ خطرہ تھا کہیں وہ محل کی کسی بیگم سے مل کر سازشوں کا راز فاش نہ کر دے۔ مہر زریں نے محلات کا ایک ایک گوشہ چھان مارا تھا۔ ایک ایک کنیز اور ایک ایک خواجہ سرا سے اُس کا پتہ پوچھا تھا لیکن زرینہ کسی کو دکھائی نہ دی۔ پھر اس کا پتہ کہاں سے ملتا۔ جوں جوں دن ڈھل رہا تھا مہر زریں کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ بہانے بہانے سے اُس نے قصرِ لالہ کا چکر بھی کاٹا تھا لیکن زرینہ کہیں نظر نہ آ سکی اور اب جب وہ تھکی ہاری اُس کے حجرے کی طرف آئی تو وہ بستر پر اوندھی پڑی آنسو بہا رہی تھی۔ زریں افراتفری میں اُس کے حجرے کو بھول گئی تھی۔ زرینہ کو دیکھ کر اس کی جان

میں جان آئی لیکن وہ اُس کی اُداسی اور رونے کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

قصرِ لالہ کی چالاک کنیز اپنا کام کر آئی تھی۔

جب وہ شیرازی کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ بھی اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

زرینہ خود بخود پھٹ پڑی۔

"بیگم حضور! دشمن شاید میری جان ہی لے کر ٹلیں گے۔" اس نے سسکاری لیتے ہوئے شکایت کی۔

"واقعہ کیا ہے؟ تم ابھی تک کہاں تھیں؟"

زرینہ نہایت معصومیت سے کہنے لگی۔

"میں نہیں سمجھی آج سرنگ میں مجھے تنہا چھوڑنے کی وجہ کیا تھی خوف سے میرا دم نکلنے لگا تھا۔ میں کچھ دیر اندھیرے میں زریں کا انتظار کرتی رہی۔ جب تنہا سوانا بابا کے حجروں کی طرف جانے کی جرأت نہ ہوئی تو واپس ہولی مگر سرنگ سے نکل کر اپنے حجرے کی طرف آ رہی تھی کہ اچانک قصرِ لالہ کی کنیز گل رخ مل گئی۔ اُس نے بتایا بیگم جہاں میری تلاش میں ہے اور کسی روز ضرور مجھے ہلاک کر دے گی۔ میں وہاں سے سیدھی اپنے حجرے میں چلی آئی اور اس ڈر سے باہر نہیں نکلی کہ کہیں بیگم جہاں کا کوئی غلام سچ مچ ہی مجھے ہلاک نہ کر ڈالے۔"

یہ کہہ کر زرینہ پھر رونے لگی لیکن اب اُس کی سسکیاں مدھم پڑ چکی تھیں۔

"اور میں اسے حجرے سے باہر تلاش کرتی رہی۔ مجھے کیا خبر تھی...... لڑکی میری بغل میں ہے اور ڈھنڈورا شہر میں دے رہی ہوں۔" مہر زریں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"خیر تم ڈرو نہیں۔" بیگم شیرازی اُسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

"زریں کو میں نے ہی ہدایت کی تھی آج وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے۔ تاکہ تمہارا خوف دور ہو سکے اور بوقت ضرورت تم اکیلی سرنگ میں آ جا سکو۔ اگر تم ڈرتی ہو تو زریں ہر وقت تمہارے ساتھ رہے گی۔ اس کی موجودگی میں کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور وہ بوڑھی کتیا تو جسے تم بیگم جہاں کہتی ہو میرے قدموں میں سسک سسک کر دم توڑے گی۔ میں اس سے تمہارا بدلہ ضرور لوں گی بس چند روز اور انتظار کرو۔ سلطان کی واپسی پر سب حساب بیباق کر دیا جائے گا۔"

"لیکن اگر سلطان کی واپسی سے پہلے کسی نے مجھے خنجر گھونپ دیا تو......"

"میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔" مہر زریں ایک ناگن کی طرح پھنکاری۔ "کنیزوں، غلاموں اور خواجہ سراؤں پر میرا ہی حکم چلتا ہے۔ اگر اس بوڑھی کتیا نے ایسی حرکت کی تو کیا وہ زہر کے لقمہ سے بچ جائے گی؟ خدا کی قسم! میں اس کی کھال میں بھس بھروا دوں گی۔ اس کی زندگی اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہے۔"

"خاموش رہو زریں! دیواریں بھی کان رکھتی ہیں۔ ابھی تمہیں اپنی زبان بند ہی رکھنا چاہیے وقت پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گی۔ فی الحال تم زرینہ کی حفاظت کرو۔"

یہ کہہ کر بیگم شیرازی مسہری پر بیٹھ گئی۔ اچانک اُسے کوئی خیال آیا اور وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"کیوں نہ بیگم جہاں کو ختم ہی کر دیا جائے۔"

پھر وہ مہر زریں سے مخاطب ہوئی۔

"تم آج ہی سوانا بابا سے ملو اور انہیں مطلع کرو بیگم جہاں کے متعلق میں نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ہے۔ اُسے کل رات ختم کر دیا جائے گا۔"

مہر زریں نے مسکرا کر گردن جھکا دی جیسے بیگم جہاں کی موت کا فیصلہ سن کر اُسے روحانی تسکین ہوئی ہو پھر وہ زرینہ کا بازو تھام کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"لورزی! تمہارا بدلہ تو کل رات اتر جائے گا۔ تم اپنے حجرے کی طرف چلو۔ میں سوانا بابا سے مل کے آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر مہر زریں بجلی کے کوندے کی طرح قصر کے عقبی حصہ میں لپکتی چلی گئی۔ سرنگ والا حجرہ اسی سمت تھا۔

محل میں برجیوں اور ستونوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ سورج مغربی افق پہ چمک رہا تھا اور سرما کی شام ہولے ہولے اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ زرینہ بھاری قدموں کے ساتھ اپنے حجرے کی طرف چلنے لگی۔ اچانک مہندی کی باڑھ کے پاس ایک سایہ سا حرکت کرتا نظر آیا۔ جونہی وہ آگے بڑھی قصرِ لالہ کا محافظ شاہ گل اُس کے سامنے آ گیا۔

"زرینہ......" اُس نے آہستہ سے آواز دی۔

زرینہ کے قدم رُک گئے۔

"مجھے بیگم جہاں نے تمہاری حفاظت کے لئے بھیجا ہے۔ بتاؤ تمہارا حجرہ کون سا ہے؟"

زرینہ نے اپنے حجرے کی طرف اشارہ کیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

"شاہ گل! بیگم جہاں سے کہنا کل رات ہوشیار رہیں۔ کل اُن پر سانپ چھوڑا جائے گا۔"

پھر وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ زرینہ بڑے اطمینان سے اپنے کمرے کی طرف چلنے لگی۔

رات مہر زریں نے اُسے بتایا۔

"انقلاب کی ساعت قریب آ رہی ہے۔ بیگم شیرازی نے برار کے کچھ لوگوں کو خطوط روانہ کر دیئے ہیں۔ وہ بھی چند روز تک پہنچ جائیں گے اور پھر......"

جب اُس نے زرینہ کی طرف دیکھا تو وہ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ کئی روز کے بعد آج وہ اطمینان کی نیند سوئی تھی۔ زریں مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔



سورج کی شعاعیں دریچوں اور غرفوں سے چھن چھن کر حجرے کے اندر ناچ رہی تھیں۔ جب زرینہ کی آنکھ کھلی۔ اُس نے دیکھا مہر زریں اس کے سرہانے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"آج تم گھوڑے بیچ کر سوئی ہو۔"

"ہاں میں نے اپنے گھوڑے کل ہی بیچ دیئے تھے۔"

"اور آج رات بیگم جہاں کی بوڑھی گھوڑی بھی بک جائے گی۔" مہر زریں بدستور مسکراتی رہی۔ "سوانا بابا نے اُس کے لئے دکن کا کوبرا منتخب کیا ہے۔"

"لیکن کوبرا تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ قصرِ لالہ تک جائے گا کس طرح؟"

"اوہ...... تم اس کی فکر نہ کرو۔ بس یہ سوچو آج اس کتیا کی زندگی کا آخری دن ہے جو بہمنی محلوں پر حکومت کرتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے اُس سے آخری بار ملنے جاؤں...... لیکن نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے قصرِ لالہ کی کنیزوں پر بھی اعتبار نہیں۔ وہ خواہ مخواہ شک کر لیں گی۔ اب تو صبح اُس منحوس کی لاش ہی دیکھوں گی۔"

"بڑی عبرت ناک موت ہو گی۔" زرینہ نے جھرجھری سی لی۔

"لیکن آج سوانا بابا کی حاضری کا ارادہ نہیں؟ کل بھی ناغہ ہو گیا تھا۔"

"زریں! آج تو میں نہیں جا سکتی۔"

"کیوں...... آج کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"آج سارا دن جشن مناؤں گی۔"

"جشن......"

"ہاں...... بیگم جہاں کی موت کا جشن۔" زرینہ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

"اچھا...... تو میں چلی۔ مجھے آج بہت سے کام کرنا ہیں۔"

پھر مہر زریں اپنا کوڑا سنبھالے حجرے سے باہر نکل گئی۔ زرینہ نے دریچہ سے جھانک کر دیکھا۔ بجلی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ جسے وہ غلام گردش ہی میں چھوڑ آئی تھی۔

مہر زریں واقعی سارا دن بہت مصروف رہی۔ اس کا کوڑا محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں پر برستا رہا۔ گہری شام کو اُس نے زرینہ کے حجرے کا آخری چکر لگایا۔

"سب انتظام ٹھیک ہے میری بلبل!" اُس نے آتے ہی زرینہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "کوبرا قصرِ لالہ میں پہنچ بھی چکا۔ اب تمہاری علیہ خانم بیگم جہاں بس چند گھڑیوں کی مہمان ہے۔ جونہی وہ اپنے بستر پہ گئی......"

ابھی اُس نے فقرہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ بجلی بھاگی بھاگی آئی۔ اس نے بتایا۔ مہر زریں کو بیگم شیرازی نے یاد کیا ہے۔

"اچھا میری بلبل! صبح اکٹھی اس منحوس بڑھیا کی لاش دیکھنے چلیں گی۔ تم آج رات بھی جشن مناؤ...... یو یو...... شوشو......" وہ بہت خوش تھی۔ پھر اٹھلاتی ہوئی حجرے سے نکل گئی اور زرینہ مسکرا کر بستر پر گر پڑی لیکن تھوڑی دیر کے بعد دبے پاؤں غلام گردش عبور کرتی ہوئی وہ بیگم شیرازی کے کمرے کے ایک دریچہ کی اوٹ میں کھڑی ان کی سرگوشیاں سن رہی تھی۔

"زریں! میں نے سنا ہے پرتھال کل سے قصرِ لالہ میں نہیں ہے۔ آخر وہ کہاں گئی ہے؟"

"ممکن ہے بیگم جہاں نے سانپ کے ڈر سے اُسے کسی دوسری جگہ بھیج دیا ہو۔" یہ زریں کی آواز تھی۔ شاید پرتھال کی روپوشی پر خود بھی حیران تھی۔

"لیکن اس کا روپوش ہو جانا اچھا نہیں۔ میں اپنے دشمنوں کو ہر وقت نگاہوں میں رکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اطلاع مل جانی چاہیے۔"

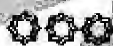
"مطمئن رہیے بیگم حضور! کل وہ جہاں بھی ہو گی آپ کو خبر ہو جائے گی۔"

"جاؤ اب آرام کرو...... ہاں آج رات تمہارا قصرِ لالہ کی طرف جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"آج رات میں اپنے حجرے ہی میں گزار دوں گی۔"

قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی زرینہ لپک کر ایک طرف ہو لی اور آہستہ آہستہ کمرے کی طرف چل دی۔

فیروز آباد کی کوشک سراؤں پر اس وقت گہری خاموشی مسلط تھی۔ یہ گہری خاموشی اور تاریکی کسی پُراسرار واقعہ کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ نجانے کیا ہونے والا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے یونہی زرینہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ حیران تھی آخر یہ بے قراری سی کیوں جبکہ وہ ہونے والے واقعہ کی اطلاع پہلے ہی قصرِ لالہ تک پہنچا چکی ہے پھر بھی شاید آج رات اُسے نیند نہ آ سکے۔



بیگم شیرازی میٹھی نیند کے ہلکورے لے رہی تھی۔

قریباً آدھی رات کا عمل ہو گا جب اُس کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تلوار کے دستے سے دروازہ پیٹ رہا ہو۔

شیرازی نے جمائیاں لیتے ہوئے مسہری سے پاؤں نیچے رکھا یقیناً یہ مردود مہر زریں ہو گی جو اُسے بیگم جہاں کی موت کی خبر سنانے آئی ہے۔ تو سچ مچ بڑھیا زہر کا لقمہ بن گئی۔

اُس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ پھر ہولے ہولے چلتی ہوئی وہ دروازے تک آئی۔

"مہر زریں!" اس نے ہولے سے آواز دی۔

"ہوں......" باہر سے جواب ملا۔

"اری مردود...... اس وقت کیوں آئی ہے۔ کیا بڑھیا ختم ہو گئی؟"

"ہاں ختم ہو گئی۔" آواز مہر زریں ہی کی تھی۔

"تو پھر جا سورہ......"

"دروازہ تو کھولئے۔"

"اری کمبخت! مجھے نیند آ رہی تھی مگر تو سونے نہ دے گی۔"

اور یہ کہتے کہتے بیگم شیرازی نے دروازہ کھول دیا۔ پھر وہ یکلخت اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

پہلے اس نے مہر زریں ہی کو دیکھا تھا جو زنجیروں میں جکڑی ہوئی سامنے کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں اُس نے جس انسان کی شکل دیکھی اُس پر اُسے یقین ہی نہ آ سکا۔ دکن کا پر ہیبت حکمران سلطان فیروز شاہ بہمنی بہ نفس نفیس اُس کے سامنے تھا جس کی آنکھیں اندھیرے میں شعلوں کی مانند دہک رہی تھیں۔ سلطان کے ساتھ بیگم جہاں، زرینہ اور پر تھال بھی تھیں۔

بے اختیار شیرازی کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی۔ سلطان نے ایک بھوکے بھیڑیے کی طرح آگے بڑھ کر اُس کی کلائی دبوچ لی۔

"سلطانِ عالی!"

"بے حیا عورت! ہم بیج نگر سے تیری پھنکار سن کر آئے ہیں۔"

شیرازی کے چہرے پر موت کی زردیاں ناچ اٹھیں پھر سلطان نے کسی کو آواز دی۔

"اس مردود کو کمرے میں لاؤ۔"

اور سپاہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سوانا بابا کو ایک کتے کی طرح گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئے اُس کے پاؤں میں بھی زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ سوانا کمرے میں داخل ہوتے ہی منہ کے بل گر پڑا۔ شاید ہشیار نظام الملک نے جو سلطان کے ہمراہ تھا اس کی کمر پر لات ماری تھی پھر اُس نے مہر زریں کو بھی گھسیٹ کر دیوار کی طرف دھکیل دیا۔ سلطان کے حکم پر دو بڑے بڑے ٹوکرے بھی کمرے کے اندر پہنچا دیئے گئے۔ ان میں وہ سانپ بند تھے جو کچھ دیر پہلے سرنگ کے ایک حجرے میں رینگتے پھر رہے تھے۔ نظام الملک سپیروں کی بستی سے چند ہوشیار سپیرے بھی اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا جنہوں نے سوانا بابا کی گرفتاری کے بعد سانپوں کو ٹوکروں میں بند کر دیا تھا۔

سلطان نے موت کی طرح اچانک محلات کو گھیر لیا تھا پھر قصرِ شیرازی میں داخل ہو کر سب سے پہلے مہر زریں کو گرفتار کیا گیا زرینہ نے سرنگ تک سلطان کی راہنمائی کی تھی۔ وہ

اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنا چاہتا تھا لیکن اُسے جو کچھ بھی بتایا گیا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوا تھا۔

سوانا بابا کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ زنجیریں پہنا دی گئی تھیں۔ وہ اپنے حجرے ہی میں سو رہا تھا۔ سرنگ کے اُس دہانہ پر جو جھوہرہ ندی کی طرف کھلتا تھا چند سواروں کا پہرہ لگا دیا گیا تھا تاکہ سوانا کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے صرف سانپوں کا مسئلہ پریشان کن تھا لیکن سپیرے بھی سلطان کے ساتھ ہی سرنگ میں داخل ہوئے تھے جنہوں نے چند ہی لمحوں میں تمام سانپ قابو کر لئے تھے۔

شیرازی کی "شب انقلاب" آ پہنچی تھی اور سلطان کی اچانک آمد نے اُس کے تمام سنہرلی خوابوں کے آبگینے چکنا چور کر دیئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ سلطان موت کی طرح بالکل اچانک آ دھمکے گا۔ وہ تو فیروز آباد سے کوسوں دور بجے نگر کو گھیرے پڑا تھا پھر...... پھر وہ یوں آناً فاناً کہاں سے آ ٹپکا؟

جرم سے انکار بے کار ہی تھا۔ اس کے سب ارادے خاک میں مل گئے تھے۔ تمام تدبیریں زنجیروں میں بدل گئی تھیں۔ منصوبوں کے سارے جال بکھر کر خود اُسی کے لئے دام بلا بن گئے۔ سب کچھ فنا ہو چکا تھا لیکن شیرازی کوئی بہادر عورت نہیں تھی کہ اپنی ناکامی کو برداشت کر سکتی۔ موت کے سائے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں مشعل کی لرزاں روشنی کی طرح کانپ رہے تھے اور تبضوں کا خون رک رک کر چلنے لگا۔

بے وفا عورت کو اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔

مہر زریں...... بہمنی محلات کی سردار خواجہ سرا جس کے نتھنوں سے ہر وقت بھچو گرتے تھے اس وقت سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی البتہ سوانا کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ شاید اُس نے موت کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔

فرطِ غضب میں خود سلطان کے جسم پر بھی لرزش سی طاری تھی۔ اُس نے شعلہ بار نگاہوں سے شیرازی کی طرف دیکھا۔

"ذلیل عورت! اگر ہم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا ہوتا تو ممکن ہے تیرے متعلق شک وشبہ میں رہتے۔ سچ مچ تو عورت کے روپ میں ناگن ہے۔ شاید ہم نے تیرے فریب کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا۔ بول کیا تجھے اس بات سے مجالِ انکار ہو

سکتی ہے کہ تو نے مابدولت کے خلاف ایک خطرناک سازش تیار کی اور ہمارے عزیزوں کو سانپ کے زہر سے ہلاک کر دینا چاہا؟"

شیرازی کو جیسے سچ مچ سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہو سکی۔

"تو خاموشی کی زبان سے تم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے اب فیصلے کا انتظار کرو۔"

پھر وہ شدید غصہ کی حالت میں مہر زریں کی طرف مڑ گیا۔

اور تُو...... اے بدبخت خواجہ سرا...... کیا تو یہ بھول گئی تھی۔ ہمارا قہر و غضب تجھے پیس کے رکھ دے گا۔"

"رحم...... رحم کیجئے ظلِ سبحانی! شیطان نے مجھے گمراہ کر دیا تھا میں نابکار آپ کے بے پایاں احسانوں کو بھول گئی تھی۔ نہیں میری قسمت نے مجھے جہنم کی بھٹی میں دھکیل دیا تھا لیکن میں معافی کی طلب گار ہوں۔ خدا کے لئے میری جان بخشی کی جائے۔"

مہر زریں روتی ہوئی سلطان کے قدموں میں آ گری لیکن ہشیار نظام الملک نے پاؤں کی ٹھوکر سے اُسے پرے دھکیل دیا۔

"فکر نہ کر تیرے لئے جہنم کی بھٹی ہی گرم کی جائے گی۔"

"میرے آقا رحم...... میں اپنی غلطی پہ نادم ہوں۔ مجھ بدبخت پہ نظر کرم کیجئے۔"

"خاموش رہو۔"

نظام الملک کا چرمی کوڑا اس کے منہ پر پڑا اور وہ ایک زخمی کتیا کی طرح تڑپ اٹھی۔ چرمی کوڑا اُس کے چہرے کا گوشت ادھیڑ لایا تھا۔ وہ اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی...... اب سلطان سوانا سے مخاطب ہوا۔

"دیوان سوانا! تم نے ہمیشہ دکن کے ساتھ غداری کی ہے ہماری حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے بھی تم نے بیجے نگر کے مہاراج دیورائے سے مدد مانگی کیونکہ سانپ صرف انسانوں کو ڈس سکتے ہیں بغاوت نہیں کرا سکتے۔ تم شیرازی سے زیادہ عقلمند تھے۔ تم نے اُسے بھی اندھیرے میں رکھا اور دیورائے کی مدد سے دکن کی سلطنت پر خود قابض ہونے کے خواب دیکھے۔ ہمیں بہت دیر سے تمہاری تلاش تھی۔ اگر تم پہلے مل جاتے تو تمہاری لاش گلبرگہ کے قلعہ پر ٹانگ دی جاتی لیکن اب ہم بیجے نگر بھیج دیں گے۔"

اس کے بعد فوراً ہی اُس نے مجرموں کے متعلق اپنے احکام صادر کئے۔

"شیرازی نے ہمارے لئے بھی ناگ پال رکھے تھے۔ اس لئے ہمارا حکم ہے۔ اُسے انہی سانپوں سے ڈسوایا جائے۔"

اپنی موت کا حکم سن کر شیرازی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی اور دھم سے فرش پہ آ گری۔ سلطان کہہ رہا تھا۔

"مہر زریں پر خونخوار کتے چھوڑ دیئے جائیں۔ دیوان سوانا کا سرتن سے جدا کر دیا جائے۔ تینوں لاشیں فیروز آباد کے بازاروں میں گھسیٹی جائیں پھر انہیں قلعہ کے دروازے پر لٹکایا جائے گا اور واپسی پر سوانا کا سر ہم دیورائے کے لئے بطور تحفہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"مہر زریں کے حلق سے بھی چیخیں اُبل پڑیں۔ نظام الملک نے کرخت لہجے میں اُسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ موت کے فیصلے صادر کرتے کے بعد سلطان نے پرتھال کی طرف دیکھا۔ "پرتھال! تم نے ہماری بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ مابدولت تم سے خوش ہیں۔ آج سے تم قصر شیرازی کی مالک ہو۔ اور زرینہ! تم نے دکن کو آنے والی ایک بھیانک مصیبت سے بچا لیا ہے۔ ہم اس خدمت کے صلہ میں تمہیں "دختر دکن" کا خطاب دیتے ہیں اور مہر زریں کی جگہ بہمنی محلات کا نگران مقرر کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر سلطان نہایت تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ بیگم جہاں، پرتھال اور زرینہ بھی اس کے پیچھے چل دیں۔ نظام الملک چند سپاہیوں کے ہمراہ وہیں ٹھہر گیا۔ پھر اُس کے حکم پر بیگم شیرازی کو بھی زنجیریں پہنا دی گئیں اور سپاہی تینوں مجرموں کو گھسیٹتے ہوئے قلعہ کی طرف لے چلے۔

آج ہی رات سلطان کے احکام کی تعمیل ہو جانی چاہیے تھی۔ دوسرے روز اُسے بیجا نگر کی طرف کوچ کرنا تھا۔

ہیبت سلطان

سلطان ابھی تک برافروختہ نظر آ رہا تھا۔

مجرموں کو اگرچہ رات ہی کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا تھا اور اُس وقت غلام اُن کی لاشوں کو فیروز آباد کے بازاروں میں گھسیٹ رہے تھے مگر بھی فیروز شاہ خونخوار بھیڑیے

مانند غرا رہا تھا۔ برار کے اُن لوگوں کو گرفتار کرنے کے لئے بھی سوار روانہ ہو چکے تھے جنہیں شیرازی نے پرسوں ہی نامے بھیج کر فیروز آباد طلب کیا تھا۔ مغلوب الغضب سلطان شاید انہی کم نصیبوں کا انتظار کر رہا تھا۔

رات اُس نے قصرِ لالہ ہی میں بسر کی تھی۔ تمام بیگمات اور شہزادیوں نے یہیں اس کی حاضری دی تھی۔ شیرازی کے بھیانک ارادوں اور اس کے عبرتناک انجام نے سب کے چہروں پر خوف و ہراس طاری کر دیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی اس ناگن سے خوش نہ تھی لیکن وہ سب اس طرح ڈری اور سہی ہوئی تھیں جیسے سلطان ان کی طرف سے بھی مطمئن نہ ہو۔ ان میں صرف بیگم عالیہ ہی کو برافروختہ بادشاہ سے گفتگو کرنے کی جرأت ہو سکی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ظلِ سبحانی! میرا بیٹا تو ٹھیک ہے نا...... کہیں آپ کے بعد پھر تو اُس پر......"

سلطان نے خشمگیں نظروں سے عالیہ کی طرف گھورا مگر پھر فوراً ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرز گئی۔

"عالیہ! تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تمہارا جانِ عالم بالکل محفوظ ہے۔ ہم بھی تمہاری ہی طرح اُس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ ہماری زندگی میں تمہیں اس کے متعلق زیادہ تشویش نہیں کرنی چاہیے۔"

"مگر داؤد خاں ابھی تک زندہ ہے۔"

"اس وقت وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا جانِ عالم کے قدموں میں پڑا ہوگا۔ ہم بیدر پہنچتے ہی اس کی لاش فیروز آباد روانہ کر دیں گے۔"

"پروردگارِ عالم! تیرا شکر ہے۔ تو نے سب کو محفوظ رکھا۔"

بیگم عالیہ کے ساتھ دوسری عورتوں کے بھی ہونٹ تھرتھرائے شاید وہ بھی کلمۂ شکر ادا کر رہی تھیں۔ ان سب میں بیگم جہاں اپنے بڑھاپے کی وجہ سے ممتاز و منفرد دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی دور اندیشی مسلم تھی۔ وہ دربار اور محلات کے معاملات پر گہری نگاہ رکھتی تھی اور اب اس کی زندگی کے ساٹھ سالہ تجربہ کی دانائی نے ایک مرتبہ پھر دکن کو آنے والے سیاہ خطروں سے بچا لیا تھا۔

بہمنی خواتین کو جب معلوم ہوا کہ بیگم شیرازی کے خطرناک ارادوں کی خبر ملتے پر تھال

ہی قاصد کے روپ میں سلطان معظم کے پاس بھاگ گئی تھی اور اس کے ایما پر سلطان نے اچانک فیروز آباد کا سفر اختیار کیا تھا تو وہ اُس کی جرأت و ہمت پر متحیر ہوئے بغیر نہ رہیں بالخصوص بیگم عالیہ اس کی بے حد ممنون تھی۔ اُس کے بیٹے کی جان بچانے کے لئے پرتھال نے حیرت انگیز بہادری دکھائی تھی۔

"ظلِ سبحانی!" عالیہ نے ملتجیانہ نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کنیز کی ایک تمنا ہے۔"

"بیگم عالیہ کیا چاہتی ہے؟" سلطان کا لہجہ تبدیل ہو چکا تھا اور اب وہ پہلے کی طرح زیادہ مشتعل نہیں تھا۔

"بانو پرتھال مجھے سونپ دی جائے۔ وہ میری تنہائیوں کو بانٹ لے گی۔"

عالیہ کی زبان سے یہ فقرہ سن کر سلطان قہقہہ مار کر ہنس دیا اُس کی آواز جس میں تلواروں کی سی جھنکار تھی قصرِ لالہ میں دور تک گونجتی چلی گئی اور غلام گردش میں تیزہ بردار محافظ بھی چونک اٹھے۔ بیگم عالیہ کے ساتھ دوسری خواتین بھی سہم سی گئیں پھر ایک ثانیہ بعد وہ بولا۔

"بیگم! بانو پرتھال کنیز نہیں۔ ہماری بیٹی ہے شاید یہ لڑکی مستقل طور پر تمہیں ہی سونپنی پڑے۔"

بیگم جہاں اور پرتھال کے سوا سلطان کا یہ ذومعنی سا فقرہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکا لیکن امیر فضل اللہ شیرازی کی بیگم اس کی نوعیت سے بے خبر نہ رہ سکی۔ اُس کی ایک لڑکی پہلے ہی سے شہزادہ حسن کے نکاح میں تھی۔ سلطان کا یہ فقرہ سن کر وہ چونک سی گئی۔ اس نے عجیب نظروں سے پرتھال کو دیکھا۔ سلطان نے اس کے دل کی پریشانی کو چہرے پر پڑھ لیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں بیگم امیر! تمہاری بیٹی کے حقوق پامال نہیں ہوں گے۔ تمہیں فکرمند نہ ہونا چاہیے۔"

"ظلِ سبحانی کی موجودگی میں مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو بانو کو اپنے لئے مانگ لینا چاہتی تھی۔"

امیر فضل اللہ کی بیگم کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تیر گئی تھی اب بھی خواتین سلطان

کے فقرے کا مفہوم بخوبی سمجھ چکی تھیں اور پرتھال کا مستقبل سب پر روشن ہو گیا تھا۔ وہ ایک ستار زادی کی قسمت پر رشک کرنے لگیں پھر سلطان اچانک پرتھال سے مخاطب ہوا۔

"بانو! ہمارا خیال ہے۔ تم اپنے ماں باپ کو بھی محل میں بلوا لو۔ قصرِ شیرازی میں ان کے قیام کی گنجائش نکل آئے گی۔

پرتھال نے ایک سعادت مند بیٹی کی طرح فوراً گردن جھکا دی۔

"ظلِ سبحانی! کنیز پر بے پایاں کرم فرما رہے ہیں۔"

"نہیں بانو! ہم اپنا حق ادا کر رہے ہیں اور ہاں قصرِ شیرازی کا نام بدل جانا چاہیے۔ اب اسے قصرِ پرتھال کے نام سے یاد کیا جائے گا۔"

پرتھال کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ زرینہ نے ہشیار نظام الملک کے آنے کی اطلاع دی۔ سلطان نے بعض ضروری انتظامات کے لئے اُسے خود ہی طلب کیا تھا فوراً ہی خواتین کی محفل بکھر گئی اور وہ پرتھال کو گھیرے ہوئے بیگم عالیہ کے قصر کی طرف چل دیں۔ نظام الملک کو اُسی کمرے میں حاضری کی اجازت مل گئی۔

جب وہ کورنش کی رسم ادا کر چکا تو سلطان نے مجرموں کی لاشوں کے متعلق استفسار کیا۔

"بازاروں میں گھسیٹنے کے بعد تینوں لاشیں قلعہ کی دیوار پر لٹکا دی گئی ہیں۔"

"لوگوں کا کیا خیال ہے؟"

"وہ سب باغیوں سے متنفر ہیں عالی جاہ!"

پھر ایک لمحہ رُک کر نظام الملک نے خوشخبری سنائی۔

"برار کے مجرم راستے ہی میں گرفتار کر لیے گئے ہیں سلطانِ عالی! وہ فیروز آباد سے صرف ایک منزل کے فاصلہ پر تھے۔ کل بارہ آدمی تھے اور سردار نعیم ان کی قیادت کر رہا تھا۔"

"تو باغی قلعہ میں پہنچا دیئے گئے ہیں؟"

"صرف ظلِ سبحانی کے حکم کا انتظار ہے۔"

"ہمارے پاس اُن کے لئے موت کے سوا اور کوئی انعام نہیں لیکن گردنیں مارنے سے پہلے ان کے بارے میں تحقیق ضرور کر لینی چاہیے۔ ہم کسی بے گناہ کے لہو میں ہاتھ نہیں بھریں گے۔"

"سردار نعیم کے علاوہ سب معافی کے خواستگار ہیں۔ اُن کا بیان ہے انہیں سردار داؤد خاں نے گمراہ کیا تھا۔"

"بغاوت ناکام ہو جانے کے بعد ہر مجرم اپنا جرم کسی دوسرے کے کندھوں پہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن انہیں معافی نہیں مل سکے گی۔"

"تو کیا......"

"نہیں...... ابھی تلوار نیام میں رہنے دو۔ ہم سردار داؤد خاں کے سامنے ان کی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ انہیں زنجیریں پہنا کر بیجے نگر تک لے جاؤ۔"

نظام الملک نے سر اطاعت خم کر دیا۔

"اور بیجے نگر کے سواروں کی کوئی خبر؟"

"ابھی تک کوئی خبر نہیں مل سکی ظلِ سبحانی! سرحدوں پر نگرانی جاری ہے۔ کرناٹک کا کوئی پرندہ بھی دکن میں داخل ہوا تو اطلاع مل جائے گی۔"

"تو پھر کوچ کی تیاری کرو۔ ہم سہ پہر کے وقت بیجے نگر کی طرف روانہ ہوں گے لیکن واپسی دریائے تنگ بھدرا کی بجائے کرشنا ندی کے راستے ہوگی۔"

"بہتر ہے عالی جاہ!"

نظام الملک کے جاتے ہی سلطان نے بیگم جہاں کو ضروری ہدایات دیں اور خود بھی واپسی کی تیاریاں کرنے لگا۔



فیروز آباد کی فصیل پر سیاہ پرچم بدستور لہرا رہا تھا اور اُس کے سائے میں بیگم شیرازی، مہر زریں اور دیوان سوانا کی وہ مکروہ لاشیں لٹک رہی تھیں تمام سانپ ایک بڑے الاؤ میں زندہ ہی جلا دیئے گئے تھے۔ چند گلے سڑے ناگ لاشوں کی گردنوں میں بھی پہنا دیئے گئے سازش کی تمام کڑیاں جلا کر راکھ کر دی گئی تھیں اور فیروز آباد کے لوگوں پر سلطان فیروز شاہ بہمنی کی ہیبت اور دہشت طاری تھی۔ سب جانتے تھے سلطان عادل اور رحم دل ہے۔ اُس کا قانون ظلم کی حمایت نہیں کرتا۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ مہر و محبت کے ساتھ پیش آتا۔ اُن کی شکایتیں سنتا اور مصیبتوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ انہیں بخشش سے نوازتا اُن کے حق ادا کرتا اور درخواست کے بغیر اُن کے احوال سے باخبر رہتا ہے لیکن مجرموں

کے سروں پر اس کی تلوار بجلی کے کوندے کی طرح چمکی اور انہیں نیست و نابود کر دیتی ہے۔ کوئی ظالم اُس کی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ انہیں پکڑتا اور عبرت ناک سزائیں دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے قریب ترین عزیزوں کے متعلق بھی اُس کے فیصلوں میں کوئی لچک پیدا نہیں ہو سکتی ظالم اور مجرم کے سر پر اس کی تلوار بہر طور جگمگائے گی۔ خواہ وہ کوئی ہو اور بیگم شیرازی، مہر زریں اور دیوان سوانا کی لرزہ خیز موت نے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی کہ وفاداروں کے ساتھ وہ مشفق و مہربان باپ کی طرح سلوک کرتا مگر غداروں، باغیوں اور مفسدوں کے حق میں خونخوار بھیڑیا بن جاتا اور آنکھیں بند کر کے ان کی موت کے احکام صادر کرتا ہے۔

کرناٹک کے ظالم اور عیاش مہاراج دیورائے کے ساتھ مل کر مملکتِ دکن کے خلاف سازش کا جرم ایسا نہیں تھا کہ فیروز آباد کے باشندے اُسے با آسانی معاف کر سکتے۔ انہوں نے شیرازی، مہر زریں اور دیوان سوانا پر با آواز بلند لعنت پڑھی۔ وہ گروہ در گروہ قلعہ کے سامنے جمع ہونے لگے پھر چلائے۔

”ہم سردار داؤد اور اس کے ساتھیوں پر تھوکنے آئے ہیں۔ ان کی لاشیں بھی فصیل پر لٹکا دی جائیں۔“

لیکن نظام الملک نے انہیں بتایا۔ ”سلطان بیجا نگر پہنچ کر ان کا مقدمہ سنیں گے۔ برار کے سب باغی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔“

برار...... دکن کا خطہ جنت نگاہ فیروز آباد کے لوگوں کو جہنم کا دروازہ معلوم ہونے لگا۔ سب باغی اسی علاقے سے اٹھے تھے تو برار کی نبضوں میں سرکش خون دوڑ رہا ہے؟ لیکن یہ فردوس نظر سرزمین شاید اب گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالی جائے گی۔ سلطان جب بیجانگر کی مہم سے لوٹ کر آئے گا تو امیر فضل اللہ کی بجائے کسی سخت گیر سردار کو اس پر مسلط کر دے گا۔ اگر اس کی نگاہِ انتخاب ارگو خاں پر پڑی تو وہ خونخوار بھیڑیا اُس وقت تک چین نہیں لے گا۔ جب تک برار کی سرکش نبضوں میں دوڑتا ہوا خون منجمد نہ ہو جائے۔

آہ بد قسمت برار...... تیرے گلزاروں نے شعلے اگل کر تیری بہاروں میں آگ لگائی ہے۔ اب تجھے تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔

سہ پہر کے وقت جب سلطان فیروز شاہ اپنے کوتل گھوڑے پر سوار تلوار کے دستے پر

ہاتھ لٹکائے اور لوہے کا لباس پہنے فیروز آباد کے بازاروں سے گزر رہا تھا تو شہر کی فضا.....
"زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔

بہمنی سواروں کے آگے آگے وہ ایک پُروقار فاتح کی مانند گھوڑا بڑھائے جا رہا تھا۔ برار کے بدنصیب باغی زنجیروں میں جکڑے اس کی رکاب میں چل رہے تھے جنہیں خوفناک چہروں والے سوار نیزوں سے ہانک رہے تھے اور بھالے کی نوک پر دیوان سوانا کا سر سب کو نظر آ رہا تھا۔

لوگوں نے بلند آواز سے اُن پر لعنت پڑھی اور ان کے چہروں پر تھوک دیا۔ سلطان نے فیروز آباد سے ایک ہزار سوار اور اپنے ہمراہ لئے تھے اب دو ہزار مسلح سوار جو سب کے سب آہن پوش تھے بڑے کروفر کے ساتھ لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کرتے ہوئے بازاروں سے گزر رہے تھے۔ اُن کے گھوڑوں کی ٹاپیں دلوں میں دھمک رہی تھیں۔ در و دیوار پہ ایک لرزہ سا طاری تھا۔ سلطان کا یہ فاتحانہ جلوس شہر کے دروازہ سے نکل کر چھورہ ندی کی طرف بڑھنے لگا۔

یقیناً وہ لوگ بدبخت ہی تھے۔ جنہوں نے دکن کے ہیبت فگن سلطان کے خلاف ایک فتنہ پرداز عورت کے اشارہ ابرو پر رقص کیا تھا۔ فیروز شاہ اپنی رعایا کے جسموں پر نہیں دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے خلاف بغاوت کا خیال ہی احمقانہ تھا مگر شاید وہ لوگ اپنی تقدیر سے روٹھ گئے تھے یا پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ ایک حسین عورت نے کینچلی اُتار کر لوگوں کو اپنا اصل روپ دکھایا تھا۔ عورت جو ازل سے زمین پر بغاوت، جنگ اور قتل و خونریزی کا باعث رہی ہے۔

تاریخ کا کوئی ورق عورت کے ذکر سے خالی نہیں۔

موت کا درّہ

کرشنا ندی کو عبور کرتے ہی راجکماری چندر کلا نے اپنا گھوڑا رائچور کے میدانوں میں ڈال دیا۔

دکن کی مٹیالی بھوری پہاڑیاں جن کی سرسبز جھاڑیوں پر غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی نارنجی شعاعیں سونا بکھیر رہی تھیں بائیں ہاتھ پہ چھوڑ کر اس کا رُخ فیروز آباد کو جانے والی

اُن مڑی تڑی پگڈنڈیوں کی طرف تھا جن پر بیل گاڑیوں کے نشان مدھم پڑ گئے تھے اور پہیوں کی لکیروں پر گھاس آگ آئی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ راستہ مدت سے ویران پڑا ہے اور اب بیل گاڑیوں کے مسافر ادھر سے نہیں گزرتے۔

اس کے عقب میں دس ہزار مسلح سواروں کا لشکر شام کے سرخ اندھیروں میں دھول اڑاتا بڑھا آ رہا تھا۔ راجگورو پنڈت گورکھ ناتھ ایک سیاہ گھوڑے پر سوار ہوئے رائے رایاں کا زرد جھنڈا اٹھائے راج کماری کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ ان کی منزل فیروز آباد تھی لیکن رات کے آخری پہر یا صبح کاذب سے پہلے ان کا اپنی منزل پہ پہنچنا مشکل ہی تھا۔ فیروز آباد ابھی کوسوں دور تھا لیکن چندر کلا کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا وہ بہر طور آج ہی رات منزل کو جا لینا چاہتی ہے۔

بیجے نگر سے جنوب مشرق کی سمت ایک طویل چکر کاٹ کر انہوں نے کرشنا ندی کو عبور کیا تھا۔ چندر کلا نے راستہ ہی ایسا اختیار کیا تھا کہ سلطان کے کسی لشکر سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ دراصل وہ ٹکراؤ سے خود ہی بچنا چاہتی تھی۔ اُس کے سر پر تو صرف فیروز آباد کی دھن سوار تھی۔ گھوڑے سارا دن چلتے رہے تھے اور اب وہ تھک کر ہونکنے لگے تھے لیکن ابھی اُن کے آرام کی ساعت نہیں آئی تھی۔

مدگل کی طرح رائچور کا راستہ بھی راجگورو کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ ایک مرتبہ ادھر سے بھی کاشی کی یاترا کو جا چکا تھا مگر تب یہ راہ آباد تھی اور امیر مسافروں یا سوداگروں کی بیل گاڑیاں اس رستہ پر بھاگتی نظر آیا کرتی تھیں۔ پیادہ مسافر بھی ٹولیوں کی شکل میں گزرتے رہتے تھے اور اب مدگل کی شاہراہ کی طرح یہ راستہ بھی کئی سال سے بند پڑا تھا پھر بھی بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ راجگورو کے پاؤں رستہ سے آشنا تھے اچانک ایک سمت انگلی اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

”وہ پہاڑی درے عبور کرنے کے بعد ہمیں سیدھا راستہ مل جائے گا۔“

چندر کلا نے گردن اونچی کر کے سامنے نظر دوڑائی۔ شام کے اندھیروں میں اونچی نیچی پہاڑیاں بالکل بھول بھلیاں سی دکھائی دے رہی تھیں جن پر کگروندے کی جھاڑیاں اپنے بازو پھیلائے اُونگھ رہی تھیں راجگورو نے بتایا۔ ان پہاڑیوں کا سلسلہ اڑھائی کوس سے زیادہ طویل نہیں اور کگروندے کی جھاڑیاں جو دم بدم پھیلتے ہوئے اندھیرے میں سیاہ دھبوں کی

شکل اختیار کر گئی تھیں۔ صرف ایک کوس تک ہمارا ساتھ دیں گی۔ آگے پہاڑیاں بالکل سپاٹ ہیں۔

ان پہاڑیوں پر کہیں کہیں چھتری دار درخت بھی نظر آ رہے تھے جو تاریکی میں بھوتوں کی مانند جھوم رہے تھے۔ یہاں سے انہیں ایک تنگ درہ میں سے گزرنا تھا لیکن راجگورو کے بقول وہ اتنا چوڑا ضرور تھا کہ بیک وقت چھ سات سوار اپنے گھوڑے ساتھ ملائے اس میں سے گزر سکتے تھے دوسرے دروں کی طرح یہ درہ بھی پُر پیچ اور ٹیڑھے میڑھے رستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اگر اندھیرے میں انسان بھٹک کر کسی غلط سمت مُڑ جائے تو شاید ان کوہستانی بھول بھلیوں میں بھٹکتا اور چٹانوں ہی سے ٹکراتا رہے گا اس لئے سواروں کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ کسی دوسری سمت مڑنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اپنے اگلے سواروں کے پیچھے پیچھے چلتے آئیں۔

اندھیرا بڑھ گیا تھا اور مشعل بردار سواروں نے مشعلیں روشن کر لی تھیں۔ لیکن راجکماری کے حکم پر دوسرے ہی لمحے انہیں گل کر دیا گیا۔ اس وقت وہ دشمن کی دھرتی پر تھے اور مشعلیں روشن کر کے چلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ ابھی تک انہیں دکن کا ایک بھی سپاہی نظر نہیں آیا تھا جس سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ سلطان اپنی تمام سپاہ کو بیجے نگر کی طرف ہانک لے گیا ہے پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ چندر کلا کے حکم پر صرف ایک مشعل جلتی رہنے دی گئی جسے ایک سوار راجگورو کے ساتھ ساتھ لئے چل رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک درے سے گزرنے لگے جس کی دونوں طرف بلند عمودی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے پہاڑیاں گونج اٹھیں اور ان کی آوازیں دور دور تک پھیل گئیں۔ رات کی تاریکی میں مڑے تڑے درے واقعی ایک دوسرے سے یوں بغل گیر ہو گئے تھے کہ صحیح سمت کا تعین کرنا مشکل ہی تھا۔ اگر راجگورو ایک مرتبہ پہلے اس راہ سے سفر نہ کر چکا ہوتا تو شاید وہ کئی روز تک ان پہاڑی بھول بھلیوں ہی سے باہر نہ نکل سکتے۔ چلتے چلتے ایک راستہ اچانک دوسرے راستے کو یوں کاٹ دیتا تھا کہ اصل راہ کھو جاتی تھی۔ یہ درے ہاتھوں کی انگلیوں کی طرح ایک دوسرے سے بغلگیر تھے اور بالکل کھروندے کی جھاڑیوں کی مانند ان کی شاخیں پھوٹتی تھیں۔

ایک کوس چلنے کے بعد راجگورو نے یہ منحوس خبر سنائی کہ وہ بھی راستہ بھول گیا ہے۔

چندر کلا کے ماتھے پر فکر کی لکیریں ابھریں پھر اُس نے ایک ساتھ کئی مشعلیں روشن کرنے کا حکم دیا اور ان کی لرزتی ہوئی روشنی میں پنڈت گورکھ ناتھ پیچ در پیچ دروں کو گھورنے لگا۔ لشکر کے آخری سوار تک یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ راجگورو راستہ بھول گئے ہیں۔ سب سپاہی غم و فکر میں ڈوب گئے گھوڑوں نے رکتے ہی ہنہنانا شروع کر دیا اور سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے درے میں گھوڑوں کی ہنہناہٹیں رعد کی سی آواز میں گونجتی چلی گئیں۔ جیسے کانسی کی سینکڑوں تھالیوں پر ایک ساتھ ضرب لگائی گئی ہو۔ سوار پریشان تھے نہ جانے انہیں کب تک رکنا پڑے۔ وہ دس بیس نہیں پورے دس ہزار تھے لیکن اپنے سروں کے اُوپر گکروندے کی جھاڑیاں انہیں بدروحوں کی طرح طنزیہ ہنسی ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اکثر کے دل بھوت پریت کے تصور سے کانپ رہے تھے مگر انہیں زیادہ دیر تک اُس پُرہول درے میں ٹھہرنا نہیں پڑا شاید راجگورو نے رستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ لشکر پھر چل دیا لیکن اس مرتبہ رفتار بہت سست تھی بس یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں کیڑے رینگ رہے ہوں۔

شاید کرناٹکی سواروں کی بدبختی ہی انہیں ان کوہستانی بھول بھلیوں تک ہانک لائی تھی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ چٹانوں کی بلندیوں سے ایک ہولناک آواز اُبھری پھر سینکڑوں بھیانک قہقہے اندھیری فضا میں بکھر گئے۔ سواروں نے گردنیں اوپر اٹھائیں لیکن چٹانوں پر بدستور ایک پُراسرار سناٹا طاری تھا اور اس سناٹے میں بھیانک قہقہوں کی صدائے بازگشت بہت دور سنائی دے رہی تھی۔ ضعیف الاعتقاد سپاہی کانپ اٹھے۔ بدروحوں کے خوف سے اُن کے کلیجے اچھل کر جیسے حلق میں آ گئے تھے اچانک چندر کلا نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور بولی۔

''راجگورو! یہ آوازیں کیسی تھیں؟''

''میں نہیں جانتا۔ ان ویران پہاڑیوں میں انسانوں کا تصور تو کیا نہیں جا سکتا۔''

''تو پھر..... پھر یہ آوازیں..... یہ پُراسرار قہقہے'' چندر کلا خوف زدہ آواز میں بولی۔

''یوں لگتا ہے جیسے کوئی خطرہ ہمارے پاس رینگ رہا ہے۔''

''ہمیں جلد از جلد ان دروں سے نکل جانا چاہیے۔ ایسے مقام عموماً بھوتوں اور بدروحوں کے مسکن ہوتے ہیں۔''

اور راجگورو نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی پھر چند ہی لمحوں کے بعد راجگورو کے خوف

کا اظہار سارے لشکر میں پھیل گیا۔ درے میں اندھیرا جیسے سیاہ دھوئیں کی تہ بن کر جم گیا تھا۔ چاروں طرف ایک پرہول، پراسرار سناٹا طاری تھا جسے گھوڑوں کی ٹاپیں زخمی کر رہی تھیں۔

اچانک درے کے آس پاس چند الو چیخ اٹھے پھر سواروں نے اپنے سروں پر شعلے سے چمکتے دیکھے۔ دوسرے لمحے جب اُن کے خوفزدہ چہرے عمودی چٹانوں کی طرف اوپر اٹھے تو درے میں سینکڑوں سواروں کی بھیانک اور مکروہ چیخیں گونج اٹھیں۔ ان کے چہرے گردنوں اور سینوں میں آتشیں تیر پیوست ہو چکے تھے۔ فوراً ہی ان کی چیخیں موت کی خرخراہٹوں میں تبدیل ہو گئیں اور ایک ساتھ سینکڑوں سوار گھوڑوں کی پیٹھ سے نیچے لڑھک گئے بعض کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی جس کی چمک اور لپک سے بے سوار گھوڑے خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے تھے۔ موت کے ڈر سے سہمے ہوئے سپاہیوں نے پھر گردنیں اوپر اٹھائیں اور بلند چٹانوں کی طرف دیکھا۔ آتشیں تیر پھر سینکڑوں سواروں کی موت کا سندیس لے کر آئے اور ایک مرتبہ پھر سینکڑوں چیخیں موت کی خرخراہٹوں میں ڈھل کے رہ گئیں۔ درے میں ہر طرف افراتفری سی مچ گئی۔ سینکڑوں سوار گھوڑوں سے لڑھک کر پتھروں پہ پڑے دم توڑ رہے تھے۔ اُن کے لباس جل رہے تھے۔ مرگ آسا چیخیں موت کی سسکیوں میں ڈھل رہی تھیں اور بے سوار، مشتعل گھوڑے لاشوں کو روندتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ عمودی چٹانوں سے آتشیں تیروں کی مسلسل بارش سی ہو رہی تھی۔ حملہ آور اوپر چٹانوں پر تھے اور اندھیرے میں ان کا سایہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے برعکس آتشیں تیروں نے درے میں ہر طرف روشنی ہی روشنی پیدا کر دی تھی اور اس روشنی میں حملہ آور نہایت آسانی سے سواروں کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار سوار موت کی وادی میں پہنچ گئے۔ چندر کلا دہشت زدہ آواز میں بولی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے راجگو رو!"

"دھوکا......" راجگو رو نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"دشمن سواروں نے ہمیں ان دروں میں گھیر لیا ہے شاید انہوں نے ہمیں کرشنا ندی عبور کرتے ہی دیکھ لیا تھا مگر وہ خاموش رہے اور جونہی ہم درے میں داخل ہوئے انہوں

نے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا۔"

راجگورو کا خیال صحیح تھا۔ کرناٹکی سوار چاروں طرف سے گھیر لئے گئے تھے اور اب اُن کا موت کے اس درے سے بچ نکلنا مشکل ہی تھا۔ بھمنی تیر انداز عمودی چٹانوں سے آتشیں تیر برسا رہے تھے۔ موت سے بچنے کے لئے حواس باختہ سوار پیچھے کی طرف بھاگے اور سرنگ نما درے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ سوار اپنے ہی سپاہیوں کو روندتے ہوئے واپس بھاگنے لگے مگر موت ہر جگہ اُن کے تعاقب میں تھی۔ درے کے دہانے تک آتے آتے ان گنت انسان موت کا لقمہ بن گئے تھے مگر یہاں بھی موت ان کے استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ چاروں طرف سے آگ کے تیر برس رہے تھے۔

"سپاہیوں کو مروانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی بھی یہاں سے زندہ بچ کر نہ جا سکے گا۔"

"تو پھر ہم کیا کریں راجگورو؟" چندر کلا کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سینکڑوں سوار موت کی کالی دیوی سے ہمکنار ہو گئے تھے۔

"ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

پھر درہ "الامان..... الامان" کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ کرناٹکی سوار ہتھیار پھینک کر گھوڑوں سے اتر آئے اور بھمنی سپاہی انہیں دہانے تک ہانک لائے جہاں انہیں ریشم کی مضبوط ڈوریوں میں باندھا جانے لگا۔

نصف سے زیادہ سوار ہلاک ہو چکے تھے۔ بے شمار زخمی ہوئے تھے کسی کے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کرناٹکی سپاہیوں کو باندھ کر ایک طرف ہانک دیا گیا۔ گھوڑے ذرا مشکل ہی سے قابو میں آئے لیکن انہیں بھی اس سلیقے سے گھیر لیا گیا کہ کوئی بھی بھاگ کر نہ جا سکا۔

حملہ آور وہی آہن پوش سوار تھے جو سلطان کے ہمراہ فیروز آباد سے روانہ ہوئے تھے جب کرناٹکی قیدیوں کو معلوم ہوا کہ حملہ آور دو ہزار سے زیادہ نہیں تھے تو وہ حیران و ششدر رہ گئے مگر انہیں جس جال میں پھانس لیا گیا تھا وہاں چند سو آدمی بھی تباہی بپا کر سکتے تھے۔

یہ سوانا کی سازش کی آخری کڑی تھی جسے سلطان نے حسن تدبر سے توڑ دیا۔

چند ہی لمحوں کے بعد راجکماری چندر کلا اور راجگورو سلطان کے حضور پیش کئے گئے۔

وہ بدستور اپنے سفید کوتل گھوڑے پر سوار تھا۔ اُسے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا لشکر کی قیادت راجکماری کر رہی ہے اور راجگورو صرف اُس کی رہنمائی کے لئے ساتھ ہے اس لئے اُس نے حکم دیا تھا۔ راجکماری کے ہاتھ پاؤں نہ باندھے جائیں نہ اُسے کوئی تکلیف دی جائے۔

سلطان کو بہ نفس نفیس اپنے روبرو دیکھ کر چندر کلا کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ اسے زخمی کر چکی تھی اور اب..... اب فیروز آباد پر مجرمانہ چڑھائی یقیناً وہ اس کے لئے موت ہی کا حکم صادر کرے۔

"راجکماری! ہمیں افسوس ہے۔ ہم آپ سے ایک قیدی کی حیثیت میں مل رہے ہیں لیکن اس کی ذمہ دار آپ خود ہیں۔ جرم آپ کے سامنے ہے اپنے لئے سزا بھی آپ خود ہی تجویز کر لیجئے۔"

سلطان کا لب و لہجہ اور انتہائی شریفانہ اندازِ گفتگو دیکھ کر چندر کلا حیران و ششدر رہ گئی۔ کیا کوئی مہاراج اپنے مجرموں کے ساتھ اس نرمی سے بات بھی کر سکتا ہے؟

"مجرم اپنے لئے کبھی سزا تجویز نہیں کیا کرتے۔" چندر کلا سلطان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں بیجے نگر کی لڑائی میں آپ پر حملہ بھی کر چکی ہوں۔"

"ہمیں وہ حملہ ضرور یاد رہے گا لیکن ہم نے راجکماری کا تیر لوٹا دیا تھا۔ آدمی تو صرف ایک نگاہ سے گھائل ہو جاتا ہے۔"

سلطان کے منہ سے یہ بات سن کر چندر کلا نے اپنی گردن نیوڑائی اور نیچی نظروں سے سلطان کو دیکھتی رہی جو مشعل کی روشنی میں بڑا باوقار اور پُرعظمت نظر آ رہا تھا۔

"ہمیں ندامت ہے اس ویرانے میں ہم راجکماری کی کوئی سیوا نہیں کر سکتے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج! مجرموں کی سیوا کون کرتا ہے؟"

"بعض مجرم تیر بھی چلاتے ہیں اور اُن کی سیوا بھی کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہم نے کبھی اُن کی مرضی کے خلاف سلوک نہیں کیا۔" سلطان کہنے لگا۔

"ہم بھی بیجے نگر جا رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ چلنا پسند کریں تو بہتر ورنہ الگ سواری کا انتظام کر دیا جائے گا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"اس میں نہ سمجھنے کی کون سی بات ہے۔ کیا آپ اپنے گھر واپس نہیں جائیں گی؟"

"لیکن میں تو آپ کی قیدی ہوں۔ جانا بھی چاہوں تو نہیں جا سکتی۔"

"نہیں راجکماری! آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ آپ ہر وقت جا سکتی ہیں۔ سوال صرف حفاظت کا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم کچھ محافظ آپ کے ساتھ کر دیں۔ وہ آپ کو بیجے نگر کے دروازہ پہ چھوڑ کے لوٹ آئیں گے۔"

چندر کلا حیرت پاش نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔ وہ حیران تھی کہیں سلطان اُس کے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہا لیکن پھر اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب اس نے سلطان کو یہ کہتے سنا۔

"نظام الملک! راجکماری کی سواری کا بندوبست کرو اور انہیں بحفاظت بیجے نگر چھوڑ آؤ۔ ہم ان کی اور کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔"

"چندر کلا جو بہمنی بیگمات اور شہزادیوں کو گرفتار کرنے کے لئے فیروز آباد جا رہی تھی یہ عجیب و غریب سلوک دیکھ کر پتھر کی مورتی بن کے رہ گئی۔ جب سواری آ گئی تو سلطان نے کہا۔ اپنے آدمیوں میں سے آپ جسے بھی ہمراہ لے جانا چاہیں لے جا سکتی ہیں۔"

"چندر کلا کی حیرت ہر لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید آزمائش کے لئے اُس نے پوچھا۔

"اگر میں اپنے تمام سپاہیوں کو ہمراہ لے جانا چاہوں تو؟"

سلطان نے ایک لحہ سوچا پھر مسکرا کر بولا۔

"آپ سب کو لے جا سکتی ہیں لیکن ان کے ہتھیار واپس نہیں کئے جائیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔ آپ انہیں رہا کر دیجئے؟"

سلطان نے حکم دیا۔ "تمام قیدی رہا کر دیئے جائیں۔"

پھر قیدیوں کی ڈوریاں کھلنے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں ساڑھے چار ہزار قیدی آزاد تھے۔ خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر یہ معاملہ کیا ہے۔

"اب آپ جا سکتی ہیں۔ سواری حاضر ہے لیکن آپ کے سپاہیوں کو بیجے نگر تک پیدل ہی جانا ہوگا۔"

"تو کیا سلطان ادھوری بخشش کریں گے؟"

اُس نے ایک ساعت کے لئے پھر کچھ سوچا اور پکارا۔

"نظام الملک! سواروں کے گھوڑے بھی واپس کر دیئے جائیں۔"

سلطان کی نگاہیں چندر کلا کے چہرے پر مرکوز تھیں جو مجسمۂ حیرت بنی بہمنی حکمران کے ظرف پر دم بخود تھی۔

"اب آپ بخوشی بیجے نگر جا سکتی ہیں۔"

چندر کلا نے ایک لمحہ تک سلطان کو بغور دیکھا پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک قیامت خیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"سلطانِ معظم! اب تو چندر کلا آپ کے ساتھ ہی جائے گی۔"

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بیجے نگر تک ساتھ رہے گا۔"

پھر سلطان نے روانگی کا حکم دیا اور دونوں لشکر ساتھ ساتھ بیجے نگر کی طرف چل دیے مشعل بردار سواروں نے مشعلیں روشن کر لی تھیں۔ راستے میں ان کے درمیان بہت کم گفتگو ہوئی۔ سلطان نے اسے بتایا۔ وہ عورتوں کے متعلق بڑی غیرت رکھتا ہے اور اس وقت تک بیجانگر کو نہیں چھوڑے گا جب تک پرتھال کی بے عزتی کا انتقام پورا نہیں ہو جاتا۔

چندر کلا اُس کے حسنِ سلوک ہی سے متاثر نہیں ہوئی سلطان کی گفتگو نے بھی اُسے متحیر کر دیا تھا۔

جب وہ بیجے نگر کی حدود میں داخل ہوئے اس وقت سورج طلوع ہو چکا تھا اور صبح کی رنگین شعاعیں خشک پہاڑیوں پر رنگ بکھیر رہی تھیں۔

سلطان نے چندر کلا کو الوداع کہی۔ رخصت ہونے سے پہلے اُس نے کہا۔

"میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔"

"سلطان عالی! مگر میں یقین دلاتی ہوں۔ مہاراج کو صلح کرنے اور معافی مانگنے پر مجبور کروں گی۔ انہوں نے جو کچھ کیا اُس سے میں بھی شرمندہ ہوں۔"

"شاید صلح کا وقت گزر چکا ہے۔"

اچانک سلطان کے لہجے میں درشتی اور کرختگی پیدا ہو گئی۔ وہ نفرت آلود لہجہ میں بولا۔

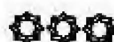
"مہاراج دیورائے ان آدمیوں میں سے نہیں جن کی کسی بات پر اعتبار کر لیا جائے۔ اب تو تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔"

یہ کہہ کر سلطان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور اپنے لشکر کی سمت چل پڑا۔

چندر کلا ایک ٹیلے پر کھڑی اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ یہ انسان یقیناً اس کے فہم و شعور سے بالا

تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ راجکورو اس کے پاس ہی کھڑا کہہ رہا تھا۔ "آیئے راجکماری! دھوپ تیز ہو رہی ہے۔ سلطان کے متعلق سوچنا بے کار ہے وہ جو کچھ کہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے ارادے تبدیل نہیں کر سکتی۔"

چندر کلا ہولے ہولے راجکورو کے ساتھ چلنے لگی۔ شاید وہ اپنا دماغ کہیں بھول آئی تھی۔



15

کامیاب مراجعت

شبخون

دوسرے روز لشکرِ برار کے سپہ سالار سردار داؤد خاں اور اُس کے بارہ ساتھیوں کی لاشیں پھانسیوں پر لٹک رہی تھیں۔

باغیوں کے متعلق سلطان کے احکام بڑے سخت اور لرزہ خیز تھے وہ ہر اُس چیز کو نیست و نابود کر دینے کی قسم کھا چکا تھا جس کا سازش سے کوئی بھی تعلق ہو سکتا تھا۔

سردار داؤد کو امیر فضل اللہ کے لشکر سے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ برار کے وہ باغی جنہیں وہ فیروز آباد سے لے کر آیا تھا۔ سردار داؤد کے ساتھ ہی علما کی مجلس کے سپرد کر دیئے گئے قاضی القضاۃ علامہ منہاج، مولانا لطف اللہ سبزواری، قاضی سراج اور سید محمد کازونی اُس جنگی عدالت کے رکن تھے جو فوجی سرداروں کے مقدمے سنتی تھی۔

دوپہر کے وقت نظام الملک سلطان کی بارگاہ میں حاضر ہوا علما کی عدالت نے صرف ایک شخص فریدوں کی رہائی کی سفارش کی تھی۔ باغی اُسے دھوکا سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ وہ اس سازش کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ باقی مجرموں کے لئے علماء نے قتل کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جس کے لئے صرف سلطان کی رضامندی ضروری تھی۔ اُس نے قتل کے احکام پر شاہی مہر ثبت کر دی۔ اس کا چہرہ ایک سنگین مجسمہ کی طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور اس وقت صرف سفاکی کا پیکر نظر آ رہا تھا۔

جب نظام الملک اُس کے احکام لے کر بارگاہ سے چلا گیا تو اُس نے اطمینان کا

سانس لیا۔ وہ مجرموں کے ساتھ ذرا سی رعایت برتنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ اگر اس نے بیجانگر پر چڑھائی نہ کی ہوتی اور جنگ کی آگ میں نہ کودا ہوتا تو ممکن ہے وہ اتنے سخت فیصلے صادر نہ کرتا اور اس کی کریم النفسی بعض مجرموں کو معاف بھی کر دیتی لیکن ایک طرف مہاراج دیورائے کی سرکشی اور روایتی کینہ توزی اور دوسری سمت پورے بہمنی خاندان کو ہلاک کرنے اور حکومت کا تختہ الٹ دینے کی بھیانک سازش اُس کے قہر و غضب کو بھڑکا دینے کے لئے کافی تھی آخر وہ ایک انسان تھا۔ غلطی بھی کر سکتا تھا لیکن جو حالات اُس نے بچشم خود ملاحظہ کیے تھے۔ ان کے پیش نظر اُس کا برافروختہ ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔

اگر باغی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے اور بیگم شیرازی کے زہریلے ارادے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے تو اُس کے لئے کسی رحم کی توقع ہو سکتی تھی؟

شاید خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ وہ بھی کالے زہر کا لقمہ بن جاتا اور اُسے سسک سسک کر مرنا پڑتا یا اس کا جسم لوہے کی گرم سلاخوں سے داغ دیا جاتا پھر اُس کی لاش کتوں اور گدھوں کی خوراک بن جاتی اور بہمنی خاندان کا نام صفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتا۔ اب وہ مجرموں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کیوں کرتا انہیں اپنے رحم سے کیوں نوازتا؟

زبان کی بجائے باغیوں کے ساتھ اس نے نوکِ شمشیر سے گفتگو کی تھی اور یقیناً وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نظام الملک نے پھر حاضری کی اجازت طلب کی اور اُسے بتایا کہ سلطان کے احکام کی تعمیل کر دی گئی ہے۔ تمام مجرم پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

یہ سن کر وہ مطمئن ہو گیا اور اس کا غضب ناک چہرہ جو تین روز سے شعلے کی مانند دہک رہا تھا ہولے ہولے اعتدال پر آتا چلا گیا۔ اب وہ پہلے کی طرح پرسکون تھا۔

سہ پہر کے وقت اُس نے شہزادہ حسن خاں، ارگو خاں، قباچہ، کوسل رائے، فولاد خاں اور شمشیر خاں کو طلب کیا اور ان کے ساتھ جنگ کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک حسب دستور اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ سائے کی طرح دونوں سردار ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے گویا وہ اس کی زندگی ہی کا جزو بن کے رہ گئے تھے سلطان سازش کے واقعہ کو اپنے ذہن سے یوں جھٹک چکا تھا جیسے یہ واقعہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا اور اس وقت اپنی روایتی وجاہت کے ساتھ اپنے افسروں کے مشورے سن رہا

تھا۔

❁❁❁

سلطان کے فیروز آباد جانے کے بعد جس کا علم خود اس کے لشکریوں کو بھی نہیں ہو سکا تھا۔ دیورائے صرف ایک مرتبہ قلعے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ اس کے ساتھ بیس پچیس ہزار سوار اور اتنی ہی تعداد میں پیادہ سپاہی تھے۔ اس نے فصیل سے تھوڑی ہی دور اپنا زریں چتر نصب کرایا اور فوج کو آگے بڑھا کر خود اس چتر کے نیچے متمکن ہو گیا تھا۔ اس کا سیناپتی راج سنگھ ایک ہاتھی پہ سوار تھا۔ اس نے جنگی ہاتھیوں کو ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھایا تھا۔ کافی دیر تک وہ اپنی صفیں ہی درست کرتا رہا تھا۔ اس لڑائی میں دیورائے کی حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں تھی۔

شہزادہ حسن نے فوراً ہی اپنے لشکر کو آراستہ کر دیا تھا لیکن ہاتھیوں کے مقابلہ پر اس نے اپنے جنگی ہاتھی نہیں بڑھائے بلکہ اُن کی بجائے بار برداری کے ساٹھ ستر اونٹ سب سے آگے کھڑے کر دیئے تھے جن کے پورے جسم سیاہ چادروں سے ڈھک دیئے گئے تھے اور ان کے پاؤں اور گردنوں میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

بیجے نگری فصیل سے بیک وقت بیسیوں سنکھ پھونکے جا رہے تھے پھر کرناٹک کے ایک طویل قامت اور بھاری بھرکم پہلوان نے جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا۔ مبارزت طلب کر لی تھی۔ ارگو خان یہ کہتا ہوا میدان کی طرف بڑھا۔

"بے کار پڑے پڑے میرے برچھے کو زنگ لگ جائے گا۔ میں آہن پوش کرناٹکی پر اُسے ذرا صیقل کر آؤں۔"

دراصل ارگو خاں لڑائی کے لئے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے جاتے ہی حریف پر بھالے سے وار کیا تھا پھر اس کے اردگرد اپنا گھوڑا نچاتا رہا۔ اس نے زرہ بکتر تک نہیں پہنا تھا لیکن دشمن کو ٹھکانے لگانے میں اسے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ چوتھے وار ہی میں ارگو خاں کے بھالے کی تیز نوک اس کا حلق پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور وہ ایک مکروہ چیخ کے ساتھ گھوڑے سے نیچے آ رہا تھا پھر ارگو خاں نے یکے بعد دیگرے چھ دشمنوں کو موت کی دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا اور جب راج سنگھ نے اپنے جنگی ہاتھی بڑھائے تو اونٹوں کے پیچھے ڈھول بجا کر انہیں موت کی سیاہ چٹانوں کی طرف ہانک دیا گیا۔ ڈھول پیٹنے والے بدستور

ان کے پیچھے تھے۔ ہاتھی ایک مرتبہ پھر مشتعل اونٹوں کو دیکھ کر جن پر سیاہ لبادے جھول رہے تھے گھبرا سے گئے تھے۔ پھر ارگو خاں نے ایک ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی تھی اور وہ بے تحاشہ چنگاڑتا ہوا واپس بھاگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھیوں کا قافلہ پلٹ گیا اور کرناٹکی سپاہ میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی لیکن سیناپتی نے عقلمندی سے کام لے کر قلعہ کا دروازہ کھلوا دیا تھا اور سب ہاتھی اندر ہانک دیئے گئے تھے پھر اس کے سوار آگے بڑھے تھے اور شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ میدان جنگ سے پلٹ آئے تھے۔ دیورائے نے اپنا چتر اٹھوا کر واپسی کا سنکھ پھونکنے کا حکم دے دیا اور بیجانگر کی فوج ڈیڑھ ہزار لاشیں چھوڑ کر پھر قلعہ بند ہو گئی تھی۔

ارگو خاں کے برچھے کا زنگ اتر گیا تھا۔

شہزادہ حسن نے ایک تجربہ کار سپہ سالار کی طرح فوج کی قیادت کی تھی اور اپنے دو سو پہریداروں کی شہادت کے عوض دشمن کو شکست دینے میں کامیاب رہا تھا۔ قباچہ خاں اور کوسل رائے جو چوہوں کی مانند پہاڑی گھاٹیوں میں دبکے پڑے تھے ایک ہزار کے قریب دشمنوں کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب رہے تھے جنہیں وہ بھیڑوں کی طرح لشکر گاہ کی طرف ہانک لائے تھے۔

اس معرکہ کو آج تیسرا روز تھا اور پھر قلعہ کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ کرناٹکی سپاہ نے حیرت انگیز خاموشی اختیار کر لی تھی اور ارگو خاں کے برچھے کو پھر زنگ لگنا شروع ہو گیا تھا۔



کوسل رائے کا خیال تھا۔ فصیل میں سیندھ لگائی جائے اور ارگو خاں اس بات پر مصر تھا کہ قلعہ پر مسلسل شب خون مارے جائیں اور دیورائے کی قلعہ بندی میں رخنے ڈال دیئے جائیں۔ نجانے کیوں سلطان نے اس کی رائے کو پسند کر لیا اور حسن خاں کو حکم دیا۔ وہ فصیل کی جنوب مشرقی سمت اور ارگو خاں مغربی جانب سے قلعہ پر شبخون ماریں۔ کوسل رائے اور قباچہ خاں ان کے لئے کمندیں اور رسیوں کی سیڑھیاں مہیا کریں اور فصیل کو جس جگہ کمزور دیکھیں وہاں سیندھ لگانے کی کوشش کریں۔

دیورائے کو قلعہ سے باہر نکالنے اور فیصلہ کن لڑائی پر مجبور کرنے کے لئے وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

حسن خاں اور ارگو خاں کے لشکر شام تک شبخون کی تیاریاں کرتے رہے لیکن فصیل در

فصیلِ قلعہ کے اندر گھری ہوئی فوج پر شبخون مارنا ایک جنگی حماقت ہی تھی اور یہ سمجھتے ہوئے کہ قلعہ بند فوج پر شب خون مارنے والا سپہ سالار دراصل موت کے دروازے پر دستک دیتا ہے سلطان نے قلعہ پر دھاوے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کا مقصد صرف دشمن کو پریشان اور مشتعل کرنا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی شہزادہ حسن کا لشکر نہایت خاموشی کے ساتھ ایک سمت کو نکل گیا۔ گھوڑے لشکر گاہ ہی میں چھوڑ دیئے گئے تھے۔ انہیں چند کوس کا چکر کاٹ کر فصیل کی جنوب مشرقی سمت پہنچنا تھا۔ یہی جانب ابھی تک محاصرہ سے محفوظ تھی اور کرناٹک کے دوسرے قلعوں کے ساتھ نامہ و پیام کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ ارگو خاں بھی نصف رات کو مغربی جانب چل دیا اُسے نسبتاً تھوڑا فاصلہ طے کرنا تھا۔

کوسل رائے اور قباچہ کے سیند لگانے والے سرنگ دوز شام ہی سے چٹانوں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ فصیل پر پھرنے والے پہرے دار جب آدھی رات کے خواب آور جھونکوں سے آنکھیں بند کرنے لگے تو چٹانوں میں دبکے ہوئے "پہاڑی چوہے" اپنی کمین گاہوں سے نکل کر آگے بڑھے۔

قلعوں پر شبخون مارنے والا افسر احمق ہی ہو سکتا ہے اور کرناٹکی پہریدار سلطان فیروز شاہ کی جنگی فراست سے منکر نہ تھے۔ یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ سلطان کی ذہانت کوئی غلط فیصلہ کر سکتی ہے۔ اُن کی آنکھوں میں نیند کا خمار گھوم رہا تھا۔ انہوں نے جمائیاں لیتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور لڑکھڑائی ہوئی آواز میں ہانک لگائی۔

"دمودر! تمرادچار کیا ہے۔ رات کے سمے دشمن قلعہ کی طرف آنے کا دھیان بھی کرے ہے؟"

"رام رام کرو جگو! کس مائی کے لال میں ہمت ہووے کہ کالی پہاڑیوں کی طرف پاؤں بھی اٹھا جاوے۔ ہمرے تیر اُس کا ناش نہ کر دیں گے۔"

پھر پہرے دار اُسی طرح ہانکیں لگاتے فصیل کے کنگوروں کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اُن کے آس پاس نیند کی پریاں ناچنے لگیں۔ انہیں ہوش اُس وقت آیا جب بہمنی سپاہیوں کی تلواریں اُن کے سروں پر کوندرہی تھیں لیکن فصیل کے اوپر زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا۔

رات کے اندھیروں میں حملہ آور برجوں سے ہوتے ہوئے نیچے اُترنے لگے اور نیند میں غرق سپاہیوں کے لئے اجل کا فرشتہ بن گئے۔

جب سیناپتی کو خبر دی گئی کہ دکنی لشکر نے جنوب مشرقی فصیل پھاند کر شب خون مارا ہے تو وہ سلطان کی حماقت پر حیران و ششدر رہ گیا۔ ایک آن کے اندر دوسری فصیل کا دروازہ کھلا اور ہزاروں سپاہی حملہ آوروں کو گھیرنے لگے۔

رات کی تاریکی میں ہتھیاروں کی کھٹاکھٹ اور مرنے والوں کی بھیانک چیخیں سن کر سپنوں میں ڈوبے ہوئے راج محل کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ سنگھ کا خیال تھا وہ ایک بھی حملہ آور کو زندہ سلامت واپس نہ جانے دے گا پھر جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ شبخون مارنے والا دکن کا ولی عہد شہزادہ حسن خاں ہے تو اُس کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ اس نے حکم دیا۔

"راجکمار کو زندہ گرفتار کیا جائے۔"

لیکن ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ قلعہ کی مغربی سمت سے بھی حملہ کی خبر ملی۔ حیرت سے بوکھلا کر وہ خبر رساں کو گھورنے لگا۔

"کیا بکواس کرتے ہو۔"

"بکواس نہیں مہاراج! ارگو خاں......"

"ارگو خاں......"

سنگھ کو اپنے حلق میں گولے سے اٹکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کرناٹکی سینا کے لئے موت کے خونخوار دیوتا کا نام ارگو خاں تھا۔ اب وہ سمجھ گیا۔ یہ شب خون سلطان کی حماقت نہیں ایک تباہ کن چال تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر فصیل کی مغربی جانب لپکا جہاں ارگو خاں کے برچھے کا زنگ اُتر رہا تھا۔

راج محل کے دریچوں کے پٹ کھلتے چلے گئے۔ شہر کی پہلی فصیل بہمنی بھیڑیوں کی شکارگاہ بن چکی تھی۔

حملہ آور زیادہ دیر تک قلعہ کے اندر نہیں ٹھہرے۔ انہوں نے جلدی جلدی تلواریں چلائیں۔ محصور سپاہیوں کی تقدیر کو خون کا غسل دیا اور بھاگتے کاٹتے پھر فصیل پر آگئے اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔ پو پھوٹنے سے پہلے ہی وہ مختلف سمتوں سے بہمنی لشکر سرا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تلواروں کی کھٹا کھٹ بند ہو چکی تھی اب گھپ اندھیرے میں صرف فصیل کے حجروں کے آس پاس زخمی سپاہیوں کے کراہنے کی آوازیں سسیا رہی تھیں اور ان آوازوں میں مہاراج دیورائے کی غضب ناک آواز رعد کی طرح کڑک اور لپک رہی تھی۔

سورج کی پہلی کرنوں میں جب فصیل کا معائنہ کیا گیا تو وہ کئی جگہوں سے کھدی پڑی تھی کوسل رائے اور قباچہ کے سرنگ دوز اپنا کام کر گئے تھے اور قلعہ کی مشرقی اور مغربی چوکیوں پر جب بہمنی سپاہی موت کے فرشتوں کا حساب چکا رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت سرنگ دوز باہر سے فصیل کو اُدھیڑنے میں مصروف تھے اور یہ کھوکھلی دیوار جس میں کئی جگہ بڑے بڑے رخنے پڑ گئے تھے اب شاید حصار کا کام نہیں دے سکتی تھی۔

"دیکھئے! بیجے نگر کے ناقابل شکست قلعہ کی دیواریں ٹوٹنے لگی ہیں۔"

دیورائے نے اپنا سر پیٹ لیا اور فصیل کے رخنوں کو دیکھ کر جنگلی سؤر کی طرح غرانے اور چلانے لگا پھر اسی روز فصیل کی مرمت شروع ہو گئی اور دیوار میں پیوند لگنے لگے۔

میدانِ کارزار

مہاراج دیورائے فیصلہ کن جنگ کا ارادہ لے کر قلعہ سے باہر نکل آیا۔

اس کے سوا اب چارہ بھی نہیں تھا۔ سلطان نے قلعہ پر شب خون مار کر اُسے سراسیمہ کر دیا تھا۔ چوہوں کی طرح دبک کر مرنے سے یہ بہتر تھا وہ میدانِ جنگ میں کسی بہادر کی تلوار کا زخم کھا کر پران تیاگ دے۔

راجکماری چندر کلا کے ایما پر مہاراج نے صلح پر آمادگی کا اظہار کیا تھا اور شب خون کے چوتھے روز جب ٹوٹی ہوئی فصیل کی مرمت کر لی گئی تھی۔ اس نے سلطان کی طرف اپنے سفیر بھیجے تھے۔ اس سفارت کا مقصد صرف بہمنی حکمران کے ارادوں سے آگاہی حاصل کرنا تھا۔ صلح کی پیش کش مبہم الفاظ میں کی گئی تھی جس کی طرف سلطان نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

کرناٹکی باردوت پریشان سا ہو گیا۔ اس نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے ہمراہی مہاماتروں کی طرف دیکھا پھر سلطان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "مہاراج! بیجے نگر وید پکشا کی دھرتی ہے اس کی تسخیر انسانوں کے بس کی بات نہیں......"

لیکن سلطان نے اس کا فقرہ بھی مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ خوفناک آواز میں دھاڑا۔

"واللہ! ہم بیجے نگر پر قبضہ کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے...... اگر مہاراج دیورائے صلح چاہتا ہے تو پابہ زنجیر ہمارے حضور میں چلا آئے۔ ہم سوچیں گے ہمیں اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ ورنہ تلوار خودبخود ہمارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔"

سفیر ناکام لوٹ گئے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے مہاراجہ کو سلطان کے فیصلہ سے آگاہ کیا اور وہ غصہ میں وحشی بیل کی مانند کراہنے لگا۔

"کرناٹک کا مہاراج اپنے پاؤں میں زنجیریں پہن کر مجرموں کی طرح اپنے دشمن کے سامنے پیش ہو......؟"

واہ کہیں فیروز شاہ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔

مہادشنو کی سوگند! اب وہ بیجے نگر کی فصیل کو بھی چھو نہ سکے گا۔ ہم اسی قلعہ کے دروازہ پر اُس کی لاش لٹکا دیں گے۔"

پھر اُس نے گجرات، خاندیس اور مالوہ کے راجوں کے نام مدد کے خط لکھوائے اور راجگورو پنڈت گورکھ ناتھ یہ سندیس لے کر بیجے نگر سے روانہ ہو گیا۔

دیورائے اس زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا جسے پنجرہ میں بند کر دیا گیا ہو پھر اس نے پنجرے کا دروازہ کھول دینے کا حکم دیا اور پوری قوت کے ساتھ اپنے خاص ہاتھی پہ سوار جھومتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے آگے اور پیچھے آہن پوش سواروں کے پرے کے پرے جمے تھے جن کی ہیبت سے دلوں پہ لرزہ طاری ہوتا تھا پیادہ فوج کی صفیں ڈیڑھ کوس تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بیجے نگر کی فصیل پر سینکڑوں پروہت گیروے کپڑے پہنے سنکھ پھونک رہے تھے۔ مندروں اور شوالوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بیجے نگر کی سلامتی کے لئے نیل کنٹھ اور گرڑ پر سواری کرنے والے وشنو سے پرارتھنا کی جا رہی تھی۔ قرنائیں پوری شدت سے چلا رہی تھیں اور فصیل سے باہر میدان میں مور و ملخ کی طرح سپاہیوں کے لشکر دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کرناٹک کی تمام فوجی طاقت اس وقت بیجے نگر میں سمٹ آئی ہے۔

سلطان نے اپنے لشکروں کا جائزہ لیا۔ پیادہ فوج اور سرنگ دوزوں کو ملا کر سپاہیوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی جن میں نصف سوار تھے۔ تین صد ہاتھیوں کا "سیاہ دستہ" اس کے علاوہ تھا لیکن دیورائے کم از کم ایک لاکھ لشکر جرار کے ہمراہ قلعہ سے باہر آیا

تھا اور اس کا خیال تھا آج وہ بہمنی حریف کا خاتمہ کر کے ہی لوٹے گا۔

سلطان نے لشکروں کو آراستہ کیا۔ میمنہ پر شہزادہ حسن اور میسرہ پر ارگو خاں کے سوار کھڑے کئے۔ قلب میں خود جم گیا۔ سلطان کا پرچم ہشیار عین الملک نے سنبھال رکھا تھا۔ بیدار نظام الملک بھی اُس کے قریب ہی تھا۔ اس نے حکم دیا تھا اگر عین الملک شہید ہو جائے تو بہمنی پرچم نظام الملک سنبھالے گا۔ علما جو اکثر عقبی دستوں میں لڑتے تھے۔ سلطان کی خاص اجازت پر لشکر قلب میں اس کے آس پاس ہی جمع ہو گئے تھے۔ آج کے معرکے میں وہ سلطان کے قریب ہی رہنا چاہتے تھے۔ کوسل رائے جو ہراول دستوں کی قیادت کرتا تھا۔ سلطان کے عقب میں صف آرا تھا لیکن قباچہ خاں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سلطان نے گزشتہ رات ہی اُسے دو ہزار سپاہیوں کے ہمراہ کسی مہم پر روانہ کر دیا تھا۔

کرناٹکی سپاہ کا میمنہ سیناپتی راج سنگھ کی قیادت میں تھا۔ مہاراج چتر رواں کے زیر سایہ ہاتھی پہ سوار خود قلب پر جما ہوا تھا۔ اس کا میسرہ بے نگر کے ظالم ترین جنگی سردار سنگرام نے سنبھال رکھا تھا جو رائے رایاں کے خاندان ہی کا ایک فرد اور رشتہ میں دیورائے کا چچا تھا۔ فوج کی قیادت مہاراجہ خود کر رہا تھا اور سابقہ تجربوں کے پیش نظر ایک ہزار ہاتھیوں کی فوج قلب کے آگے آراستہ کرنے کی بجائے میسرہ کے ایک رخ کھڑی کی گئی تھی اور اس کے پیچھے سواروں کے ایک دستہ کے علاوہ پیدل سپاہ کا ایک بھی آدمی نہیں تھا غالباً یہ احتیاط مدنظر رکھی گئی تھی کہ اگر ہاتھی مشتعل ہو کر بھاگیں تو اپنی ہی سپاہ کو کچلتے نہ چلے جائیں۔

بڑے بڑے جنگجو اور تجربہ کار سورما، آہن پوش راؤ، اور گیروی چادروں میں ملبوس مہاماتر مہاراجہ کے جنگی ہاتھی کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے یوں کھڑے تھے جیسے اس کے اشاروں پر تیروں کی مانند کمان سے نکل جائیں گے۔ دیورائے نے ہاتھی کے ہودے سے دونوں فوجوں کا جائزہ لیا اور اپنی سپاہ کی کثرت پر خوش ہوئے بغیر نہ رہ سکا اگرچہ اس وقت میدان میں ایک اور پانچ کا مقابلہ تھا لیکن وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ قلعہ کے اندر چار گناہ سپاہ موجود ہے جو اُس کے ایک اشارہ پر صف آرا ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی پوری فوج لے کر نکلتا اور عام حملہ شروع کر دیتا تو کچھ عجب نہ تھا اس کا ٹڈی دل بہمنی سپاہ کو اپنے گھوڑوں کے سموں ہی سے کچل کر رکھ دیتا مگر مہاراجہ جانتا تھا۔ سلطان کو فوج کی کثرت سے ہراساں

نہیں کیا جا سکتا۔ کیا دو مرتبہ پہلے وہ اس کا تجربہ نہیں کر چکا تھا۔

مہاماتروں کی ایک ٹولی فصیل پر سنکھ پھونکنے میں مصروف تھی۔ سنکھوں کی ڈراؤنی آوازوں نے فضا میں ایک عجیب سی دہشت طاری کر دی تھی اچانک کرناٹکی فوج سے ایک سوار گھوڑا دوڑا کر آگے بڑھا اور دونوں فوجوں کے درمیان پہنچ کر تلوار لہرانے لگا۔ یہ آہن پوش راؤ سیناپتی کی فوج سے نکل کر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے شمشیر خاں نے ولی عہد سے اجازت حاصل کی اور مقابلہ پر پہنچ گیا۔

راؤ نے اپنے داؤ سے شمشیر خاں کو ہراساں سا کر دیا وہ اپنا گھوڑا دور دور ہی رکھتا تھا۔ شمشیر خاں ایک جگہ کھڑا بڑے غور سے اس کے گھوڑے کی اچھل کود دیکھتا رہا پھر اس نے برچھے کی بجائے نیزہ سنبھالا اور اسے سیدھا کر کے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ دوسری ساعت راؤ کے لئے قیامت خیز ثابت ہوئی اور وہ خرخراتا ہوا گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ پھر شمشیر خاں کا گھوڑا جب پلٹ کر آیا تو اگلے سموں سے راؤ کا سر کچلنے لگا۔

دیورائے نے شمشیر خاں کو پہچان لیا تھا۔ وہ سانپ کی طرح لہرایا پھر اس کے اشارہ پر راج سنگھ خود اپنا گھوڑا اڑاتا ہوا سامنے آ گیا لیکن شمشیر خاں تو بھوکا بھیڑیا بن گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر سیناپتی کا بھی حساب چکا دینا چاہا۔ وہ گھوڑا بچا کر نکل گیا لیکن نیزے کی نوک اس کے خود میں چھید کر گئی تھی اور پیشانی سے خون کی ایک لکیر بھی پھوٹ نکلی تھی۔ وہ بدحواس سا ہو گیا اچانک شمشیر خاں نے نیزہ چھوڑ کر اپنا برچھا نکالا جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ مہاراج دیورائے کے چہرے پر زخم لگا چکا تھا۔ سنگھ مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کے قریب سے نکلا۔ اگر شمشیر خاں جھک نہ گیا ہوتا تو تلوار اس کی گردن کاٹ چکی ہوتی لیکن شمشیر خاں کو برافروختہ کر کے وہ خود بھی کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس نے بظاہر سنگھ کے پہلو میں برچھا مارا تھا لیکن جب ہاتھ اٹھا تو کرناٹکی سیناپتی کا چہرہ لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ شمشیر خاں نے برچھے کی نوک سے اس کے چہرے پر بھی لکیر کھینچ دی تھی اور دور...... ہاتھی پر بیٹھے ہوئے دیورائے نے دیکھ لیا تھا کہ شمشیر خاں نے سنگھ پر بھی اپنا مخصوص ہاتھ چلا دیا ہے۔

اچانک مہاراجہ نے ہاتھ کے اشارہ سے فوج کو عام حملہ کا اشارہ کیا۔ فوج کا میمنہ جو راج سنگھ کی سرکردگی میں تھا دیوانہ وار آگے بڑھا۔ ادھر شہزادہ حسن نے بھی حرکت کرنے میں دیر نہیں کی۔ تھوڑی ہی دیر میں راج سنگھ خون میں تر اپنے لشکر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

شمشیر خاں نے تعاقب نہیں کیا وہ گھوڑا موڑ کر اپنے دستہ میں واپس آ گیا۔

دونوں لشکر ٹکرائے اور ہتھیاروں کی کھٹا کھٹ شروع ہو گئی۔ اس ہنگامہ میں شمشیر خاں اپنے شکار کو ڈھونڈ رہا تھا لیکن سنگھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جھلایا ہوا وہ کرناٹکی سواروں کا صفایا کرنے لگا۔

پھر دونوں میسرے بھی ایک دوسرے سے ٹکرائے یہ دو خوفناک بھیڑیوں کا ٹکراؤ تھا ارگو خاں اور راؤ سنگرام۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ شہزادہ حسن نے کرناٹکی فوج کے قلب کو حرکت کرتے دیکھا لیکن سلطان بدستور اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ حیران ہوا دیورائے کو روکنے کے لئے سلطان اپنا لشکر آگے کیوں نہیں بڑھاتے؟

نجانے کیوں اس وقت شہزادہ حسن کے دل میں یہ خواہش کروٹیں بدلنے لگی کہ وہ دیورائے کے مقابلہ پر خود آگے بڑھے لیکن وہ نہایت خاموشی کے ساتھ حالات کو دیکھتا رہا جونہی مہاراجہ کا لشکر ڈیڑھ دو سو قدم کے فاصلہ پہ رہ گیا سلطان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے ساتھ بہمنی سواریوں جھپٹے جیسے زخمی شیر اپنی کچھاروں سے نکلتے ہیں۔ دیورائے اپنی فوج کی کثرت کے نشہ میں بہت آگے نکل آیا تھا اُسے اپنی حماقت کا احساس اُس وقت ہوا جب سلطان کے خاص اشارہ پر بہمنی لشکروں کے میمنہ اور میسرہ کی پچھلی صفیں دیورائے کے قلب کی طرف ٹوٹ پڑی تھیں۔ اب شہزادہ حسن بھی سلطان کے داؤ کو سمجھ گیا وہ اسی لئے کھڑا رہا تھا کہ دیورائے حملہ کے جوش میں اس خط تک آگے بڑھ آئے کہ بہمنی فوج کے میمنہ اور میسرہ کی آخری صفیں اُس کے عقب پہ آ جائیں اور اُسے با آسانی گھیر لیا جائے۔ وہ جانتا تھا جنگ کا فیصلہ قلب ہی میں ہو گا جسے دیورائے بہ نفس نفیس لڑا رہا تھا۔

شہزادہ حسن خاں نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر فولاد خاں سے مخاطب ہوا جس نے ابھی ابھی ایک کرناٹکی سوار کا پیٹ پھاڑ ڈالا تھا۔

"فولاد خاں! لشکر کو سنبھالنا۔"

"جانِ عالم......"

وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ حسن خاں کا گھوڑا اُسے لے کر ہوا ہو گیا تھا پھر فولاد خاں کی نگاہوں نے دل دہلا دینے والا نظارہ دیکھا۔ نجانے کس طرح شہزادہ حسن سواروں کو کاٹتا ہوا

کرناٹکی قلب میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور سوار بھی تھا جس کا برچھا بجلی کی طرح کوندر رہا تھا۔ فولاد خاں فوراً سمجھ گیا وہ شمشیر خاں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ شاید وہ دونوں کرناٹکی مہاراج کا پچھلا قرض بے باک کرنے جا رہے تھے۔

ایک ثانیہ کے لئے سیستانی بہادر کانپ اٹھا۔ اُس کے نزدیک ولی عہد کا یوں تنہا دشمن کی صفوں میں گھس جانا مناسب نہیں تھا لیکن وہ حسن خاں کو کس طرح سمجھاتا جوشِ انتقام میں دیوانہ ہو رہا تھا پھر ولی عہد کا دھیان چھوڑ کر فوراً ہی اُسے سامنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ راج سنگھ جس کے زرہ بکتر پر خون کے دھبے جم گئے تھے اپنے غضب آلود چہرے کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا آ رہا تھا شاید اُسے شمشیر خاں کی تلاش تھی۔ اپنے گھوڑے کی پشت ہی سے سلطان نے شہزادہ حسن اور شمشیر خاں کو کرناٹکی قلب میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ اس کے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہوئی۔ نظام الملک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

''اُدھر مہاراجہ دیورائے کے ہاتھی کی طرف بڑھو۔''

اور دونوں نے اپنے گھوڑے انسانوں کے سمندر میں ڈال دیئے۔''

شہزادہ دیورائے کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا اس نے ایک راؤ کو تلوار کی نوک سے نیچے دھکیل کر نیزہ سنبھال لیا۔ اچانک عقب سے آواز آئی۔

''جانِ عالم! یہ میرا شکار ہے۔''

لیکن حسن نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کا نیزہ کئی سروں کے اوپر سے سیماب کی لہر کی مانند سنسناتا ہوا تیرتا چلا گیا اور دیورائے کے شانے کے نیچے عین بغل میں کھب گیا۔ حسن خاں نے دیکھا اس کے نیزے کے ساتھ ایک اور نیزہ بھی تھا اور وہ مہاراجہ کی پسلیوں سے ٹکرایا تھا۔

پھر اس نے دیورائے کو لڑکھڑاتے ہوئے ہودج میں گرتے دیکھا اس کا ہاتھ جس میں ایک بھالا پکڑا ہوا تھا اوپر ہی اٹھا رہ گیا۔ نیزہ ہودج کے کناروں سے الجھتا ٹکراتا اور بل کھاتا ہوا نیچے آ گرا لیکن دوسرے ہی لمحے حسن خاں پر بیک وقت پندرہ بیس تلواریں لہرائیں۔ دیورائے کے آس پاس سوار راؤ اس پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے اُس نے نیزہ گھمانا شروع کر دیا اور تین چار تلواریں فضا میں اُڑتی نظر آئیں۔ شمشیر خاں اُس کے عقب ہی میں تھا لیکن وہ بھی بیک وقت کئی دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور ان دونوں کا اس

ہجوم سے بچ نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔

تلواروں کا رقص جاری ہو گیا۔

اچانک شہزادے نے ہودے سے دیوانے کے کراہنے کی نحیف سی آواز سنی لیکن وہ جانتا تھا کہ نیزوں کی ضرب جان لیوا نہیں تھی۔ اگر مہاراجہ گھوڑے پر سوار ہوتا تو بلاشبہ حسن خاں نے اس کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھا لیا ہوتا۔ اس کے سر پر کچھ ایسی ہی وحشت سوار تھی۔ وہ دیوانے کا لہو چاٹے بغیر لوٹنے والا نہیں تھا لیکن اب خود اُس کے گرد موت کا حلقہ قائم ہو چکا تھا اور وہ اُس دائرے میں ایک ناؤ کی طرح پھنس کے رہ گیا تھا جس کے چاروں طرف طوفان کی وحشی موجیں اژدھوں کی مثل پھنکار رہی تھیں۔

اس نے سوچا جب تک دیوانے کا ہاتھی جما رہے گا۔ وہ موت کے منہ سے نہیں نکل سکتا پھر اس نے باگ موڑی اور لہراتی بجلیوں میں ہاتھی کی طرف پلٹا۔

اُس کے بازوؤں میں کئی زخم آ چکے تھے جن سے لہو رس رس کر ٹپکنے لگا تھا۔ ممکن ہے شمشیر خاں کی حالت زیادہ ابتر ہو۔ جب وہ وہاں سے ہٹا تھا اس وقت شمشیر خاں دیوانہ وار برچھا چلا رہا تھا۔ ممکن ہے مرنے سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ دشمنوں کو ہلاک کر دینا چاہتا ہو لیکن حسن خاں دیوانے کے ہاتھی تک نہ پہنچ سکا۔ سینکڑوں برقپاش تلواروں نے اس کا رستہ روک لیا تھا۔

وہ یوں کب تک لڑتا اور بچتا رہے گا۔ نیزہ مارنے میں بمشکل ہی اُس کا کوئی حریف ہو سکتا تھا۔ یہ فن اسے امیر فضل اللہ انجو نے سکھایا تھا مگر ہزاروں دشمنوں کے نرغے میں صرف دو آدمی خواہ وہ کتنے ہی بہادر اور فنونِ جنگ کے ماہر ہوں آخر کر ہی کیا سکتے تھے۔ شہزادہ حسن نے سوچا تھا وہ آگے بڑھ کر دیوانے کے ہاتھی پر حملہ کرے اور اُس کے پچھلے پاؤں نیزے کی نوک سے زخمی کر کے اُسے کسی بھی سمت بھگا دے۔ جب مہاراجہ کا ہاتھی بھاگ نکلے گا تو کرناٹکی فوج کے پاؤں بھی اکھڑ جائیں گے۔ یہاں سے بچ نکلنے کی بس یہی ایک تدبیر ہو سکتی تھی مگر وہ ہاتھی تک پہنچ ہی نہیں پایا تھا۔

ناگہاں ایک بھالا سروں پر تیرتا ہوا آیا اور حسن خاں کے پہلو میں آ کھبا۔ اُس نے گھوڑے پر ایک جھرجھری سی لی پھر نیزہ کھینچ کر ایک راؤ کے حلق میں دے مارا۔ میدان میں ہاؤ ہو اور چیخوں کا اتنا شور تھا کہ راؤ کی چیخ اس میں گھل مل کر رہ گئی وہ ایک گھائل چیل کی

لرج پھڑ پھڑاتا ہوا گھوڑے کی پیٹھ سے لڑھک گیا اور اس کا مشتعل گھوڑا تنگ سے دائرہ میں ہنہناتا ہوا چکر کاٹنے لگا۔ حسن خاں کے پہلو سے خون کا فوارا ابل پڑا تھا۔ سینہ بند کی دو کڑیاں بھی ٹوٹ کر بدن میں کھب گئی تھیں لیکن اب اتنی مہلت ہی کہاں تھی کہ وہ زخم باندھ ہی سکتا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر اب وہ لڑکھڑاتے سا لگا تھا۔

بیجے نگر کے میدان میں اس وقت موت کے فرشتے بڑی سرعت کے ساتھ انسانی روحیں قبض کر رہے تھے۔ چاروں طرف انسانوں کا طوفان لہریں مار رہا تھا اور طوفان کی اُبھرتی، ڈوبتی اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی لہروں میں تلواریں یوں چمک رہی تھیں جیسے سیماب کے دھارے پھوٹ رہے ہوں۔

انسان انسانوں سے گتھم گتھا تھے۔

موت کی خرخراہٹیں، زخمیوں کی چیخیں، تلواروں کی کھٹا کھٹ اور تیروں کی سنسناتی اڑانیں بس یوں لگتا تھا۔ صور محشر پھونک دیا گیا ہو۔ ڈرے ہوئے بے سوار گھوڑے پاگل کتوں کی مانند اِدھر سے اُدھر دوڑتے اور ہنہناتے پھرتے تھے۔ ان کے سموں تلے بے شمار زخمی کچلے جا چکے تھے۔

پورے کرناٹک کی تاریخ میں اتنی خوفناک جنگ اس سے پیشتر شاید لڑی ہی نہیں گئی تھی۔ دونوں فوجیں صبح ہی صبح صف بستہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت سورج سروں کے اوپر چمک رہا تھا۔ لڑتے لڑتے دوپہر آ گئی تھی اور اب تک کئی ہزار انسان زندہ انسانوں کی فہرست سے خارج ہو چکے تھے۔ آسیائے مرگ نہایت تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔

کرناٹکی فوج کا قلب چاروں طرف سے گھر چکا تھا اور لڑائی کا زور بھی اسی حصہ میں تھا۔

راؤ سنگرام نے دیکھ لیا تھا۔ بہمنی سواروں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مہاراجہ کے لشکر کو گھیر لیا تھا۔ اگرچہ چھ سات ہزار سواروں کا چالیس ہزار سپاہیوں کے گرد حلقہ ڈال لینا ایک مضحکہ خیز سی بات تھی پھر بھی وہ اپنی فوج کے قلب کے گرد یہ گھیرا توڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بہادروں کو قلب کی طرف بڑھنے کا حکم دیا لیکن ارگو خاں ایسے خونی بھیڑیے کو رستے سے ہٹا دینا آسان کام نہیں تھا۔

شہزادہ حسن کی حالت نازک ہو گئی تھی کیونکہ سلطان کی چیختی ہوئی آواز میں خطرے کی

تھرتھراہٹ چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے عین الملک اور نظام الملک کو جلد از جلد مہاراجہ دیورائے کے قریب پہنچنے کا حکم دیا تھا مگر کرناٹکی سورمے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنتے جا رہے تھے۔

اچانک سلطان کی نگاہوں نے ایک زہر گداز اور لرزہ خیز منظر دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا پھر سپاہیوں میں پہلی مرتبہ بہمنی حکمران کے ہونٹوں سے ایک روح فرسا چیخ نکلتے سنی۔

بے شمار آنکھیں سامنے کی طرف اُٹھ گئیں اور دکنی سپاہیوں کے جسم کانپ اٹھے۔ شہزادہ حسن جو لہو میں بھیگا ہوا تھا۔ مہاراجہ دیورائے کے جنگی ہاتھی کی سونڈ میں جکڑا فضا میں بلند ہو رہا تھا شاید کرناٹکی سواروں نے اس کا جسم تک چھلنی کر دیا تھا۔

سلطان نے بوکھلا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو شہزادہ حسن کے ایک بازو نے تیزی سے جنبش کی۔ سلطان چیخ اٹھا۔

"ابھی وہ زندہ ہے۔"

اچانک سرخ رنگ کا ایک تیر ان کے سروں کے اوپر سے سنسناتا ہوا گزر گیا اور سیدھا ہاتھی کی آنکھ میں جا پیوست ہوا۔ ایک قیامت آفریں چنگھاڑ سے سارا میدان دہل اٹھا۔ دیورائے کے ہاتھی نے بڑے زور سے جھرجھری لی۔ شہزادہ اس کی سونڈ کی گرفت سے نکل کر زمین پر آ رہا۔ ہاتھی پوری وحشت کے ساتھ چنگھاڑتا ہوا اپنے آس پاس پھیلے ہوئے کرناٹکی سواروں پر حملہ آور ہوا۔ مہابت کے آنکس بھی اس کو قابو نہ کر سکے۔ سوار سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگے پھر مشتعل ہاتھی اپنے ہی لشکر کی طرف پلٹ پڑا اور بے تحاشہ بھاگتا چلا گیا۔

اسی دوران میں شہزادہ حسن پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا لیکن اب شاید وہ لڑنے اور تلوار چلانے کے قابل نہیں تھا اس کے بدن سے کم و بیش دو پیالے خون بہہ چکا تھا۔ ہاتھی کے مشتعل ہو جانے کی وجہ سے کرناٹکی سواروں کے پرے چھٹ گئے تھے۔ بھاگتے ہوئے ہاتھی پر مہاراجہ سنبھالا لے کر خود کھڑا ہوا اس نے سپاہ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا لیکن اس کے جسم کو لہولہان اور ہاتھی کو واپس قلعہ کی طرف بھاگتے دیکھ کر سپاہیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور سب بھاگ نکلے شاید وہ اس کے اشارہ کو واپسی کا حکم سمجھے تھے۔

اب بہمنی سوار بھاگتے ہوئے سپاہیوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ قلعہ کا دروازہ کھول دیا

گیا مگر جونہی شکست خوردہ فوج پہاڑی گھاٹیوں کا دامن عبور کرنے لگی۔ قباچہ خاں کے دو ہزار سپاہی جو چٹانوں میں ڈبکے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑے۔ کرناٹکی سپاہی حیران وششدر تھے۔ موت کے یہ فرشتے اچانک کہاں سے نکل آئے۔ وہ آتشی تیر کھا کھا کر گرنے لگے اور گھوڑوں کی پشتیں جلد جلد خالی ہونے لگیں۔

سلطان اس کامیابی کو ایک معجزہ ہی سمجھتا تھا۔ صرف ایک تیر نے میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ سرخ رنگ کا تیر وہ سوچنے لگا۔ بہمنی تیر اندازوں کے تیر تو سیاہ ہوتے ہیں پھر یہ سرخ تیر کس نے چلایا تھا؟ اس نے نظام الملک کو حکم دیا وہ تیر انداز کو تلاش کرے اور خود عین الملک کے ہمراہ ولی عہد کی طرف بڑھا جو بھاگتے ہوئے سپاہیوں پر جھلایا ہوا سا جھپٹ رہا تھا لیکن گھوڑے کی پیٹھ پر بھی بمشکل ہی بیٹھا تھا اس کا سارا جسم لہو سے سرخ ہو رہا تھا اور نقاہت سے بار بار جھول جاتا تھا البتہ چہرے پر وحشت اور ہاتھ میں تلوار ابھی تک موجود تھی شاید یہ بہمنی خون ہی تھا جس نے اس حالت میں بھی تلوار کے قبضہ پہ اس کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی تھی۔ سلطان نے لپک کر اُسے سنبھالا اور خود اس کے گھوڑے پہ سوار ہو گیا۔

باپ کو دیکھ کر شہزادہ حسن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی پھر اُن ہونٹوں کو ہولے ہولے جنبش ہوئی۔

”ظلِ سبحانی! شمشیر...... خاں......“

اُس نے ہاتھ سے لاشوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ شمشیر خاں زخمی ہو کر انہی لاشوں میں دب کے رہ گیا تھا جنہیں حسن خاں کی تلوار نے مار گرایا تھا۔ عین الملک گھوڑے سے کود پڑا۔ شمشیر خاں کی نبض چل رہی تھی لیکن بیہوش تھا۔

دیورائے ایک ذلت آمیز شکست اٹھا کر پھر قلعہ بند ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ شمشیر خاں کے علاوہ اُس نے شہزادہ حسن کے نیزے کا زخم بھی کھایا تھا اُس کے بیس ہزار سپاہیوں نے اپنے خون سے اُس کی شکست کی تحریر لکھی تھی جن کی لاشیں چاروں طرف مٹی کے تودوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔

دس ہزار کے قریب گرفتار ہوئے تھے جنہیں قباچہ خاں نے لشکرگاہ کی طرف ہانک دیا تھا ان میں زخمی بھی تھے۔

سلطان جب شہزادہ حسن خاں کو لئے اپنی بارگاہ کے دروازے پر پہنچا تو نظام الملک ایک نوجوان کے ہمراہ اس کا منتظر تھا۔ جس کے کندھے پر لٹکتے ہوئے ترکش میں سرخ رنگ کے تیر دیکھ کر سلطان چونک اٹھا پھر اس نے نوجوان کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو دم بخود رہ گیا۔ شدتِ حیرت سے اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

"پر......تھا......ل......"

نوجوان کے بھیس میں مدگل کی جادوگر مغنیہ پرتھال اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر کورنش ادا کی۔ سلطان نے پوچھا۔

"لیکن تم بیجے نگر کب آئیں؟"

"کنیز آج ہی پہنچی ہے سلطانِ عالی!"

"تمہارے اس طرح آنے کا مقصد؟"

"ظلِ سبحانی! کل رات آپ کی بیٹی نے ایک بھیانک سپنا دیکھا تھا۔ بس وہی مجھے یہاں کھینچ لایا۔"

پھر پرتھال نے بتایا اُس نے خواب میں جانِ عالم کو ایک بھیانک اور خطرناک دیو کے منہ میں دیکھا تھا۔ جس نے اپنے لمبے لمبے دانت شہزادہ کے جسم میں گاڑھ دیئے تھے۔ یہ وحشت ناک سپنا دیکھ کر وہ ایک چیخ مار کر جاگ اٹھی اور محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ انہیں خیال آیا شاید بانو پر پھر کسی نے کالا ناگ چھوڑا ہے۔ وہ اُسی وقت بیگم جہاں کے حضور پہنچی اور اپنا بھیانک سپنا علیہ خانم کے گوش گزار کیا اگرچہ وہ خود بھی فکر مند ہو گئی تھیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ یہ خواب صرف وہمہ کا نتیجہ ہے۔ اُسے اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جانا چاہیے۔ مگر یہ ہیبت ناک سپنا دیکھ لینے کے بعد فیروز آباد اُس کی نظروں میں تاریک ہو گیا۔ سارے دکن پر اندھیرے اپنے منحوس پروں کو پھیلائے بھوتوں کی طرح ناچتے ہوئے دکھائی دیئے اور نیند نے اُس کی آنکھوں سے ناطہ توڑ لیا۔ ابھی فیروز آباد میں صبح کی اذان گونجی تھی کہ اُس نے اصطبل سے ایک تیز رفتار گھوڑا منگوایا اور جنگ کے خیال سے اپنی حفاظت کے لئے تیر کمان لے کر بیجے نگر کی طرف بھاگی۔ یہاں پہنچ کر اُسے وہ تیر جانِ عالم ہی کی حفاظت کے لئے چلانا پڑا۔

سلطان، شہزادہ حسن اور دوسرے لوگ اس کی داستان سن کر مجسمۂ حیرت بن گئے۔

''لیکن تمہیں تیر اندازی کس نے سکھائی تھی؟''

''میرے گورو دیو نے سلطانِ معظم! وہ موسیقی کے ساتھ مجھے تیر اندازی بھی سکھایا کرتے تھے ان کا خیال تھا مجھے اپنی زندگی میں عجیب و غریب واقعات سے دو چار ہونا پڑے گا اس لئے مجھے شہسواری اور تیر اندازی کی تربیت بھی دیتے رہے۔''

ان دونوں خوبیوں پر سلطان نے اُسے تحسین و آفریں کہی۔ پرتھال کو دیکھ کر ولی عہد کو بھی چند لمحوں کے لئے اپنے زخم بھول گئے۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کی زندگی اُس کی ''جانِ زندگی'' ہی نے بچائی ہے تو اس کے خون آلود چہرے پر شکر مندی کے آثار پیدا ہوئے مگر جانِ عالم کو اس حال میں دیکھ کر پرتھال کے دل پر کیا گزر رہی تھی؟

وہ خود التجا کرنے والی تھی کہ ظلِ سبحانی! باتیں پھر ہو لیں گی۔ پہلے جانِ عالم کے زخم تو باندھ لیجیے میں جانتی ہوں وہ دیورائے سے میری ہی توہین کا بدلہ چکانے کے لئے موت کے منہ میں جا کودے تھے لیکن بھگوان کے لئے مجھے سنبھالئے۔ جانِ عالم کو اس حال میں دیکھ کر میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے مگر ناگہاں سلطان کی آواز گونجی۔

''عین الملک! زخمیوں کو خیمے میں لے چلو۔ جانِ عالم کے بدن سے خون بہت نکل چکا ہے اور نظام الملک! تم حکیم کازونی کو لے کر فوراً ہماری بارگاہ میں آؤ۔''

پھر وہ پرتھال کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے خیمے میں داخل ہوا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے یوں چل رہی تھی جیسے اب بھی کوئی سپنا ہی دیکھ رہی ہو۔

شہزادہ حسن کی تیمارداری پرتھال ہی کے سپرد کر دی گئی اور حسن خاں کے زخم پھولوں کی طرح مسکرا اُٹھے۔

فتح کی خبریں

بدبخت دیورائے کا ستارہ بوڑھے اُلو کی طرح گردش میں آ چکا تھا جو جھاڑیوں میں ڈ‌ُبکے رہنے کے باوجود ہر وقت موت کے سرد پاؤں کی دھمک پر کان لگائے رکھتا ہے۔ سپاہ کی کثرت و اژدہام نے بھی اس کی بگڑی ہوئی تقدیر کو سہارا نہیں دیا تھا۔ وہ ایک لاکھ کا لشکرِ جرار لے کر اس ارادے سے نکلا تھا کہ بہمنی حکمران کو گرفتار کر کے بیجے نگر میں داخل ہو

گا پھر اس کی لاش قلعہ کے دروازے پر لٹکا دی جائے گی لیکن اس وقت وہ خود بستر پر پڑا زخموں سے کراہ رہا تھا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں اُس کی آنکھوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے نیلے، پیلے اور سرخ ستارے سے ناچتے، ٹوٹتے اور بھنور کی تیز لہروں پہ چکراتے ڈوبتے ہی چلے جا رہے تھے۔

بیجے نگر..... کرناٹک کا عظیم شہر، ویرو پکشا کا دیس ماتم کی صداؤں سے گونج اٹھا تھا۔ بیس ہزار سورمے خاک و خون میں لتھڑے مہاراج دیورائے کے تصور میں بھوت بن کر رقص کر رہے تھے اور ان کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں اپنے بال نوچنے اور سینہ پیٹنے میں مصروف تھیں ان کی جگر گداز چیخیں راج رنواس کی دیواروں سے ٹکراتی دیورائے کے سینے میں اترتی جا رہی تھیں اور اس کا دماغ جہنم کی بھٹیوں کی مانند دہکنے لگا تھا۔

اُف دیورائے کی تقدیر نے کیسا چرکا کھایا تھا۔ بہمنی نیزے اس کی قوت کے سینے میں ترازو ہو چکے تھے اور بیجے نگر کے در و دیوار خاموشی کی زبان سے رائے رایاں کے عبرت ناک زوال پہ گریاں کناں تھے۔

سلطان فیروز شاہ بہمنی سکندر ثانی کے بخت و اقبال کا ستارہ بیجے نگر کی بلندیوں پر چمک رہا تھا اور سورما مہابیر اُس کا نام سن کر کچی شاخوں کی مانند کانپنے لگے تھے۔

کرناٹک کے شہروں سے دل خراش خبریں آ رہی تھیں۔ بہمنی امیر الامرا احمد خاں خانخاناں جنوب کی طرف قلعوں کو روندتا اور اُن پر سیاہ پرچم اڑاتا کرناٹک کے اندر گھستا جا رہا تھا اور کرناٹکی سرداروں کے سر سلطان کی خدمت میں چلے آ رہے تھے جو بیجے نگر کے میدان میں شمشیر بکف ابھی تک زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ شہزادہ حسن کے مہلک زخموں نے اُسے غیظ و غضب کا پیکر بنا دیا تھا اور اُس نے قسم کھائی تھی وہ مہاراج دیورائے کو خون میں غسل دیئے بغیر نہیں لوٹے گا۔ بہمنی ولی عہد کے لہو کی ایک ایک بوند کا حساب چکایا جائے گا جو بیجے نگر کی مٹی میں جذب ہوا تھا۔

شہزادہ حسن کے زخم مندمل ہو رہے تھے اور پرتھال آنکھوں پہر اُس کی تیمار داری کرتی تھی خود سلطان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ پرتھال ساری ساری رات اپنی آنکھوں ہی میں کاٹ دیتی اور ہر لمحے اس کے آرام کا دھیان رکھتی تھی۔ اس نے جانِ عالم کی صحت کے لئے رو رو کر اپنے بھگوان سے

پرارتھنا بھی کی تھی۔ وہ ہر روز اس کی آرتی اتارتی اور اپنی پوجا کے پھول اس کے چرنوں پہ بھینٹ کرتی تھی۔ محبت اور پیار کا یہ انداز کتنا مقدس اور روح نواز تھا۔ یہ پیار تو مردوں کی بھی مسیحائی کرتا ہے۔ اس کا اعجاز ویرانوں میں پھول کھلاتا اور پہاڑوں کے جگر گداز کر سکتا ہے پھر شہزادہ حسن کے زخم کیوں مندمل نہ ہو جاتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ چلنے پھرنے لگا اور سلطان نے محسوس کیا یہ سب پیار کی مسیحائی ہے محبت کا کرشمہ اور پرتھال کی دعاؤں اور تیمارداری کا اعجاز ہے میدان سے لوٹتے ہی حسن کی نبضیں ڈوبتی جا رہی تھیں اور حکیم کازونی کے چہرے پر زردیاں سی تھرتھرانے لگی تھیں جیسے اُس نے بہت دور...... کہیں موت کی آواز سن لی ہو۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر سلطان کا دل بھی کانپ اٹھا تھا اور بہمنی امرایوں چپ تھے۔ جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ خیمے میں پہنچتے ہی ولی عہد پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی اور اپنی قوتِ ارادی کی سخت جدوجہد کے باوجود وہ اُس غشی کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ جس نے بہمنی خیموں پر موت کی سی افسردگی طاری کر دی۔

حکیم کازونی کے چہرے کی پریشانی سب نے دیکھ لی تھی۔ سچ مچ موت کا قافلہ اپنی نادیدہ منزلوں سے روانہ ہو چکا تھا اور اس کے پاؤں کی دھمک سے بہمنی سرداروں کے دل کانپ اٹھے تھے لیکن یہ صرف پرتھال تھی جس نے اپنی محبت کو اس بے کسی کے ساتھ موت کے سرد ہاتھوں لٹ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھار دیکھ کر خود سلطان کا دل بھی دو نیم ہو گیا تھا۔

کیا اُس کا فرزند...... بہمنی تاج و تخت کا وارث پردیس میں لٹ جائے گا؟

یہ خیال کس قدر اندوہناک اور کرب آمیز تھا۔ سلطان نے کپکپا کر اپنے چہرہ کو ڈھانپ لیا اور تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا پھر دوسرے سردار بھی ہٹ آئے تھے اور پرتھال صرف پرتھال اپنے محبوب کو ایک مرتبہ پھر موت کے ہاتھوں سے چھین لائی تھی۔ اس نے ولی عہد کے چرنوں میں بیٹھ کر کس رقت کے ساتھ ایشور سے پرارتھنا کی تھی۔ شہزادہ کے پاؤں اس کے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے اور چند ہی لمحوں کے بعد موت کا کارواں پھر اپنی منزل کی طرف لوٹ گیا تھا اس کی پُراسرار گھنٹیوں کی مدھم سی آواز پرتھال کی سسکیوں میں ڈوب گئی اور دوسرے کمرے میں جب سلطان اپنے سرداروں کے ساتھ افسردہ و غمگین کھڑا اپنے دل کو بیٹے کی موت کی خبر سننے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس نے

پرتھال کی مسرت افزا چیخ سی تھی۔ "جانِ عالم......"

وہ لپک کر شہزادہ کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اُس کی روح خدا کے حضور سربسجود ہو گئی تھی کہ شہزادہ حسن موت کا مسافر پرتھال کے ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

"نہیں..... میں تمہیں اس طرح بے سہارا چھوڑ کر مر بھی نہیں سکتا۔ میں نے تمہیں جو قول دیا تھا پورا ہوگا۔ تم سلطان کی بہو بنو گی۔ دکن کی مہارانی۔"

اور پرتھال نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جانِ عالم! مجھے صرف آپ کی زندگی چاہیے۔ تخت و تاج نہیں میں تو صرف پیار کی بھوکی ہوں۔ آپ کے چرنوں کی دھول۔"

محبت کا یہ عجیب اور دلگداز منظر دیکھ کر سلطان کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں آگے بڑھ کر اُس نے پرتھال کے سر پہ اپنا ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"نہیں باتو! تم کسی کے چرنوں کی دھول نہیں۔ تم ایک پوتر دیوی ہو، سچائی کی روح، ہم تمہیں ولی عہد کے ساتھ دکن کے تخت پر بیٹھنے کی اجازت دیں گے۔"

پھر سلطان مسرت سے جھومتا اور مسکراتا ہوا خیمے سے نکل گیا تھا اور ایک ہی ثانیے کے بعد اُن دونوں نے لشکر گاہ سے ایک غلغلہ انداز نعرے کی آواز سنی تھی۔ ساری فضا لرز اٹھی تھی اور قرنا کی آواز نے انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ سمجھے شاید سلطان نے لشکریوں کو ولی عہد کی صحت کا مژدہ سنایا ہے لیکن انہیں فوراً ہی معلوم ہو گیا۔ امیر فضل اللہ انجو شیرازی نے ٹیکا پور کا قلعہ فتح کر لیا تھا اور قلعہ کے راؤ کے ہمراہ قیدیوں کا ایک قافلہ بھی روانہ کیا تھا۔ شہزادہ حسن کی زندگی کا مژدہ اور ٹیکا پور کی فتح کی خوشخبری فوج نے ایک ساتھ سنی تھی اور جوشِ مسرت میں ان کے نعرے اب بیجے نگر کی فضاؤں کو لرزا رہے تھے۔

سلطان بے حد مسرور تھا۔ اُس کے لشکروں نے کرناٹک کو روند ڈالا تھا۔ بیجے نگر اور ادونی کو چھوڑ کر تمام قلعے سر ہو گئے تھے۔ مہاراج دیورائے کی روحِ مدافعت زخمی ہو چکی تھی اور اب سلطان اُس پر اپنا حکم نافذ کیے بغیر نہ رہے گا۔

اس نے ٹیکا پور سے آنے والے غلاموں اور کنیزوں کو قیدیوں کے خیموں میں بھیجنے کا حکم دیا اور خود اپنی بارگاہ میں پہنچ کر امیر فضل اللہ اور خانخاناں کو پیغام لکھوانے لگا۔ مفتوحہ قلعوں پر عامل مقرر کرنے کے بعد اُس نے دونوں سرداروں کو بیجے نگر لوٹ آنے کے

احکام صادر کیے تھے۔ اب وہ دیورائے سے نپٹنا چاہتا تھا۔

بہمنی لشکر گاہ میں ابھی تک نعرے گونج رہے تھے اور بیجے نگر کی فصیل پر ہزاروں کرناٹکی سپاہی کھڑے حیران و ششدر تھے۔ یہ نعرے کس خوشی میں بلند ہو رہے ہیں۔ کیا بہمنی فوج کو کہیں سے ناگہانی کمک پہنچ گئی ہے؟

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد یہ خبر بیجے نگر کے ہر کوچہ و بازار میں گونج رہی تھی کہ کرناٹک کے قلعے پامال ہو گئے۔ دیورائے کی تقدیر ہر جگہ ہار گئی۔ رائے رایاں کا درخشاں ستارہ اپنے افق سے ٹوٹ چکا اور ابھی ابھی بنکاپور فتح ہونے کی خبر آئی ہے۔ ان خبروں نے بیجے نگر پر موت کی سی افسردگی طاری کر دی اور لوگ راج رنواس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے اُس کے دروازہ پر اڑتا ہوا زرد پھیرا اُن کا تمسخر اڑا رہا تھا۔

اب مہاراج کیا فیصلہ کریں گے۔ اُس کی ہوس ہزاروں بہادروں کو موت کے اندھیروں میں جھونک چکی ہے۔ ہزاروں گھر اُجڑ چکے ہیں۔ کیا ابھی کوئی اور تماشا باقی ہے؟

مسہری پہ دراز مہاراجہ دیورائے بظاہر اپنے زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا لیکن کرناٹک کے قلعوں کی تسخیر اور بنکاپور کے سقوط کی المناک خبریں دراصل اس کے سینہ کو چھریوں کی طرح کاٹ رہی تھیں اور وہ شدتِ غم میں بار بار صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ کیا اُس کے انجام کی ساعت آ پہنچی ہے؟

اُس کے اشارے پر حسین زنگی نے شراب کا چوتھا پیالہ اُس کی طرف بڑھایا......

ہارے ہوئے سپاہی اور لٹے ہوئے جواری کا آخری سہارا دارو کا پیالہ ہی تو ہوتا ہے جس میں وہ اپنے غموں کو دکھوں کو گھول کر پی جاتا ہے نشے کا سرور اُسے تخیل کی اُن وادیوں کی طرف لے اڑتا ہے۔ جہاں راحت ہی راحت...... سکون ہی سکون ہے لیکن چوتھا پیالہ پی جانے کے باوجود دیورائے نے ابھی نشے کی اولین ترنگ بھی محسوس نہیں کی تھی۔ غم پہاڑوں کا بوجھ بن کر اُس کے سینہ پہ آ گرے تھے اور نشہ کی لہریں ان پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔

اچانک اُس نے قدموں کی چاپ سنی۔ راج وید کے علاوہ جو اُس کے زخموں کا علاج کر رہا تھا اور کسی کو اُس کے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ شکست کے صدمہ اور کرناٹک کے قلعوں کی تسخیر کے غم میں بجز شراب اور کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا پھر یہ

کس کے قدموں کی چاپ تھی کون آ رہا تھا؟

اُس نے گردن پھیر کر دیکھا راجکماری چندر کلا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"پتا جی! ابھی ابھی میں نے ایک منحوس خبر سنی ہے۔ کیا یہ سچ ہے ٹپکا پور بھی ہاتھ سے جاتا رہا؟"

"ہاں چندر کلا! تمہارے باپ کی تقدیر ہار گئی۔" دیورائے کے لہجہ میں غم کے سانپ لہرا رہے تھے۔

یہ خبر سن کر شاید چندر کلا کا دل بھی بیٹھنے لگا تھا اُس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا۔

"تو اب کیا ہوگا۔ بجے نگر کا کیا ہوگا؟"

"ہم نے جنگ ہاری ہے ہمت نہیں ہاری۔ سلطان ہماری لاش پر سے گزر کر ہی بجے نگر میں داخل ہو سکتا ہے۔"

"تو کیا آپ ابھی تک مقابلہ کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"مقابلہ تو زندگی کے آخری سانس تک ہوگا۔ ہم موت کی چوکھٹ پر دم توڑ دیں گے یا سلطان...... بہر حال دونوں میں سے ایک کی موت ضروری ہے۔"

"نہیں پتا جی! آپ دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں مرنا چاہیے۔ شاید سلطان صلح پر تیار ہو جائے۔"

"چندر کلا......"

دیورائے ایک بھیڑیے کی طرح غرایا اور چندر کلا اُسے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"کیا تم یہ چاہتی ہو تمہارا باپ ایک قیدی کی طرح زنجیریں پہن کر فیروز شاہ کے حضور صرف اپنی موت کا فیصلہ سننے جائے؟"

"نہیں...... نہیں میں اس ذلت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر صلح ناممکن ہے۔ سلطان اپنی شرط پہ قائم ہے اور دوسری صورت میں صرف تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔"

پھر اچانک وہ نرم لہجہ میں بولا۔

"لیکن تم پریشان کیوں ہو۔ راجگورو کوئی دن میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ گجرات، خاندیس اور مالوہ کے راجے ضرور ہماری مدد کو آئیں گے اور فیروز شاہ خود زنجیروں میں جکڑا ہوا ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا...... تم اپنے ذہن کو ان بکھیڑوں میں نہ الجھاؤ۔ جا کر آرام کرو۔ کرناٹک کے مہاراج مٹی کے پتلے نہیں۔ اُن کا دل لوہے سے بنا ہے اور ارادہ پہاڑوں کی طرح اٹل ہے۔ بس اب جاؤ ورنہ تمہاری پریشان سی صورت ہمیں بھی پریشان کر دے گی۔ ہمیں سوچنے دو۔ جنگ شطرنج کی چالوں کی مانند اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے۔"

نجانے چندر کلا کیا کیا باتیں کرنے آئی تھی۔ شاید مایوسی کے گھمبیر اندھیروں میں اُس نے روشنی کی کوئی کرن لرزتی دیکھ لی تھی اور وہ مہاراج کو بھی وہی روشنی دکھانا چاہتی تھی لیکن وہ تو تنہائی اور شراب کے سوا اور کچھ نہ چاہتا تھا۔

چندر کلا تھکے تھکے سے قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ اُس کا ذہن دھوئیں کی لہر بن کر اُڑ جانا چاہتا تھا۔ اس کے جاتے ہی دیورائے نے دارو کا پانچواں پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور اس کا دماغ طوفانی اندھیروں میں اُترتا چلا گیا۔

جشنِ فتح

راجگورو کی سفارت ناکام و نامراد لوٹ آئی اور دیورائے کے سینہ پر ایک نیا کوہ غم الٹ پڑا۔ پڑوسی راجوں میں سے کسی نے بھی بہمنی حکمران کے خلاف تلوار اٹھانے کی جرأت نہیں کی بلکہ انہوں نے سلطان کی خدمت میں دوستی کے نذرانے ارسال کیے۔

یقیناً یہ تیمور اعظم کے اُس نامۂ مملکت کا اعجاز تھا جو اُس نے قیام ہند کے دوران سلطان فیروز شاہ کو بھیجا اور اُسے جنوبی ہند کا بااختیار بادشاہ تسلیم کیا تھا۔ اُس سے بغاوت اور سرکشی کا مطلب ایشیا کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے روند ڈالنے والے عظیم فاتح تیمور صاحب قران کے حکم کی نافرمانی تھی لیکن تیمور اُن سے دور بہت دور اس وقت ایشیائے کوچک کے اُس پار منگولیا کے صحراؤں کو عبور کر رہا تھا اور فیروز شاہ کی تلوار اُن سے دور نہ تھی۔ کیا اُس کی کھینچی ہوئی تلوار انہیں معاف کر دے گی؟

پھر وہ ایک فاتح سلطان سے دشمنی کیوں مول لیتے؟

دیورائے کے ستارے گردش میں آ گئے۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ راجگورو سے

سفارت کی ناکامی کے حالات سنے اور دل شکن آواز میں بولا۔

"تو کوئی بھی ہمیں سہارا دینے پر تیار نہیں۔ کسی نے بھی دکھ کے سمے ہماری دوستی کا ہاتھ نہیں تھاما۔"

"وہ فیروز شاہ سے ڈرتے ہیں مہاراج!"

"تو پھر فیصلہ اب تقدیر پر رہا..... ہم دیکھیں گے وہ ہمیں اور کیا کیا دکھاتی ہے۔ کرناٹک کے قلعے بہمنی سواروں نے پامال کر دیئے۔ بیجا نگر محاصرے میں ہے۔ پڑوسی راجاؤں نے دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس وقت انسانوں کے جنگل میں ہم یکا وتنہا کھڑے ہیں۔

راجگورو! یہ ہماری قسمت کی سیاہی ہے جو بہمنی سلطان کے سیاہ پرچم کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اب ہم سلطان سے نہیں اپنی قسمت سے جنگ کریں گے۔"

اور وہ افسردہ وشکستہ دل اپنے کمرۂ خاص میں چلا گیا۔



بنکاپور کے قلعہ پر میاں سدھو سرنوبتی کو عامل مقرر کر کے اور مفتوحہ علاقہ کا انتظام درست کرنے کے بعد امیر فضل اللہ نے اپنے گھوڑے کی باگ بیجا نگر کی طرف موڑی۔

چار ماہ کے طویل محاصرہ اور شکستوں کی مسلسل خبروں نے مہاراج دیورائے کی کمر ہمت توڑ دی تھی بیجا نگر کے میدان میں آٹھ لڑائیاں، آٹھ شکستیں اُس کی قسمت میں لکھی جا چکی تھیں اور ہر معرکہ میں ذلت آمیز ناکامی کے بعد وہ گیدڑ کی طرح قلعہ میں روپوش ہو جاتا رہا۔

سلطان بھی شاید اُسے تھکا تھکا کر مارنا چاہتا تھا۔ اُس نے محاصرے کی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی اور اس دوران میں سارا کرناٹک روند ڈالا۔

امیر فضل اللہ کئی ہزار لونڈی غلاموں کے ہمراہ بیجا نگر پہنچا اور لشکر گاہ میں خوشی کے شادیانے بج اُٹھے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر اپنے بہادر سردار کا شایانِ شان استقبال کیا اور بیجا نگر کی فضائیں "یا نصیر" اور "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھیں۔

یہ آوازیں قلعہ کی فصیلوں کے جگر میں شگاف کرتی ہوئی راج رتو اس سے ٹکرائیں اور دیورائے کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے جیسے وہ

ان نعروں کی آواز بھی سننا پسند نہیں کرتا تھا۔

مگر تقدیر اُس پہ قہقہہ زن تھی......

چوتھے روز سلطان کے فاتح بھائی امیر الامرا خانخاناں کی سواری بھی آ پہنچی۔ اُس نے جنوب مشرقی کرناٹک کے سب حصار توڑ ڈالے اور تمام قلعے فتح کر لئے تھے۔ ان علاقوں پہ بہمنی عامل چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق اُس نے بیجے نگر کا رخ کیا تھا۔

صدر جہاں امیر فضل اللہ کی طرح سلطان نے امیر الامرا احمد خاں خانخاناں کا استقبال بھی بڑے تزک و احتشام سے کیا اور بھائی کے اعزاز میں پیدل چلتا ہوا آگے بڑھا۔ احمد خاں نے سلطان کو پیدل آتے دیکھا تو گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور اپنی تلوار گلے میں ڈال کر مجرموں کی طرح گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ تمام سردار اور خود سلطان احمد خاں کے اس رویہ پہ متحیر رہ گئے۔

''احمد خاں..... اس حرکت کا مطلب ہم نہیں سمجھے کرناٹک کے فاتح کا مجرموں کی طرح تلوار گلے میں ڈال کر ہمارے حضور آنے کا مقصد کیا ہے؟''

''ظلِ سبحانی!'' احمد خاں کہنے لگا۔ ''بیگم شیرازی کی بغاوت میں میرا نام بھی سننے میں آیا ہے۔ آپ نے اگرچہ راز داری سے کام لیا اور کسی کے کانوں میں میرے نام کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی لیکن میں اپنے قادر خدا کی قسم کھا کر سلطان کو یقین دلاتا ہوں مجھے اس سازش کا قطعی علم نہیں۔ واللہ! اگر میں بیگم شیرازی کے کسی منصوبے سے آگاہ ہوتا تو سب سے پہلے میری تلوار اُس کا سر قلم کرتی اور سلطان کو شاید اتنی پریشانی بھی نہ اٹھانا پڑتی۔ فیروز آباد سے روانگی کے وقت بیگم شیرازی نے جانِ عالم کے بارے میں ایک شکایت ضرور کی تھی اور میں نے وعدہ کیا تھا کرناٹک سے واپسی کے بعد میں جانِ عالم سے خود باز پرس کروں گا۔ آخر وہ میرے بھتیجے ہیں۔ مجھ سے چھوٹے ہیں اور آپ ہی کی طرح میرا احترام بھی کرتے ہیں۔ چچا ہونے کی حیثیت میں مجھے ان سے باز پرس کا حق حاصل ہے لیکن اب مجھے معلوم ہوا بیگم شیرازی کی نیت میں فتور تھا۔ جانِ عالم کے خلاف، سلطانِ معظم کے خلاف، بہمنی سلطنت کے خلاف بغاوت کی آگ سلگا رہی تھی۔ بس اس کے علاوہ میں اپنی صفائی میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اگر سلطان مجھے معاف کر دیں تو ان کی کرم گستری ہے۔''

سلطان نے احمد خاں کو شانوں سے تھام کر کھڑا کیا اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی

چمک دیکھ کر خانخاناں لرز اٹھا۔ سلطان گلوگیر آواز میں بولا۔

"جانِ برادر! تمہارے لئے ہم سلطان کبھی نہیں بنے اور نہ ہمیں تم سے کوئی شکایت ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا تم بھی شریک جرم ہو تو سلطان کی حیثیت میں ہم تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے جو سردار داؤد خاں کے ساتھ کیا گیا۔ مگر ایک بھائی کی حیثیت میں ہم تمہاری لاش پر آنسو بھی بہاتے کیونکہ تم ہمارے باپ کی یادگار ہو۔ ہمارا دایاں بازو ہو۔"

احمد خاں کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ فیروز شاہ کہہ رہا تھا۔

"ہم نے جانِ عالم کو اپنا جانشین ضرور مقرر کیا ہے اور یہ ہماری شفقت پدری کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر کسی روز تمہارے دل میں حکومت کی طلب پیدا ہو تو تلوار نہ اٹھانا احمد خاں! ہم سے درخواست کرنا ہم تمہارے حق میں تخت و تاج سے دست بردار ہو جائیں گے۔ تمہارے حضور سر تسلیم خم کر دیں گے اور جانِ عالم بھی تمہارا بھتیجا ہے۔ ہم نے اُسے سرکشی کی تعلیم نہیں دی۔ وہ تمہارے ہر فیصلے کو قبول کرے گا۔"

"سلطان عالی......"

احمد خاں کی چیخ نکل گئی۔ آنسو ٹپک پڑے اور وہ بے اختیار سلطان کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔

"ظلِ سبحانی! کیا احمد خاں کی زندگی میں کبھی ایسا دن بھی آ سکتا ہے؟"

"دنوں کا شمار نہ کرو جان برادر! تاریخ اپنے مضمون بدلتی رہتی ہے اور ایام کی گردش رکتی نہیں لیکن ہم جو کہہ چکے اُس پر عمل کرنا اور خون نہ بہانا۔ ہمارے پچاس سالہ تجربے کی دانائی تمہیں ایک انمول نصیحت کر رہی ہے اسے دامن میں باندھ لو۔"

بھائیوں کے ملاپ کا یہ جگر گداز منظر دیکھ کر کئی سرداروں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ کڑیل سخت گیر اور درشت چہروں والے امیر جو شمشیر سناں سے کھیلتے اور میدانِ جنگ میں انسانی لاشوں پر گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اس وقت پتھر کے مجسموں کی مانند دم بخود کھڑے تھے۔

پھر سلطان کے اشارہ پر شہزادہ حسن خاں آگے بڑھا اور خانخاناں کے سامنے جھک گیا۔

"چچا حضور! خدا اور سلطانِ عالی کے سوا میری یہ گردن کسی کے حضور نہیں جھکی تھی۔"

"نہیں جانِ عالم! یہ گردن اب بھی کسی کے سامنے نہیں جھکے گی۔ مگر مجھے آپ کی سعادت مندی پر فخر ہے۔"

پھر سلطان نے احمد خاں کو گھوڑے پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ خانخاناں پیدل ہی چلنا چاہتا تھا۔ مگر سلطان کے اصرار پر وہ سوار ہو گیا اور سلطان اپنے ذی مرتبت سرداروں، صدر جہاں اور ولی عہد کی معیت میں بھائی کی سواری کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگا۔ اسی عالم میں وہ لشکر گاہ تک آئے اور بیجے نگر کا میدان ایک مرتبہ پھر فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ وہ نعرے بیجے نگر کی پہاڑیوں سے ٹکرائے اور اُن کی صدائے بازگشت راج رتو اس کے سُرخ ایوانوں میں تھرتھرانے لگی۔

خانخاناں اپنے ہمراہ سات ہزار غلام لڑکے اور لڑکیاں بھی لے کر آیا تھا جنہیں سلطان کے حضور پیش کر دیا گیا اور حسب سابق وہ بھی قیدیوں کے خیموں میں پہنچا دیئے گئے۔ اس وقت بہمنی لشکر گاہ میں قیدیوں کی تعداد سپاہیوں سے بھی تجاوز کر چکی تھی مگر سلطان کا حکم تھا انہیں وہی کھانا دیا جائے جو ہمارے لشکری کھاتے ہیں۔

اسی روز سلطان نے جشن فتح منانے کا فیصلہ کیا اور لشکر گاہ آراستہ ہونے لگی۔

سپاہیوں کو اپنے مخصوص فوجی رقص و سرود کی محفلیں بپا کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ پھر تلواروں اور خنجروں کے ناچ سے لشکر گاہ کی فضائیں گونج اٹھیں۔ روشنیوں کے سائے قلعہ کی فصیل پر بھی منعکس ہو رہے تھے اور بہمنی سپاہیوں کے نغموں کی صدائیں دور دور تک تیر رہی تھیں لیکن بیجے نگر کی عمارتیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

سلطان کی بارگاہ خاص اہتمام سے سجائی گئی تھی۔ دور دور تک زربفتی شامیانے نصب تھے اور ان شامیانوں کے ارد گرد اونچی قناتیں نصب کر کے دربار کا نقشہ بنا دیا گیا تھا۔

ان شامیانوں کے نیچے بے دود مشعلیں روشن تھیں۔ تمام امراء، سردار اور خوانین حاضر تھے۔ سلطان نے امیر فضل اللہ انجو شیرازی، امیر الامرا احمد خاں خانخاناں ان کے سرداروں اور سالاروں کو بہادری کے صلہ میں اعزاز و خطابات بخشے پھر ولی عہد شہزادہ حسن خاں، ارگو خاں، فولاد خاں سیستانی، شمشیر خاں، کوسل رائے، قیاچہ خاں اور ان کے بہادروں کو انعامات دیئے۔ کوسل رائے کو راجہ کا خطاب دیا گیا۔ اُن بہادر کھتریوں، راجپوتوں اور تلنگی سورماؤں کو بھی خلعت و خطابات دیئے گئے جنہوں نے سلطان کے پرچم تلے جانبازی کے جوہر

دکھائے تھے۔

اس تقریب میں سب سے انوکھا انعام پرتھال کو عطا ہوا۔ وہ سلطان کی بیٹی کا شرف پہلے ہی حاصل کر چکی تھیں۔ اُسے "دکن کی شہزادی" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

ساری رات فتح کی خوشی میں جشن ہوتا رہا۔ سلطان نے دل کھول کر اپنے امیروں، سرداروں اور سپاہیوں پر زر و جواہر برسائے اور انہیں ایک ہی رات میں مالا مال کر دیا۔

ساری رات رقص جاری رہے۔

ساری رات نغموں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔

ساری رات مشعلوں میں تیل جلتا رہا۔

اور.... ساری رات بیجے نگر اندھیرے میں ڈوبا رقص و نغمہ کی صدائیں سنتا رہا۔

سحری کے وقت جب اکثر سپاہی نیند کے خمار میں ڈوب گئے تھے اور اکثر خیموں کے اندر نغموں کی صدائیں تھم گئی تھیں۔ سلطان نے خانخاناں کو اپنے حضور طلب کیا امیر فضل اللہ اور شہزادہ حسن پہلے ہی موجود تھے۔ سلطان نے انہیں اپنے نئے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"احمد خاں! ہم امیر فضل اللہ کے ساتھ ادونی کے قلعہ کا رخ کرتے ہیں۔ تم اور جان عالم بیجے نگر کا محاصرہ جاری رکھو۔ کرناٹک کی تسخیر میں اب صرف ادونی کا قلعہ ہی حائل ہے اس کے فتح ہوتے ہی ہم پورے کرناٹک پر قابض ہو جائیں گے اور واپسی پر دیورائے کی تقدیر کا فیصلہ کریں گے۔ ارگو خاں، کوسل رائے اور قباچہ خاں ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ہمارے بعد خانخاناں کی حیثیت سے تم صاحب اختیار ہو گے۔"

دوسرے روز جب سپاہی نیند سے بیدار ہوئے تو سلطان کے لشکر خاص کے ساتھ امیر فضل اللہ، ارگو خاں، کوسل رائے اور قباچہ خاں کے لشکروں کو بھی ادونی کے قلعہ کی طرف کوچ کا حکم مل چکا تھا اور روانگی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔



صلح کی شرطیں

مہاراجہ دیورائے پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ سلطان اپنے خاص لشکروں کے ہمراہ ادونی کی طرف کوچ کرنے والا ہے۔ راجہ کوسل رائے اور قباچہ خاں کے ہراول دستے روانہ بھی

ہو چکے تھے۔

اودنی کرناٹک کی کنجی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی تسخیر کے بعد سلطان پورے ملک پر قابض ہو سکتا تھا۔ اردگرد کے قلعے پہلے ہی سر کر لیے گئے تھے اور اب سلطان دیورائے کا بازو کاٹنے جا رہا تھا۔ اودنی اور بیجے نگر، کرناٹک کے دو ہی بازو تھے۔ ایک محاصرے میں تھا اور دوسرا اب بہمنی سواروں کی زد میں آنے والا تھا اور دیورائے جانتا تھا مغلوب الغضب سلطان اُسے تباہ و برباد کیے بغیر نہ ٹلے گا۔

اس نے فوراً اپنے تمام راؤ، فوجی سورمے، مہامتر اور اہل الرائے لوگوں کو راج دربار میں طلب کیا۔ راجگورو پنڈت گورکھ ناتھ، سیناپتی راج سنگھ، راؤ سنگرام مہامنتری اور دوسرے ممتاز سردار مہاراجہ کے آس پاس بیٹھے تھے اور وہ خود اپنے روایتی چتر کے زیر سایہ سنگھاسن پر جلوہ آرا تھا اس کے چہرے پر اُداسی اور دکھ کے سائے کانپ رہے تھے...... اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں نے اُسے پہلے سے کہیں زیادہ بوڑھا کر دیا تھا۔

اودنی کے قلعہ کی شکست کرناٹک کی شکست بن جائے گی پھر سلطان ہر فیصلہ تلوار کی نوک سے نافذ کرے گا۔

یہ بات ہر کوئی جانتا تھا...... لیکن اودنی کو کس طرح بچایا جائے؟ شاید اسی امر کا فیصلہ کرنے کے لئے مہاراجہ نے اپنے وزیروں اور مشیروں کو طلب کیا تھا۔

وہ کافی دیر تک غراتے اور آپس میں جھگڑتے رہے۔ مسلسل ناکامیوں سے اُن کے مزاج کچھ چڑچڑے سے ہو گئے تھے۔ خود مہاراج کا اندازِ گفتگو ناقابلِ فہم تھا۔ کبھی وہ تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھتا اور کہتا "ہمارے اور سلطان کے درمیان اب تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔" لیکن وہ تلوار کے فیصلے سے ڈرتا تھا کیونکہ چار ماہ کی مدت میں تلوار کا ہر فیصلہ سلطان ہی کے حق میں صادر ہوا تھا۔ پھر وہ خود بخود بڑبڑاتا۔

"صلح کی کوئی تدبیر نکل آئے تو بہتر ہے۔ جنگ نے ہمارے بہادروں کو تھکا دیا ہے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم فیروز شاہ سے نپٹنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

سلطان اب ایسی کسی صلح کے لئے تیار نہ تھا جو کسی نئی جنگ کے لئے "تیاری کا وقفہ" بن سکے لیکن اودنی کو بچانے کی خاطر صلح کے بغیر اور کوئی راستہ نہ تھا۔ دیورائے کے تمام مشیروں نے یہی مشورہ دیا۔ "مہاراج کو جھک جانا چاہیے ورنہ کرناٹک ہاتھ سے نکل چکا۔"

دیورائے نے اپنے ذہن کو شکست کے دروازے پہ لا کھڑا کیا۔ اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا پھر راج دربار کے فیصلہ کے مطابق راجگورو کی معیت میں صلح کی درخواست روانہ کر دی گئی۔ سلطان اپنے خیمہ میں روانگی کے لئے تیار ہو رہا تھا جب نظام الملک نے حاضری کی اجازت طلب کی اور عرض کیا کہ بیج نگر کے راجگورو صلح کی درخواست لے کر آئے ہیں۔

"صلح......"

سلطان چلایا۔ "نظام الملک! کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ اب ہمیں صلح سے دلچسپی نہیں رہی۔ راجگورو سے کہو اپنے مہاراج کو تقدیر کے فیصلے پر چھوڑ دیں۔"

نظام الملک مایوس لوٹ گیا اور راجگورو دل تھام کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا دیورائے کی بدبختی اُسے اعمال کی سزا دیئے بغیر نہیں ٹل سکتی پھر اس نے سلطان سے ذاتی طور پر ملنے کی درخواست کی جسے قبول کر لیا گیا۔

جب پنڈت گورکھ ناتھ اپنے مہاماتروں کے ساتھ زربفت کے شامیانہ میں داخل ہوا تو اُس کی آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ پرتھال سلطان کے قریب ایک زرنگار مسند پر جلوہ آرا تھی اور تمام عمائدین سلطنت شہ نشین کے سامنے دو رویہ مؤدب کھڑے تھے۔ اچانک پنڈت گورکھ ناتھ کو اپنا وہ سپنا یاد آ گیا جو اُس نے کاشی کی یاترا سے لوٹتے وقت اُس سمے دیکھا تھا جب وہ لکھپت سنار کے گھر مہمان تھا اور پرتھال کو راگ دودیا سکھا رہا تھا اس نے پرتھال کے ماتھے پر اقبال کو چمکتے دیکھا تھا اور آج صرف ڈیڑھ ہی سال کے بعد اُس کی تعبیر بھی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر سلطان کو سلام کیا پھر پرتھال کی طرف دیکھ کر بھی سر جھکا دیا۔ سلطان کی اجازت سے پرتھال ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے اپنے گورو دیو کو نمسکار کیا پھر شامیانہ میں سلطان کی آواز گونجنے لگی۔

"راجگورو! ہم جانتے ہیں بانو تمہاری شاگرد ہے۔ اسی لیے ہم نے اپنے دربار میں اسے تمہاری تعظیم کی اجازت دی ہے۔ مگر اب وہ محض ایک زرگر کی لڑکی نہیں سلطانِ دکن کی بیٹی ہے اور ہم اپنی بیٹی کو دیا ہوا قول پورا کرنے کے لئے بیج نگر میں بیٹھے ہیں اس نے ہم سے مہاراج دیورائے کا سر طلب کیا تھا اور ہم وہ سر اپنی بیٹی کے قدموں میں ڈالے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ اب کہو تم کیا درخواست لے کر آئے ہو؟"

راجگورو اور اُس کے ساتھیوں نے حیرت کے ساتھ سلطان کا بیان سنا پھر وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں سلطانِ عالی کے حضور صرف صلح کی عرض لے کر آیا ہوں۔ اس کے سوا میرے دامن میں اور کچھ نہیں۔''

''ہم تمہارے دکھ سے واقف ہیں گورکھ ناتھ! بانو دوشی کے متعلق ہمیں سب کچھ بتا چکی ہے۔ اب مجرم کے حساب کی ساعت آئی تو تم صلح کی درخواست لے کر آ پہنچے۔''

''سلطانِ عالی! مجھے شما کیجئے۔''

''جاؤ...... دیورائے سے کہہ دو اگر وہ صلح چاہتا ہے تو ہماری ضد پوری کرے اور زنجیریں پہن کر ہمارے حضور چلا آئے۔ صلح کی گفتگو اس کے بعد ہوگی اور اس کی زندگی کا فیصلہ ہماری بیٹی کرے گی۔''

سلطان کا جواب فیصلہ کن تھا۔ راجگورو نے شاہی آداب کے مطابق کورنش کی رسم ادا کی اور لوٹ گیا۔

دیورائے نے صلح کی شرط سنی تو کانپ گیا۔ تو اُس کی زندگی کی ڈور پرتھال کے ہاتھ میں ہے؟ پھر اُسے وہ خنجر یاد آیا جو پرتھال نے اُس کے پیغام کے جواب میں بھیجا تھا اور دیورائے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ خنجر اُس کا جگر چیرتا ہوا سینے میں اترا جا رہا ہے...... وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور اوندھے منہ مسہری پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے راؤ سنگرام کو طلب کیا اور امیر فضل اللہ شیرازی کی طرف دوڑایا جو ادونی کے قلعہ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

بہمنی لشکروں نے جاتے ہی قلعہ کے گرد محاصرہ ڈال لیا تھا۔ راؤ سنگرام ادونی کے میدان ہی میں امیر کے سامنے حاضر ہوا اور مہاراجہ کی درخواست پیش کی۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی گزشتہ حرکتوں پہ سخت نادم ہے اور سچے دل سے معافی کا طلب گار ہے۔ امیر سلطان سے سفارش کر کے معافی دلا دیں۔ پابہ زنجیر حاضری کے علاوہ وہ سلطان کی ہر شرط قبول کرے گا۔

مہاراج دیورائے نے امیر کو سابقہ تعلقات کا واسطہ دیا تھا اور انتہائی ندامت کا اظہار کرتے ہوئے آئندہ کے لئے سلطان کا مطیع و باجگوار رہنے کا وعدہ کیا تھا اس نے یہ بھی کہا

تھا۔ وہ پچاس ہزار سپاہی موت کی بھٹی میں جھونک چکا ہے اور کم و بیش اتنے ہی قیدی بنائے جا چکے ہیں۔ کیا اس کی غلطی اور سرکشی کی یہ سزا کچھ کم ہے؟ راؤ سنگرام نے ذاتی طور پر بھی امیر کو صلح کے لیے مجبور کیا اور اس نے راجہ کوسل رائے کو محاصرہ کا نگران مقرر کر کے اپنے گھوڑے کی باگ بیجے نگر کی طرف موڑ دی۔

امیر فضل اللہ کو اپنے حضور دیکھ کر سلطان حیران رہ گیا۔

"تو تم اس بدبخت کی سفارش لے کر آئے ہو جس نے امن کے کھلیان میں چنگاری ڈالی اور انسانوں کا لہو پانی سمجھ کر بہایا۔ جس نے ہماری مملکت کی لڑکیوں کی عزت لوٹنا چاہی۔ نہیں امیر! ہمیں کسی غلط فیصلے پر مجبور نہ کرو۔ دیورائے کو اپنی سرکشی کی سزا بھگتنا ہی پڑے گی۔"

وہ شرمندہ ہے سلطانِ عالی! اس نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ہے اور وہ کہتا ہے پرتھال اب سلطان ہی کی بیٹی نہیں میری بھی بیٹی ہے اور میں اس سے معافی کا طلب گار ہوں۔"

سلطان کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔ اس نے جواب دیا لیکن تم جانتے ہو دیورائے کی قسمت کا فیصلہ اب ہمارے اختیار میں نہیں۔ بانو ہی اس کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتی ہے۔"

پھر امیر فضل اللہ نے پرتھال کے خیمے پر حاضری دی اور مہاراجہ دیورائے کی طرف سے خود معافی کا طلب گار ہوا۔ بہمنی سلطنت کا صدر جہاں امیر فضل اللہ انجو شیرازی جس کی تلوار سے بہادروں کے جگر کانپ اٹھتے تھے ایک سنار زادی کے سامنے معافی کا طلب گار تھا اپنا یہ مقام اور سلطان کی یہ عزت افزائی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔

"دیورائے اس قابل نہیں تھا کہ اس کی جان بخشی کی جاتی مگر صدر جہاں کے حضور مجھے انکار کی جرأت نہیں۔ اب مجھے دیورائے کا سر نہیں چاہیے لیکن معافی کے ساتھ سلطان کو ایک مشورہ ضرور دوں گی۔"

امیر فضل اللہ خوشی خوشی لوٹ گیا۔ کم از کم دیورائے کی جان بخشی تو ہو گئی۔

سہ پہر کے وقت راجگورو پنڈت گورکھ ناتھ سلطان کے حضور راجکماری چند کلا کا ایک ذاتی سندیس لے کر آیا۔ راجکماری نے اپنی طرف سے اپنے باپ کے گناہوں کی معا

طلب کی تھی اور درخواست کی تھی کہ سلطان حضور اپنی کرم گستری سے کام لیتے ہوئے زنجیریں پہن کر حاضری کی شرط عائد نہ کریں۔ مہاراج اپنے گلے میں تلوار لٹکائے شاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔

چندر کلا نے دوسرا پیغام پرتھال: کے نام بھیجا تھا اور اس میں بھی باپ کے جرم کی خود معافی مانگ کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ ان کو شما کرے۔

راجگورو! راؤ سنگرام اور امیر فضل اللہ شیرازی ایک ساتھ سلطان کے حضور پیش ہوئے۔ پرتھال اس سے پہلے ہی سلطان سے ملاقات کر چکی تھی اور اس نے دیورائے سے صلح کی ایک ایسی عجیب وغریب شرط پیش کی تھی۔

جسے سن کر خود سلطان بھی چونک اٹھا تھا...... راجکماری چندر کلا......

سلطان نے امیر فضل اللہ اور بیجے نگر کے ایلچیوں کو شرفِ باریابی بخشا ان کی درخواستیں سنیں اور چند لمحے غور کرنے کے بعد نرم آواز میں کہنے لگا۔

"یاتو! مہاراج دیورائے کی جان بخشی کر چکی ہے اس لئے ہمیں بھی اُس کی جان لینے پر اصرار نہیں رہا۔ راجکماری چندر کلا کی درخواست پر اسے ہم حاضری پر بھی مجبور نہیں کرتے لیکن عین الملک ہماری طرف سے صلح کی شرائط سنائے دیتے ہیں۔ اگر مہاراج کو یہ شرطیں منظور ہوں تو ہم بھی اُس کو معاف کرتے ہیں۔

فضا پر سناٹا چھا گیا۔ پھر عین الملک کھڑے ہو کر صلح کی شرطیں پڑھنے لگا......

1- "سلطانِ عالی کے نزدیک مہاراج دیورائے نے بار بار صلح کی خلاف ورزی کر کے اور معاہدے توڑ کر اپنا اعتبار کھو دیا ہے اور اُس کی کسی بات پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا لیکن مہاراجہ نے چونکہ اپنی اطاعت گزاری کا یقین دلایا ہے اس لئے اس یقین کو مزید مستحکم اور ناقابلِ شکست بنانے کے لئے پہلی شرط یہ عائد کی جاتی ہے کہ وہ اپنی لڑکی راجکماری چندر کلا سلطان معظم کی نذر کرے۔ سلطان اُسے اپنے عقد میں لائیں گے۔

2- مہاراجہ اپنی بیٹی کے سکھ پال کے ساتھ دس من چاندی، پانچ من موتی، پچاس کوہ پیکر ہاتھی دو ہزار خواندہ غلام اور داسیاں اور رقص و سرود میں باکمال دیوداسیاں پیش کرے۔

3- بیکاپور اگرچہ سلطان ہی کے قبضہ میں ہے اور اس پر بہمنی پرچم لہرا رہا ہے۔ مگر دیورائے اُسے باقاعدہ راجکماری کے جہیز میں دولتِ بہمنیہ کے سپرد کردے۔

4- اگر اُسے صلح کی یہ شرطیں قبول ہوں تو سلطان کی طرف سے اُن کی منہ بولی بیٹی پرتھال دلہن کے لئے جوڑا لے کر آئے گی۔ مہاراج دیورائے نصف کوس پیدل چل کر اُس کا استقبال کرے اور اُس کے سامنے شاہانہ آداب کے ساتھ جھک کر کورنش بجا لائے پھر ضروری رسوم ادا کرنے کے بعد دیورائے اُسی طرح پرتھال کی سواری کے ساتھ پیدل چل کر اسے قلعہ کے دروازہ تک چھوڑنے آئے۔

5- بیجے نگر کے دروازے سے لے کر بہمنی لشکر گاہ تک سات فرسخ کے فاصلہ میں بیجے نگر کے سوداگر دو رویہ بازار لگائیں اور ہندو مسلمان مل کر اس بازار میں گھومیں اور مال فروخت کریں۔

6- یہ میلہ بازار کی شکل میں مسلسل چالیس روز تک قائم رہے تاکہ باہمی کدورت دور ہو جائے اور دونوں لشکروں کے سپاہی ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔

7- شادی کی رات سارے بیجے نگر راج محل اور راج رنواس میں نہ صرف چراغاں کیا جائے بلکہ شہر بھر میں خوشی کی محفلیں بپا ہوں اور راج رنواس میں بھی رقص و موسیقی کے جلسے منعقد کیے جائیں۔

8- اس خوشی میں راستے سجائے جائیں اور جب سلطان دلہن لے کر شہر میں داخل ہوں تو مہاراج اپنے امرا اور وزیروں مشیروں کے ساتھ تین فرسخ کی مسافت سے اُن کا استقبال کرے اور واپسی پر بھی وہ راجکماری کی سکھ پال کے ساتھ پیدل چلے اور اسے ہمارے خیمے تک چھوڑنے آئے۔

9- تمام بہمنی قیدی فی الفور رہا کردیے جائیں۔

10- مہاراج دیورائے ہر سال دولتِ دکن کو خراج ادا کرے اور سلطان جب اُسے طلب کریں وہ فوراً اُن کے حضور چلا آئے۔ اس کے معاوضہ میں سلطان بھی زر فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کردیں گے اور کرناٹک کے جو قلعے فتح کئے گئے ہیں وہ مہاراج کو لوٹا دیئے جائیں گے۔"

سب نے ان شرائط کو تعجب کے ساتھ سنا راؤ سنگرام کے ماتھے پر ا بکماری ینند ا

کے بیاہ کی شرطیں سن کر طیش کی لکیریں ابھریں لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

سلطان تو پرتھال کے مشورہ پر دراصل دیورائے کو ایک ایسا سبق دینا چاہتا تھا جو اُسے ساری عمر یاد رہتا یہی اُس کی بے عزتی کا انتقام تھا۔ یہی دوشی کی بے گناہ آتما کی پکار تھی۔ راجگورو پنڈت گورکھ ناتھ کے ہونٹوں کے کناروں پر لرزش پیدا ہوئی اور اُس نے مسکرا کر پرتھال کی طرف دیکھا پھر وہ سب کے سب خیمے سے باہر آ گئے۔

راجگورو واپسی سے پہلے پرتھال کو اُس کے خیمۂ خاص میں ملا۔ اُس نے کہا۔

"بیٹی! دوشی مہاراج دیورائے کی ہوس کی بھینٹ چڑھی تھی۔ سلطان نے چندر کلا کا مطالبہ کر کے میری آتما کو سکون بخش دیا ہے۔ میں خود یہی چاہتا تھا اور شاید چندر کلا بھی......"

پھر وہ خوشی خوشی بیجے نگر کی طرف لوٹ گئے اور پرتھال اپنے خیمہ میں گھس گئی مگر فوراً ٹھٹکی۔ سامنے شہزادہ حسن کھڑا مسکرا رہا تھا۔

روح کی روشنی

بیجانگر کی بلند اور مہیب فصیل سے کچھ ادھر ہی پرتھال نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور ہاتھ اٹھا کر اپنے پیچھے آنے والے سواروں کو رُک جانے کا اشارہ کیا۔

شہزادیوں کی طرح زرق برق لباس پہنے اور سر پر کلغی لگائے وہ اس وقت سلطان کے خاص سفید گھوڑے پہ سوار ایک شہزادی ہی معلوم ہو رہی تھی۔ بہمنی سپاہ کے منتخب بہادر سوار جن کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کی رکاب میں تھے۔ ہشیار عین الملک اور نظام الملک دائیں بائیں نظر آ رہے تھے جس طرح وہ سلطان کے ہمراہ رہتے تھے۔ عقب میں ارگو خاں، فولاد خاں سیستانی، قباچہ خاں، شہباز خاں، شمشیر خاں اور کوسل رائے ایسے جنگجو سردار لوہے کا لباس پہنے گھوڑے بڑھائے چلے آ رہے تھے۔

اُن کے کھردرے چہروں پر اُس روایتی سنگینی کی چمک تھی جس نے ان کے کردار سنگ و آہن کے پیکر بنا دیئے تھے۔

جونہی پرتھال نے گھوڑا روکا فصیل کا دروازہ کھلا اور کرناٹک کا مہاراج دیورائے اپنے راجگورو، مہامنتری، سیناپتی، راج دربار کے راؤں اور مہاماتروں کے ساتھ سواگت کو آگے

بڑھا۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھا۔ سلطان نے اس پر بیجانگر سے باہر پرتھال کے استقبال اور کورنش بجا لانے کی پابندی ضرور عائد کی تھی لیکن مجرموں کی طرح ننگے سر اور ننگے پاؤں آنے کا حکم نہیں لگایا تھا۔ یہ دیوراے کی اپنی روح کا فیصلہ تھا۔ شاید وہ گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ جونہی وہ قریب آیا۔ پرتھال یہ دیکھ کر چونک اٹھی کہ اس نے وہ خنجر اپنے گلے میں لٹکا رکھا تھا جو اس نے راجہ کے سندیس کے جواب میں بھیجا تھا تو اس کا یہ مطلب ہے اُس کی روح نے روشنی قبول کر لی ہے وہ سچے دل سے معافی کا طلب گار ہوا ہے؟

قریب آتے ہی وہ کمر تک جھک گیا تھا پھر اس نے ایک حقیر مصاحب کی طرح تین مرتبہ ہاتھ کی جنبش سے کورنش ادا کی۔ اس کے ہمراہی بھی اس کے ساتھ ہی کمر خمیدہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں کو جنبش نہیں دی مہاراج کے ساتھ ان کا جھک جانا ہی کافی تھا۔

پرتھال کو یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کی گردش رُک گئی ہو جیسے دھرتی اپنے محور پہ تھم کے کانپ رہی ہو جیسے آسمان کے ستارے اُس کے قدموں پہ آ پڑے ہوں اور کرناٹک کی زمین، کرناٹک کا آسمان اُس کے حضور جھک گیا ہو۔

یہ بیجانگر کا وہ پرعظمت، پرجلال اور پرشکوہ مہاراج تھا جس کے ہاتھ کے صرف ایک اشارے پر ہزاروں سر تلواروں کی دھار پر اچھل جاتے تھے۔ یہ وہ بااختیار اور باجبروت حکمران تھا جس کے جلو میں بجلیاں چلتی تھیں۔ رائے رایاں کا وہ مغرور اور ظالم انسان جس کے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے ویرو پکشا کی دھرتی کانپ اٹھتی تھی۔ جس کے اشارے پر کمانوں کے چلے چڑھتے تھے۔ تلواروں کا رقص ہوتا تھا اور بھالوں کے پھل انسانوں کے جگر میں اُتر جاتے تھے جو اپنی رکاب میں آتش و خون اور موت کے ہنگامے لے کر چلتا تھا۔ جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ موت کے فرمان کی طرح اٹل تھا۔ جس کے راج رنواس میں کرناٹک کی کنواریاں اپنی متاعِ زیست لٹا کر یوں مہر بلب ہو جاتی تھیں جیسے یہی ان کا مقدر تھا۔ جس نے جھکنا تو درکنار لچکنا تک نہیں سیکھا تھا۔ آج وہ ایک سنار زادی کے سامنے سر جھکا کر کورنش ادا کر رہا تھا۔ لاکھوں انسانوں کا ان داتا، کرناٹک کا مہابلی، ایک ایسی عورت کے سامنے سر خمیدہ تھا۔ جسے وہ اپنے حضور زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنے کا متمنی تھا۔ آج اُس کا تمام غرور، سب جاہ و جلال ایک بے مایہ و کمزور لڑکی کے قدموں پہ اوندھا پڑا تھا۔ بہمنی سلطان نے اس کے دیس کی صفیں الٹ دی تھیں۔ دکن کے بہادروں نے اس

کی تمناؤں کو لہو میں غسل دیا تھا موت نے بھیانک قہقہہ لگا کر اس کے دروازہ پر دستک دی تھی اور دیورائے اُس دروازہ کے پٹ بھیڑ کر یوں دبک گیا تھا جیسے اس کے جسم سے زندگی کی حرارت چھین لی گئی ہو۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا تھا اور سلطان کی موت کی طرح کھنچی ہوئی تلوار سے پناہ طلب کی تھی۔

یہ کیسا عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔ ایک کمزور حقیر لڑکی کے مقدر نے بیجانگر کے راے رایاں کو اپنے پاؤں پہ جھکا لیا تھا۔

شاید احساس کے یہی وہ کوندے تھے جو پرتھال کے ذہن و شعور پر لپک رہے تھے اور وہ اپنے بدن پر ایک غم انگیز سی لرزش محسوس کر رہی تھی۔ اُسے دشمن کی شکست پر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اس کے لئے اپنے دل کے گوشوں میں ایک رحم کو کروٹ لیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

جب کورنش کے بعد مہاراجہ دیورائے نے اپنا سر اُوپر اٹھایا تو سب لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پانی کی موٹی موٹی دو لکیریں آنکھوں سے نکل کر اس کے ہونٹوں کے کناروں کی طرف بہہ رہی تھیں۔ وہ صاحب شکوہ مہاراج جس کی سواری کے بیل بھی چتر زریں کے سائے میں چلتے تھے۔ اس وقت پرتھال کے سامنے مجرموں کی طرح ننگے پاؤں اور ننگے سر کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

تقدیر نے اس کی روح پر کیسے کوڑے برسائے تھے۔

پرتھال نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا شاید وہ بیجانگر کے مہاراج کو اس بے کسی کی حالت میں دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ بے شک وہ اس وقت سلطان کے کوتل گھوڑے پر سوار تھی جو خون کے دریا تیر جاتا تھا لیکن اپنے سینے میں فیروز شاہ کا دل کہاں سے لاتی۔ وہ ایک عورت تھی۔ ایسی عورت جس نے نفرت کرنا نہیں صرف محبت کرنا سیکھا تھا۔ زلزلوں اور طوفانوں میں بھی اس کے پیار کے قدم نہیں ڈگمگائے تھے مگر اس کا دل اپنے دشمن کی بے بسی پر کانپ کے رہ گیا اور دیورائے کے آنسو دیکھ کر وہ خود بھی شمع کی طرح پگھلنے لگی۔

مہاراجہ نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی رکاب تھام لی تھی۔ آنسو بدستور رواں تھے اور ہونٹ بڑی تیزی سے کپکپا رہے تھے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن الفاظ کہیں رستے ہی میں دم توڑ جاتے تھے۔

اچانک پرتھال نے ایک ڈوبی ہوئی آواز سنی جیسے کوئی روح اُسے بہت دور سے پکار رہی ہو۔ بے شک وہ آواز دیورائے کی نہیں تھی۔ اس لرزتی ہوئی آواز میں ایک عجیب سا رس تھا۔ پیار، محبت اور شفقت تھی۔ پھر وہ آواز دیورائے کی کس طرح ہو سکتی تھی۔ ہاں ہونٹ اسی کے تھرتھرائے تھے زبان اسی کی کانپی تھی۔ لب اُسی کے کھلے تھے مگر آواز شاید اُس رُوح کی تھی جو زندگی کے دالانوں میں دیوانوں کی طرح بھٹکتی پھر رہی تھی۔ وہ آواز جو کہہ رہی تھی۔

''پرتھال دیوی...... پرتھال...... بیٹی......''

اور اس کے آگے کچھ بھی سنائی نہ دے سکا۔ مہاراج دیورائے کی پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو بھر بھرا کر ٹوٹے اور ہونٹوں میں جذب ہو گئے۔ اس کا لہجہ ڈوبتا ہی چلا گیا اور وہ آواز بھی کہیں گم ہوتی گئی۔

''پرتھال بیٹی!'' یہ آواز سن کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ الفاظ دیورائے نے نہیں کلمپت سنار نے کہے تھے۔ اُس کے گورو دیو پنڈت گورکھ ناتھ نے اُسے پکارا تھا اور وہ تھرا کر رہ گئی۔ اس کا جی چاہا وہ گھوڑے سے کود جائے اور دیورائے کے سینہ پر سر رکھ دے اور کہے۔

''میرے ناستک پتا! تم کہاں بھٹک گئے تھے۔ کیا کبھی کسی باپ نے بیٹی کے لئے تلوار بھی اٹھائی ہے لیکن میری شکتی دیکھو میں نے لہو کا دریا پار کر تمہیں ڈھونڈا اور تمہاری آتما کو ہلاک ہونے سے بچا لیا۔''

لیکن گھوڑے کی پشت پر وہ صرف اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گئی تو کیا وہ بھمنی روایات کو دھکا لگاتی۔ ایک مجرم کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار کر کے دنیا کو یہ کہنے کا موقع دیتی کہ فیروز شاہ بھمنی کے سینہ میں ایک عورت کا دل ہے۔ اس وقت وہ فیروز شاہ کی عظمت کا بہروپ بدل آئی تھی۔ پھر...... پھر...... اُس کے سینہ میں یہ کپکپاہٹیں سی کیسی ہیں...... اس کا دل اتنی تیزی سے کیوں پگھل رہا ہے؟ یہ خیال آتے ہی وہ اپنے آپ پر قابو پانے لگی اور دوسرے ہی لمحے وہ سنگ و آہن کا ایک پیکر سا بن گئی۔ دیورائے کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

''پرتھال بیٹی! تمہارا مجرم، تمہارا گناہگار باپ تمہارے سامنے حاضر ہے۔ تم اسے جو

سزا چاہو دے سکتی ہو۔"

اچانک پر تھال کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ وہ بولی۔

"بیٹی باپ کو سزا نہیں صرف جزا ہی دے سکتی ہے مہاراج!"

پھر وہ ہشیار عین الملک سے مخاطب ہوئی۔

"عین الملک! مہاراج کو نذر بھینٹ کی جائے۔"

مگر اُس کی آواز میں لرزش کی بجائے ایک ٹھہراؤ، ایک تحکم، ایک شاہی جلال چمک رہا تھا۔

عین الملک نے گھوڑے سے اُتر کر ایک تلوار مہاراجہ کی طرف بڑھائی۔ جس کے چاندی کے دستہ پر یہ عبارت کندہ تھی۔

"دخترِ سلطان کی طرف سے مہاراجہ دیورائے کی نذر....."

دیورائے نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تلوار اٹھائی اور شاہی دستور کے مطابق اُسے بوسہ دے کر بولا۔

"ہم اس بھینٹ پر ہمیشہ فخر کریں گے۔"

"مہاراج!" پر تھال کہنے لگی۔ "یہ تلوار آپ کو اس لئے بھینٹ کی گئی ہے کہ یہ ستھوون کی سہائتا میں صرف ظالموں کے خلاف بلند ہوگی۔ یہ ایک ایسی بیٹی کا تحفہ ہے جس نے آن پر جان کی بازی لگا دی تھی۔ اگر آپ نے یہ بات یاد رکھی تو کرناٹک کی تقدیر بدل جائے گی۔ دیس کی کنیائیں آپ پر فخر کریں گی پھر کوئی کنواری دن کے اجالے یا رات کے اندھیرے میں اپنی بے بسی پر خون کے آنسو نہیں روئے گی۔ کوئی دوشی موت کا امرت نہیں پیئے گی۔ کوئی باپ بیٹی کا زخم سینے پر لئے نہیں بھرے گا۔"

دوشی کا نام ہی سنتے دیورائے اور پنڈت گورکھ ناتھ نے ایک ساتھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بڈھے راجگورو کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

"ہاں مہاراج! راجہ اپنی پرجا کا باپ ہوتا ہے۔ دیس کی عزت کا رکھوالا بے کسوں کا محافظ بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔"

دیورائے کے ہونٹ پھر کپکپائے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"تم عورت نہیں سچ مچ ایک دیوی ہو۔ ایک ساوتری لیکن ہماری بدبختی دیکھو ہم تمہی

کو زنجیریں پہنچانے پر تل گئے۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے ستاروں کی چال بگڑی اور ہماری تقدیر ہمیں مدگل کی طرف گھیر کر لے گئی۔ ہم نے تمہارے خلاف نہیں اپنی قسمت کے خلاف تلوار اٹھائی اور سلطان سے لڑ بیٹھے۔ ہم بیجانگر سے تمہیں گرفتار کرنے کا ارادہ لے کر نکلے۔ لیکن یہ بھول گئے ہم سے اوپر ایک اور طاقت بھی ہے جو ہماری عظمت، ہمارے تمام جاہ و جلال کو تمہاری ٹھوکروں میں لا پھینکے گی۔ کاش ہم نے اُس اونچی عدالت کے فیصلے کا انتظار کیا ہوتا جس کے اشارے پر نرگ اور سورگ کے دروازے کھلتے ہیں۔ جو کمزور سے کمزور انسان کے دل کو بھی پہاڑوں کی سختی اور دیوتاؤں کی شکتی عطا کرتی ہے۔ آج ہم شرمندہ ہیں۔ لیکن اگر ہم ٹھوکر نہ کھاتے تو اپنی آنکھوں میں تمہارے لئے آنسوؤں کی بھینٹ کہاں سے لاتے۔ تمہیں اپنی بیٹی کہہ کر کس طرح یاد کرتے۔ تم نے ہماری آتما کو روشنی بخشی اور ہماری آنکھوں کو ندامت کا پانی عطا کیا ہے۔ جس نے ہمارے من کی آلودگی دھو ڈالی ہے۔ تم نے ہمیں پھر سے انسان کا جنم دیا ہے۔ ہم نے سلطان کو اپنی بیٹی دے کر تمہیں اپنی بیٹی بنا لیا ہے یہ سودا مہنگا نہیں۔ آؤ میرے ساتھ آؤ! راج محل میں چندر کلا تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہے......"

پھر دیورائے بیجانگر کی طرف پلٹا اور گھوڑے کی رکاب تھامے ہولے ہولے اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب راجکورو بھی قریب آ گیا تھا۔ جب وہ محل کے دروازے پر آئے تو انسانوں کا ایک ہجوم پرتھال کی سواری کو دیکھنے کے لئے اُمڈ آیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے کہ کرناٹک کا مہاراج ان کا مہابلی پرتھال کی سواری کے ساتھ ننگے پاؤں چل کر آیا تھا۔

پھر پرتھال...... عین الملک، نظام الملک اور ارگو خاں کے ساتھ راج محل میں داخل ہوئی باقی سوار قلعہ کی طرف لوٹ گئے۔ یہاں راؤ سنگرام نے اُن کا سواگت کیا۔ پرتھال نے دو سلطنتیں ہی نہیں دو قوموں کو بغل گیر کر دیا تھا۔

جونہی اُس نے راج محل کی دہلیز پر قدم رکھا ایک لڑکی بھاگ کر اُس کے پاؤں پہ ڈھیر ہو گئی اور اُس کے چرن چھونے لگی۔ پرتھال اچھل کر پیچھے ہٹی اس نے قیاس لگانے میں غلطی نہیں کی کہ وہ راجکماری چندر کلا کے سوا اور کوئی نہیں۔

"راجکماری! یہ تم نے کیا کیا۔ تمہارے چرن تو مجھے چھونے چاہئیں۔ تم اب سلطان دکن کی......"

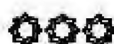
مگر چندر کلا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی وہ بولی۔

"پرتھال دیوی! تم سچ مچ دیوی ہو......"

اچانک عقب سے ایک مہین مگر تیز آواز سنائی دی۔

"پرتھال دیوی کی جے ہو۔"

جب پرتھال نے گردن گھما کر دیکھا تو راج محل کے برآمدے میں طوطے کا پنجرہ نظر آیا اور اس کے ہونٹوں پہ ایک عجیب سی مسکراہٹ تیر گئی۔ شاید طوطے کو یہ فقرہ چندر کلا ہی نے سکھایا تھا۔



تیسرے روز جب پرتھال اپنے دستہ کے ہمراہ بیجانگر سے لوٹی تو طوطے کا پنجرہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ معاہدہ کے مطابق دیورائے نے چندر کلا کو رخصت کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور بیجانگر کے دروازے سے لے کر سلطانی لشکر گاہ تک سات فرسخ کے طویل فاصلہ میں دونوں طرف دکانیں سج رہی تھیں اور بہمنی لشکری کرناٹکی سپاہیوں کے ساتھ اس بازار میں گھوم رہے تھے۔

جنگ خواب و خیال ہو کے رہ گئی تھی۔

پرتھال یہ منظر دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی۔ اُسے کیا خبر تھی صرف تین ہی دن کے اندر بیجانگر کے باہر ایک عظیم الشان بازار بھی سج رہا ہوگا۔

لوگ رستہ سے ہٹتے گئے اور وہ اپنے جنگی بہادروں کے ہمراہ اس بازار کو طے کرتی ہوئی لشکر گاہ تک آ پہنچی۔ سلطانی خیمہ سرا پر صدر جہاں امیر فضل اللہ شیرازی اور امیر الامراء احمد خاں خانخاناں نے اس کا استقبال کیا۔ امیر فضل اللہ کے استفسار پر اُس نے بتایا۔ مہاراجہ دیورائے راج محل میں سلطانِ عالی کی سواری کا منتظر ہے اور چندر کلا کا سکھ پال تیار ہو رہا ہے۔

پھر وہ سلطان کی بارگاہ میں داخل ہوئی۔ وہ ایک چوبی ستون کے سہارے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پرتھال نے اُسے چندر کلا کا سلام پیش کیا۔

"بانو! اب تم ہماری بارگاہ میں رہو گی اور دو روز کے لئے ان خیموں سے باہر نہیں نکلو گی۔"

"کیوں سلطان معظم......"

اس کے چہرے پر حیرت کروٹیں بدل رہی تھی۔

"بہمنی شہزادیوں کا یہی دستور ہے۔ حسن خاں رونق بیگ کے ہمراہ پرسوں ہی فیروز آباد روانہ ہو گیا تھا۔ وہ بیگم جہاں، بیگم عالیہ اور تمہارے ماں باپ کو ساتھ لے کر آج شام یہاں پہنچ جائے گا پھر ہماری بیٹی...... ہماری بہو بن جائے گی۔"

پرتھال ایک لمحہ سکتہ کی حالت میں کھڑی رہی۔ پھر طوطے کا پنجرہ اٹھائے اچانک پردہ سرا کی طرف بھاگ گئی۔

"بانو...... یاد رکھو کہیں جانِ عالم کو بھی پنجرے میں بند نہ کر لینا، اور دور سے طوطے کی آواز سنائی دی۔

"بجے ہو......"



ـــــ ختم شد ـــــ